# تلامذۂ مصحفی

افسر صدیقی امروہوی

# تلامذۂ مصحفی

افسر صدیقی

طابع : شیخ شوکت علی پرنٹرز ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

ناشر : نیا دور ۔ کراچی ۵

سال طباعت : ۱۹۷۹ء

کاتب : محمد رمضان بٹ

قیمت : پچیس روپے صرف

# اِنتساب

مصحفی کے اُن بے شمار عقیدت مندوں کے نام

جو اس سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں

# نذرانۂ عقیدت

کہتا ہوں جو ایسا ریختہ میں
یہ فیضِ سخن ہے مصحفی کا
(مرزا حیدر علی گرم دہلوی)

مصحف ہے شعورؔ جس کا ایماں
سمجھے گا وہ قدر مصحفی کی
(عبدالرؤف شعورؔ بلگرامی)

جانے دے تسلیؔ تو نہ فکر سخن کا
پھبتا ہے سخن مصحفی و میر کے منہ پہ
(ٹیکارام تسلیؔ)

سچ تو یہ ہے کہ تمناؔ کو جہاں میں ہرگز
مصحفی سا نہ ملے گا کوئی استاد کہیں
(بھیروں داس تمناؔ لکھنوی)

با شاعراں پیشیں غافلؔ مرا چہ کار ست
خوش کردہ ام طرز استاد مصحفی را
(منور خاں غافلؔ)

کچھ کچھ ہے ریاضؔ میر کا رنگ
کچھ کچھ ہے شان مصحفی کی
(سید ریاض احمد ریاضؔ خیرآبادی)

اس سخن کا جلیلؔ کیا کہنا
مصحفی کی زبان ہے گویا
(حافظ عبدالجلیل مانکپوری)

عاشقؔ زمانہ پیدا کرے اب ملک کو
وہ مصحفی کے ساتھ گئی مصحفی کی بات
(نواب شمس الدین علی خاں عاشقؔ اجمیری)

# الفاظ گفتنی

الحمد للہ "مصحفی۔ حیات و کلام" کی پذیرائی میرے تصور اور میری اُمید سے کچھ زیادہ کی گئی لیکن اہل الرائے حضرات نے جو تبصرے کیئے وہ کسی قدر حوصلہ افزائی کے عنصر سے خالی تھے کیونکہ تبصروں میں مندرجات کتاب پر اس حیثیت سے نظر کم ڈالی گئی جس سے تحقیق کا تقاضا پورا ہوتا اور مجھے اپنی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا علم ہو سکتا۔ بہر حال

ہر چہ از دوست میرسد نیکو ست

بعض حضرات سے یہ شکوہ ہے کہ تبصرہ کرنے کے ارادہ کا اظہار کر کے کتاب حاصل کی یا کتاب حاصل کرنے کے بعد زبانی اس کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا لیکن خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ دو سال کی مدت گذر جانے کے باوجود یہ ناچیز تصنیف ان کی بیش بہا رائے سے محروم رہی۔

جن بزرگوں اور دوستوں کی قلمی و اخلاقی معاونت میری شریک حال رہی ان کا نام بنام شکریہ ادا کرنے کو میں تملق اور چاپلوسی تصور کرتا ہوں البتہ دل ان کے معاصرانہ و مشفقانہ برتاؤ کے احساس سے لبریز ہے اور یہی سچی احسان مندی کا تقاضا ہے۔

تصحیح کی امکانی کوششوں کے باوجود کچھ غلطیاں باقی رہ گئیں اور کچھ حوالوں کے صفحے درج نہ ہو سکے۔ اس کمی کو کسی حد تک اس سے اگلے صفحے میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسے ضرور ملاحظہ فرما لیجئے۔

افسر صدیقی

# غلط نامہ

| صفحہ/سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|
| ۲۷/۶ | اشک | رشک |
| ۵۳/۲۰ | طالبات | عالیات |
| ۶۸/۱ | گوہاں | گویاں |
| ۱۱۲/۹ | ۱۲۶۱ھ کو | ۱۲۶۰ھ میں |
| ۱۳۴/۱۰ | سبع سیاح | سبع سیارہ |
| ۲۲۰/۱۲ | استاد | استادِ من |
| ۲۲۷/۲ | عماس | عباس ہیں |
| ۳۱۲/۹ | کہ منتظر | کہ وہ منتظر |
| ۳۲۵/۲۱ | جاودانی | جاوداں |
| ۳۴۲/۱۴ | عبدالغنی | عبدالحی |

---

حوالے کی چند کتابوں کے صفحات درج ہونے سے رہ گئے ہیں یہ حصہ اسی غلطی کی تلافی کے لئے ہے ۔

| صفحہ | |
|---|---|
| ۳۴ | بہارستخزاں ص ۷ |
| ؍؍ | انتخاب یادگار حصہ دوم ص ۱۳ |
| ۸۹ | گلدستہ نشاط ص ۷ |
| ۲۰۱ | بہار سخن ص ۳۴۲ |
| ۲۱۱ | حدیقۂ بے نظیر ص ۷ |
| ۲۲۲ | ملخص تسلیم ص ۸۲ |
| ۲۲۸ | دیوان ناسخ دوم ص ۲۱۷ |
| ۲۵۰ | مفتاح التواریخ ص ۳۸۵، ۳۸۹ |
| ؍؍ | ریاض الفصحا ص ۲۴۶ |
| ۲۶۱ | سخن شعرا ص ۳۸۰ |
| ۲۸۰ | ریاض الفصحا ص ۳۰۰ |
| ؍؍ | شعلۂ جوالہ جلد دوم ص ۹۰۳ |
| ؍؍ | خمخانۂ جاوید اول ص ۷ |
| ؍؍ | آب بقا طبع دوم ص ۳۳ |
| ۳۳۳ | مدائح الشعرا ص ۴۴ مطبوعہ |
| ۳۴۶ | یادگار ضیغم ص |
| ۳۵۷ | سراپا سخن ص ۲۵ |

۳۶۵/۱۸ سخن شعرا ص ۵۲۹

# کچھ اس کتاب کے بارے میں

استادی شاگردی کا مسئلہ نیا نہیں ہے جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے یہ سلسلہ بھی جاری ہے کوئی علم یا فن ایسا نہیں جو بتائے اور سکھائے بغیر کسی کو صحیح طور پر آجاتا ہو۔ یہ طریقہ اب بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے نافذ العمل تھا یہ اور بات ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد کا نام ظاہر کرنے کو اپنے لئے باعث عزت و سعادت خیال کرتا ہے اور کوئی اس تعلق کو پوشیدہ رکھ کر کتمان حقیقت اور احسان فراموشی کا مرتکب ہوتا ہے۔

استاد و شاگرد کے تعلقات پر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم ہے۔ اب سے ساٹھ ستر سال پہلے تک ان کی اُردو ریڈروں کا بہت چرچا تھا۔ یہ نظم اس میں درج تھی۔ راقم سطور کی اُردو تعلیم کی ابتدا انہیں ریڈروں سے ہوئی تھی۔ اس نظم کے کچھ شعر ابھی تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ بھی لطف اُٹھائیے ؎

ہے ماں باپ کا پہلے رُتبہ بڑا ۔۔۔ جو بعد اُن کے ہے حق تو استاد کا
وہ تم کو سکھاتا ہے علم و شعور ۔۔۔ جہالت طبیعت سے کرتا ہے دُور
جہاں تک بنے ان کی عزت کرو ۔۔۔ دل و جان سے اُن کی خدمت کرو

یہ نظم صرف بچوں کے لئے نہیں ہے بڑوں کے لئے بھی ہے اس وقت جو بڑے ہیں وہ کسی زمانے میں بچے ہی تھے اور جو اس وقت بچے ہیں وہ آگے چل کر بچے ہی نہیں رہیں گے نصیحت کی باتوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑوں کے لئے بھی اتنی ہی کارآمد ہیں

جتنی بجوں کے لئے ہیں مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ آج کل کی تہذیب نے جسے نئی روشنی کہا جاتا ہے چھوٹے بڑے اور شاگرد و استاد کے امتیاز پر اتنے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں کہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے دوسرے علوم و فنون کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کتابی علم کی نسبت جس میں شعر و شاعری کا علم بھی شامل ہے جو کچھ کہوں گا اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہوں گا۔

ابتدائی سترہ سال کی کیفیت جو میرے تعلیم حاصل کرنے کا زمانہ تھا۔ مختصراً یہ ہے کہ اپنے اساتذہ کے سامنے جن کی تعداد ۲۲ سے زیادہ نہ تھی (اُن کے کھڑے ہونے کی حالت میں) بیٹھنے اور اگر وہ کرسی پر بیٹھے ہوں تو اجازت کے بغیر کرسی پر بیٹھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد کے پینسٹھ ۶۵ سال میں جتنے شاگردوں کو تعلیم دینے کا اتفاق ہوا اُن کی تعداد سیکڑوں سے کم نہیں ہے اور ان میں سے بعض اپنے طلب علم کے شوق اور سعادت مندی کے اوصاف کی وجہ سے مجھے بہت عزیز بھی رہے لیکن حصول تعلیم اور فائز المرام ہونے کے بعد میں کسی کی صورت دیکھنے کا گنہگار نہ ہو سکا یہ اور بات ہے۔

راستے میں مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

شعر و شاعری کا معاملہ تو اس سے زیادہ مایوس کُن ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ اس منزل میں قدم رکھنے والا ہر فرد چند روز میں ایسا کیوں ہو جاتا ہے کہ دوسرے شعرا تو ایک طرف رہے اپنے استاد کو بھی وہ اپنے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتا ہے خود میرے احباب میں بعض ایسے لوگ موجود ہیں جن کی تمنائے اصلاح اور اصلاح شدہ غزلوں کی وصولیابی کے بعد اصلاح کی خوبیوں کے اعتراف سے بھرے ہوئے خط میرے پاس موجود ہیں لیکن "کچھ ہو جائے" کے بعد وہ نہ صرف زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے بلکہ اپنے مجموعۂ کلام کو بھی اس حقیقت کے اظہار سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ ظاہر ہے کہ اس طرز عمل سے میرا تو کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ میری زندگی تو اب تک اپنے محدود علم و استعداد کے مطابق طالبان علم و ادب

کی خدمت کرتے گزری ہے البتہ ایسے افراد کو محسن کشی اور احسان فراموشی کی جواب دہی سب سے بڑی طاقت کے سامنے ضرور کرنی پڑے گی۔ انکار شاگردی کا یہ رُجحان آج کا نہیں ہے تاریخی کتابوں اور شعرا کے تذکروں کے اوراق اس قسم کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں مثال کے طور پر میر تقی کے حالات پر غور کیجیے جن کو خدائے سخن کا اعزاز حاصل ہے وہ برسوں سے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہنے اور استفادہ کرنے کے بعد ایسے منحرف ہوئے کہ ذکر میر میں ان کے خلاف جی بھر کے سب وشتم کیا ہے یا مرزا جعفر علی حسرت کے سوانح حیات کو سامنے رکھیے جن کی شاعرانہ کامیابی اور استادانہ شہرت رائے سرب سکھ دیوانہ کی مشفقانہ مساعی کی رہین منت تھی لیکن آخری دور میں وہ استاد کے فیضان صحبت سے منکر ہو گئے تھے۔ سعادت خاں ناصر کہتے ہیں:

"بعد وفات پدر بزرگوار کے دفعتاً نوکری ترک کر کے پیشۂ آبائی میں مشغول ہوا اور مشق سخن سے رفتہ رفتہ مرد معقول ہوا بہ سبب اپنی ناموری کے استاد سے منکر اور حلقۂ اطاعت سے باہر ہوا۔ علت دُکان داری سے محبت استاد کو طاق نسیاں پہ رکھا اور مطلق انحراف کیا[1]"

ظاہر ہے کہ اس کے انکار و انحراف سے شاگردوں کو کیا فائدہ ہوا تاریخیں ان کی تکذیب کر رہی ہیں مصحفی کو بھی ایسی صورت حال کا سامنا رہا اور بعض شاگردوں نے شاگردی سے روگردانی کی لیکن دُنیا نے اس جسارت کو ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دی۔

اُردو شاعری کے پہلے دور میں جس کا آغاز ۱۱۳۱ھ کے قریب ہوا شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شرف الدین مضمون اور غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ بساطِ سخن پر نمودار ہوئے اور دوسرے دور میں شاہ ظہور الدین حاتم، خواجہ میر درد اور مرزا

---

[1] خوش معرکۂ زیبا جلد اول ص ۲۴۸۔

جان جاں مظہر کا سکہ جاری رہا لیکن ان بزرگوں کے شاگردوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے البتہ مصحفی کے قدیم و جدید معاصرین میں کچھ اساتذہ، تعداد تلامذہ کے لئے مشہور ہوئے۔ میر تقی کے شاگردوں کی فہرست میں پینتیس ۳۵ نام آتے ہیں جن کا تذکرہ جناب امداد صابری دہلوی نے "تلامذہ میر" میں کیا ہے[1]۔

سودا، حسرت اور جرأت کے شاگرد کافی ہوئے۔ لیکن اس عہد میں بلحاظ تلامذہ مصحفی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے اس اعزاز کو بعض اہل قلم نے سراہا بھی ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

"شاگرد بھی مصحفی کے اس کثرت سے تھے کہ پرانے اساتذہ میں شاید ہی کسی کے ہوں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شاگرد تازہ از پس شاگرد می رسد
یعنی رجوع خلق بسویم ہماں کہ بود

ان میں سے بعضوں نے بہت نام پایا۔ مثلاً ضمیر، خلیق، رنگین پروانہ، تنہا، منتظر اور گرم ان کے خاص اور عزیز شاگرد تھے"

(مقدمہ تذکرہ ہندی)

یاد رہے کہ مصحفی کے جن شاگردوں کے نام مولوی عبدالحق صاحب نے دیئے ہیں وہ ضمیر کے سوا تذکرہ ہندی گویاں (سال اختتام ۱۲۰۹ھ) کے اعتبار سے ہیں لیکن بعد کے شاگردوں میں بھی بہت سے مشہور اساتذہ ہوئے مثلاً آتش، ناسخ، شہیدی، ذاکر، فرد، اسیر وغیرہ۔ حکیم عبدالحی نے سچ لکھا ہے :

اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ

---

[1] تلامذہ میر مطبوعہ اقفر اکیڈمی راولپنڈی

جتنے استاد ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے
نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے اور
سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب
حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں۔ (اگل رعنا)

مصحفی کے تلامذہ میں کچھ تو اردو کے ساتھ فارسی بھی لکھتے تھے مثلاً سید مظفر علی اسیر، رمضان بیگ طپاں، سید محمد رضا مفتون، مولوی غلام امام شہید، عبدالرؤف شعور، وحید الدین خاں فرد، شیو پرشاد ذوق وغیرہ کچھ ایسے ہیں جو صرف فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے ان کا اردو کلام نگاہ سے نہیں گزرا۔ ان میں شاہ غلام مینا ساحر اور رائے گلاب رائے گلشن کا نام آتا ہے۔ باقی صرف اردو کے شاعر ہیں۔

مصحفی کے بالواسطہ یعنی ان شعرا کی تعداد جن کو ان کے باکمال تلامذہ کے فیض اصلاح سے ناموری نصیب ہوئی پچاس ہزار کے قریب ہے ان کی فہرست راقم الحروف نے چار جلدوں میں مرتب کی ہے اور ابھی تک محتاج طباعت ہے، خدا جانے ایسا موقع نصیب ہو یا نہ ہو۔ البتہ زیر نظر کتاب میں صرف ۱۴۴ براہ راست شاگردوں کے حالات مع انتخاب کلام پیش کئے جارہے ہیں۔ اس کو میری پہلی تصنیف ''مصحفی۔ حیات و کلام'' کا تکملہ سمجھنا چاہئے۔ سوانح کے اندراج میں تقدیم و تاخیر تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتی ہے لیکن مصحفی کے ہر شاگرد کے بارے میں یہ دونوں باتیں ابھی تک محقق نہیں اس لئے انہیں حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

آخر میں یہ اظہار کرتا ہوں کہ میں نے مصحفی کے ہر شاگرد کے لئے ایک جلد مرتب

کرنے کا فیصلہ کیا ہے ان میں سے تخلیق و ضمیر کی جلدیں فیضانِ انیس، اور دگلستانِ دبیر، کے نام سے رسالہ اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ آتش، اسیر، بیمار، ذکی، ذاکر بنارسی، ساحر، شعور، فرو، کاہش، ناسخ اور ہندی کی جلدیں بھی قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں۔ بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ ان کی اشاعت کے لئے رات دن دست بدعا ہوں ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب | گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمناں نظر داری

افسر صدیقی

# خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ علی بخش کے لڑکے اور خواجہ عبید اللہ احرار کے خاندان سے تھے بزرگوں کا وطن بغداد تھا جہاں سے وہ ہندوستان منتقل ہوئے اور دہلی کے قلعہ کہنہ میں قیام کیا خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں دہلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغل پورہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی چوں کہ آپ بجیلے جوان تھے نواب محمد تقی خاں نے جو ترقی تخلص کرتے تھے اور میر سوز کے شاگرد تھے ان کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور انھیں کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے۔ لکھنؤ اس زمانے میں شعر و سخن کا مرکز بن رہا تھا اور مقامی نوجوان شعرا مصحفی کی شاگردی کو اپنی کامیابی کا ضامن تصور کر کے ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے آتش نے بھی اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے آغاز شاعری کیا اور ابتدا میں اپنا تخلص مولائی رکھا اعظم الدولہ سرور نے اسی تخلص کے تحت عمدۂ منتخبہ[1] میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

مولائی تخلص حیدر علی متوطن لکھنؤ سابق در فیض آباد اودھ سکونت داشت و باز بہ لکھنؤ و دہلی آمدہ سکونت اختیار کرد۔ شعر ہندی خوب میگوید از شاگردان رشید غلام ہمدانی مصحفی است ؎

بتوں کے تئیں اس قدر مانتا ہے ہے کافر مرا دل، خدا جانتا ہے
وہ برق تجلی ہے جو ٹک جلوہ گر آئے تو بھر کے نظر دیکھنا سب کا نظر آئے

آتش کی علمی استعداد کچھ زیادہ نہ تھی لیکن لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے ادبی مزاج۔ اہل علم حضرات کی ہم نشینی اور استاد الاساتذہ مصحفی کے فیض اصلاح نے ان کی صلاحیت پذیر طبیعت کو اس درجہ پہ فائز کر دیا تھا کہ خود ان کے استاد نے اپنے ہونہار شاگرد کے بارے

[1] یہ مخطوطہ انجمن ترقی اُردو کراچی کی ملکیت ہے۔

میں یہ الفاظ لکھے ہیں :۔

(آتش) از ابتدائے موزونیٔ طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو میکرد امّا میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود و آں روزہا کلام منظوم خود را بہ نظر فقیر میگذرانید و برافت طبعش ازاں جلوہ ظہور میداد حالاکہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ دریائے طبعش در جوش و خروش در زبان نظم ریختہ کہ آں ہم در متانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ معاصر نیش سبقت برو جستن دشوار می نماید

اور اسی کے ساتھ یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی :۔

اگر عمرش وفا کردہ و چند سال برہمیں ذخیرہ رفت و فکر متینش را مانعے در پیش نیامد یکے از بے نظیران روزگار خواہد شد۔

استاد کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ آتش نے شاعری کے ذخیرے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنی متین خیال آفرینی سے اس کو ایسی ترقی دی کہ وہ اپنے استاد کے سچے جانشین کہلائے اور لکھنؤ کی دنیائے شعر و سخن میں بلحاظ متانت و اثر انگیزی ان کا کوئی مقابل نہ ہو سکا۔

مصحفی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آتش اُردو کے مقابلے میں فارسی کی طرف زیادہ رغبت رکھتے تھے بلکہ انھوں نے شاعری کی ابتدا ہی فارسی کلام سے کی تھی لیکن ان کے مطبوعہ اور قلمی دواوین میں فارسی کا ایک مصرع بھی نہیں ملتا۔ فارسی گو شاعروں کے تذکرے ترتیب دینے والوں نے انھیں فارسی گویوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔

چھریرا بدن کشیدہ قامت اور سیدھے سادے آدمی تھے وضع نہایت سپاہیانہ و آزادانہ رکھتے تھے۔ درویشی کا رنگ غالب تھا مگر اسی کے ساتھ آخر وقت تک تلوار کمر سے جدا نہ کی۔ مغلی خاں (معلی خاں) کی سرا میں رہتے تھے۔ والی ملک سے اسّی روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اس میں سے

پندرہ روپے اپنے خرچ کے لیے رکھ کر باقی غربا و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ بڑے متوکل اور قانع تھے۔ بقول آزاد فقیر محمد خاں سے پچیس روپے مہینہ ملتا تھا۔ سید محمد خاں رند بھی اکثر و بیشتر خدمت کرتے رہتے تھے۔ اس پر بھی کبھی کبھی فاقے کی نوبت آ جاتی تھی مگر چہرے سے اس کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ نہ امیروں کے درباروں میں جا کر غزلیں سنائیں اور نہ ناسخ کی طرح اُن کے مکان پہ امیروں اور عمائد سلطنت کا مجمع رہتا تھا۔ بے شک استاد کی کٹیا میں راسخ العقیدہ شاگرد ضرور حاضر رہتے تھے۔ جہاں مبتدیوں کو منتہی اور شاگردوں کو استاد بنایا جاتا تھا۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی اور اپنے شاگردوں ہی میں نہیں۔ انصاف پسند اور غیر جانب دار لوگوں میں بھی اتنے ہی مقبول ہوئے"

اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں بعض الفاظ غلط تلفظ کے ساتھ نظم ہوئے ہیں جنھیں وہ استعمال عام کے مطابق نظم کر گئے ہیں لیکن اس سے اُن کی واقفیت فن اور علمی استعداد پر کوئی حرف نہیں آتا۔ جس کے ثبوت کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ

ایک دفعہ میر تقی ترقی (میرزا تقی) کے ہاں مشاعرہ میں خواجہ صاحب نے غزل پڑھی۔ شکم کے مضمون میں "موج بحر کافور" نظم کیا تھا۔ طالب علی خاں عیشی نے وہیں ٹوکا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میاں ابھی مدت چاہیے دیکھو تو سہی جامی کیا کہتا ہے ؎

دو پستانش بہم چوں قبۂ نور    حبابے خاستہ از بحر کافور

آتش کے ایک لڑکے تھے جن کا نام خواجہ محمد علی تھا وہ شاعر بھی تھے اور جوش تخلص کرتے تھے۔ ان کا انتقال جوانی میں ہو گیا۔ اس حادثہ نے ان کو بہت شکستہ دل کر دیا۔ آخر ۱۲۶۳ھ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔ قدر دانوں اور عقیدت مندوں نے بہت سے قطعات تاریخ نظم کیے ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں

فصیح شاعران ہند آتش | ز دنیا جانب باغ جناں شد
نوشتم مصرعِ سال وفاتش | کہ از عالم فصیح شاعراں شد

مظفر علی اسیر لکھنوی

۱۲۶۳ھ

مرد نیک و شاعر جادو بیاں و وضعدار | از محاسن ممتلی بودند آتش ہائے ہائے
جائے ایشاں در گلستانِ جناں بوجہ نیست | آتشِ گل واقعی بودند آتش ہائے ہائے
و شکؔ تاریخ وفات شاں چہ عالم سوز گفت | یادگار مصحفی بودند آتش ہائے ہائے

سید علی اوسط اشکؔ لکھنوی

۱۲۶۳ھ

نور آتش چو رفت از دُنیا | در غمش تیرہ گشت کون و مکاں
در فنِ شاعری نظیر نداشت | راست گویند شاعرانِ جہاں
آہ گل شد ز صرصر گردوں | نورؔ مضطر بگو "چراغ جہاں"

میر وزیر نورؔ لکھنوی

۱۲۶۳ھ

خواجہ حیدر علی نازک خیال | تا فتہ امروز از دنیا چو رو
اے وفا بودم ازیں غم گو ملول | بہر سالش بود در دل جستجو
دل ندا زد سال فوت از روے آہ | "شاہ اقلیم سخندانی" بگو

مولوی فصیح اللہ وفاؔ

۱۲۶۲ھ + ۱ = ۱۲۶۳ھ

آتش کا ایک دیوان مطبوعہ ہے اور متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے اس میں صرف غزلیات ہیں۔ دوسرا دیوان ایک تتمہ ہے۔ دونوں کی ایک مجموعی اشاعت ۱۹۶۳ء میں ظہیر الدین احمد صاحب نے اُردو مرکز لاہور سے کی ہے۔

شاگردوں میں، نواب سید محمد خاں رندؔ، میر وزیر علی صباؔ۔ آغا حجو شرفؔ۔ مرزا عنایت علی ماہؔ۔ خواجہ وزیرؔ جو بعد میں ناسخ کے شاگرد ہوگئے۔ میر دوست علی خلیلؔ۔ میر ہدایت علی حبیبؔ۔ سید مہربان علی فرحاںؔ۔ مرزا عباس بیگ نادرؔ۔ نواب محمد حسن خاں

شیدا۔ اور مرزا میستا بیگ منتہی نمایاں ہوئے۔ موخرالذکر حیدرآباد دکن چلے گئے تھے وہیں انتقال کیا۔ اب آتش کے کلام سے لطف اُٹھائیے ؎

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دل کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل
وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرح ناک تھی روح دل شادماں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

---

خدا اگر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

---

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

---

ادب تا چند اے دستِ ہوس قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بار اپنی گردن کا

---

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا

---

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا میرا نہ اک تارِ کفن بگڑا

---

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اُٹھ کر چلے گئے[1]
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

---

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

---

زہر پرہیز ہو گیا مجھ کو
درد درماں سے المضاف ہوا

---

سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنے طور پر سامع
اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

---

کارواں یاروں کا پہنچا منزل مقصود تک
میں بگولے کی طرح سے خاک اُڑا کر رہ گیا

---

[1] اُٹھ بھی کھڑے ہوئے (گلشن بیخار)

لحد تیرہ میں ہونے جو لگا مجھ پہ عذاب　پھر گیا آنکھوں میں عالم شب تنہائی کا

روز سیاہ ہجر میں میرے جلے چراغ　پروانوں کو نصیب ہوا دن وصال کا

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ　ہر قدم پہ ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری　خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست
اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے　دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

مشتاق درد عشق، جگر بھی ہے دل بھی ہے　کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں　در کے نہ دیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

بزم میں رنگیں خیالوں کے جو ہو روشن چراغ　بلبلیں پروانے ہو دیں آتش گلشن چراغ

اُسے جاں کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے　ہماری قبر پہ رویا کرے گی آرزو برسوں

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جس کے مقدر میں　مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

چمن دہر میں وہ سبزۂ خوابیدہ ہوں　باغ جنت کی ہوا سے بھی جو بیدار نہ ہو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر　ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا　زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

نقش پائے رہرواں سے آ رہی ہے یہ صدا　دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے

اُن سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام　گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے　ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے　خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے　ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ　قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمھارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

باغ جہاں میں گُل کی قناعت ہے جائے رشک
عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

عمدۂ منتخبہ قلمی، ریاض الفصحا ص۲۹، گلشن بیخار ص۳۲، گلشن ہمیشہ بہار ص۵
خوش معرکہ دوم ص۱، خمخانہ جاوید جلد اول ص۹

---

## محمد احمد، احمد

خلف منشی محمد اسحاق خاں صدیقی۔ ان کے والد بزرگوار تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں لاہور سے لکھنؤ آئے اور ایک انگریز کی رفاقت میں مراسلہ نگاری کر کے دلجمعی کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔ احمد کی پیدائش یہیں ہوئی۔ نشو و نما بھی یہیں پائی اور جو کچھ پڑھا لکھا وہ بھی لکھنؤ کا طفیل ہے۔ مزاج میں ظرافت اور شوریدگی تھی ابتدا میں جو کچھ کہا اس میں شیخ قلندر بخش جرأت سے اصلاح لیتے رہے اُن کے انتقال کے بعد مصحفی کے شاگردوں میں داخل ہوئے۔ مگر حال یہ تھا کہ کبھی اصلاح کے لیے آتے تھے کبھی نہیں آتے تھے طبیعت رواں تھی۔ اس لیے مشق ترقی کرتی گئی۔ لیکن اس تساہل مزاجی نے استاد کے اصلی انداز سخن سے محروم رکھا کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی بے روح شاعری کا

ابتدائی نمونہ ہے ؎

خیالِ مہرِ تاباں گر ہے اُس کے روئے روشن پر
تو پھر خطِ شعاعی کا گماں پڑتا ہے چلمن پر

سمجھ کر قاتل عالم محبت اُس سے کی ہم نے
وبالِ خونِ ناحق ہے ہمارا اپنی گردن پر

ہوئے یاں اس قدر ہم محوِ الفت اُس کی الفت میں
کہ ہم کو دوستی کا ہے یقیں ہر ایک دشمن پر

ہیں وہ بیکس ہوں جس کی گور پر حسرت برستی ہے
کوئی جز بے کسی آتا نہیں ہے میرے مدفن پر

فتیلہ ہے مژہ اور لختِ دل ہے رو کشِ شعلہ
شب فرقت میں آنسو کو شرف ہے اپنے روغن پر

کیا میں بے خودی سے نامہ کو تسطیر بے معنی
نہ وہ یارب! جواب اس کا کرے تحریر بے معنی

بہم ہونا جہاں میں صورت و معنی کا لازم ہے
جو دیکھو غور سے ہے صورتِ تصویر بے معنی

خم زلفِ بتاں نے کر دیئے معنی ثبوت اس کے
وگرنہ تھا سراسر حلقۂ زنجیر بے معنی

جواب نامہ آیا پر ذرا کھلتا نہیں مطلب
ہوا ثابت کہ ہے اپنا خطِ تقدیر بے معنی

نظر کی جب سوادِ ابروئے قاتل پہ اے احمد
نظر آئے حروفِ جوہرِ شمشیر بے معنی

ریاض الفصحا ص ۱۱

---

# میر اکبر علی اختر

میر عبداللہ کے لڑکے اور سرہند کے پیر زادے تھے۔ مولوی کریم الدین کہتے ہیں کہ ان کے دادا نواب قمر الدین خاں کے ایک بیٹے تھے۔ اختر آتش بازی تیار کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں دہلی سے لکھنؤ آئے اور مرزا جانی کے مصاحبوں

میں داخل ہوئے اس وقت انجم تخلص کرتے تھے مصحفی بھی دہلی سے لکھنؤ آچکے تھے اور مبتدی شعرا کا مرکز توجہ بن چکے تھے یہ بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ مدت قائم نہ رہ سکا۔ مصحفی نے نزاع انشا کے بعد مجالس شعر و سخن کی شرکت ترک کر دی تھی اور دیوان نظیری کے ردیف بہ ردیف جواب کی تکمیل میں مصروف تھے۔ اختر کو اصلاح کلام کا وقت نہ ملتا تھا اس لیے یہ قلندر بخش جرأت کی خدمت میں پہنچے اور شاگرد ہونے کی خواہش کی۔ خوش معرکہ زیبا کے مصنف کا بیان ہے کہ

"پہلے شاگرد میاں مصحفی کا تھا۔ تخلص اس کا انجم تھا بہ سبب بعض بدگمانی کے میاں صاحب نے اس سے پہلو تہی کی۔ یہ ناتمام واسطے کسب کمال کے جرأت کے پاس آنے جانے لگا ایک دن اُس (جرأت) نے کہا "تم پہلے شاگرد میاں مصحفی کے تھے بے اجازت میاں صاحب کے تمھیں شریک تلامیذ نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم وہ ہم سے صاف ہیں یا مکدّر"۔ اختر میاں مصحفی کے پاس گئے اور ایک رقعہ لکھوا لائے"۔

اس کے بعد جرأت نے ان کو اپنے شاگردوں میں شامل کر لیا۔ تذکرہ نویس ان کی شاعری کے معترف ہیں۔

ان کے ہم عصر حکیم قدرت اللہ قاسم کہتے ہیں:

شعر ہم بسیار گرم ز طبعش می تراود

دوسرے معاصر اعظم الدولہ سرور کا بیان ہے:

کلامش شوخ طبع می گردد

اختر کا کلام بہت کم ملتا ہے مختلف تذکروں سے صرف (۱۷) اشعار دستیاب ہوئے۔ انھیں کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

تماشے کی ہے جا مژگاں پہ جو لخت جگر نکلا ۔۔۔ عجب یہ شاخ گل ہے جس میں شکل گل ثمر نکلا

اور کیا خاک ہو کوئی تجھ پہ ستم گر عاشق — روتے پھرتے ہیں ترے اگلے ہی گھر گھر عاشق

اللہ اللہ رے تری جلوہ گری کا عالم — نہ لگے گرد کو بھی جس کے پری کا عالم

کیا کہوں کل تری رفتار کی اٹکھیلی دیکھ — کچھ عجب چال سے تھا کبک دری کا عالم

پھروں میں آپ ہیں آتا نہیں ہمدم اس بن — مجھ سے مت پوچھ مری بے خبری کا عالم

لے کے دل جان سے مارا مجھے اختر اُن نے — کیا کہوں، اُس کی میں بیدادگری کا عالم

---

بزم میں کس کی رات جاگے تھے — ہے جو اب تک خمار کا عالم۔

---

کوئی جتا دے یہ اُس شوخ بے وفا کے تئیں — کہ آشنا نہیں دکھ دیتے آشنا کے تئیں

---

بہ تیغ جو کھینچے ہے قاتل اسے کہتے ہیں — تڑپے ہے جو دل میرا بسمل اسے کہتے ہیں

یارب وہ ملے مجھ سے تا لوگ کہیں مجھ کو — ساحر اسے کہتے ہیں عامل اسے کہتے ہیں

اختر ہیں اسے چاہا یاں تک کہ وہ میرا بھی — قائل ہے کہ ہاں سچ ہے مائل اسے کہتے ہیں

---

صدا آواز کے بھی ہم تو سننے کو ترستے ہیں — خوشا حال ان کا ہے جو آپ کے ہمسایہ بستے ہیں

تمہاری ہی جبین ابرو ہی کا مارا ہے وہ اے پیارے — کمر اختر کے ناحق قتل پر اب آپ کستے ہیں

---

صاف دل سے بھی جو اس کو اپنے ہم گھر لے گئے — تو بھی سب دل میں گماں کچھ اور ہم پہ لے گئے

بولے گھبرا کر ہمیں بیٹھے جو یہ حرکت کرے — سامنے اس کے گلے تک ہم جو خنجر لے گئے

---

ہمارا لے کے خط تجھ سے اگر وہ نامہ بر کھولے — تو کہہ دینا اسے ٹک دائیں بائیں دیکھ کر کھولے

---

کچھ ستارا شاید اختر کا پھرا ہے ان دنوں — تم جو پاس اپنے اُسے بھر بھر کے بلوانے لگے

۱ عمدہ منتخبہ ص ۹۵، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۱۵۲، خمخانہ جاوید جلد اول ص ۱۹۹

ریاض الفصحا ص ۱۹، مجموعہ نغز ص ۵۷، شمیم سخن ص ۸۵

# مرزا محمد مہدی اخگر

خدا جانے ان کے والد کا نام کیا تھا۔ اُردو شعرا کے تذکروں میں یہ نام نہیں ملتا۔ صرف مصحفی نے ریاض الفصحا میں مختصر سا ذکر کیا ہے اور ان کے بزرگوں کا وطن قراباغ بتایا ہے اخگر کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی نہایت مہذب الاخلاق جوان تھے فارسی و اُردو کی متداول کتابوں سے بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے اور مصحفی کی شاگردی نے استعداد میں مزید اضافہ کر دیا تھا، کلام میں بندش کی چستی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی انہیں آثار و علامات کی بنا پہ استاد نے یہ رائے دی ہے کہ "البتہ بجائے خواہد رسید"۔ کلام یہ ہے:

جذبۂ شوق جو خضرِ رہِ صحرا ہو جائے — کیوں نہ سرگشتہ ترا بادیہ پیما ہو جائے
شعلۂ رُخ پہ ترے دستِ تصوّر جو رکھوں — کیا عجب اُس سے نمایاں یدِ بیضا ہو جائے
اُس شکر لب کا میں ہوں کشتۂ دیدار اخگر — تلخیٔ مرگ مجھے کیونکہ گوارا ہو جائے

---

جذبۂ شوق میں وحشت نے جو بن دکھلایا — خارِ مژگاں نے مرے رنگِ چمن دکھلایا
ایسے ہم شامِ غریبی میں گرفتار ہوئے — جس نے ہرگز نہ رُخِ صبحِ وطن دکھلایا
اخگر از بس کہ مرے جسم پہ تھی کثرتِ داغ — گور میں میں نے فرشتوں کو چمن دکھلایا

---

رُک کے اُٹھ آتے نہ کیوں اُس سروِ قد کے پاس سے — ہمت گلِ حرماں چنا کرتے تھے نخلِ یاس سے
جان و دل، ہوش و خرد، تاب و تواں، صبر و قرار — ہوتے ہیں رخصت طلب سب کوں جو اس کے پاس سے
تیغِ جورِ آسماں ہے لازم گردن کشاں — کون سا گوشہ بچا ہے یہاں جفائے راس سے
مصحفی کے طرز پہ اخگر غزل کہتا ہوں میں — کام کچھ ہرگز نہیں مجھ کو عوام الناس سے

---

گلبرگِ تر کو رنگ سے جس کے ہو انفعال — ہے ان دنوں میں وہ گُلِ داغِ کہن کا رنگ
ہم اس دیار کے ہیں مسافر کہ ہے جہاں — غربت کی شام میں رُخِ صبحِ وطن کا رنگ

ایک دن بیٹھے تھے تیرے سایۂ دیوار میں
آفتاب حشر نے خوب انتقام اس کا لیا

قامت خم گشتہ میں نقشہ ہے کیوں مضراب کا
گر نہیں تارِ نفس کا ٹوٹ جانا عنقریب

باغباں ہم کو سمجھ تو نقش دیوار چمن
ہم بھی اک بے دست و پا سے ہیں ہوادار چمن

لب خاموش کی تعریف میں خاموش ہوں میں
مستیٔ چشم تری دیکھ کے مدہوش ہوں میں

توسن فکر سے اگرچہ مرے نت چرخ نژند
دب کے کہتا ہے ترا غاشیہ بر دوش ہوں میں

ریاض الفصحا ص ۲۱ تا ۲۴

---

# لالہ گور بخش رائے ادیب

امکنی داس کہار ساکن محلہ مفتی گنج لکھنؤ کے لڑکے تھے۔ لالہ بینی پرشاد ظریف کے مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ عنفوان شباب میں شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ ظریف نے ہونہار دیکھ کر اپنے استاد مصحفی کے سامنے پیش کر دیا۔ مصحفی کے فیضان اصلاح سے ادیب مشاعروں میں کامیاب ہونے لگے لیکن مصحفی کے دوسرے شاگردوں کو ان کی کامیابی پسند نہ آئی۔ آخر شیخ محمد عیسیٰ تنہا کے کہنے سے مصحفی نے ادیب کے کلام کی اصلاح سے دست کشی اختیار کر لی۔

ادیب نواب سعادت علی خاں والیٔ اودھ کے تامجھان کے کہاروں میں تھے اور نواب ان پر بہت عنایت کرتے تھے حتیٰ کہ اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنا کلام حضور شاہی میں آزادانہ پڑھ سکیں۔

یہ نواب سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد نواب غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں کوٹھہ خزانہ عامرہ کی محرری پر مامور رہے۔

مصحفی نے اپنے تذکرے "ریاض الفصحا" میں ادیب کی عمر بیس سال کے قریب بتائی ہے (صفحہ ۳۷۰)۔ اس حساب سے ان کی پیدائش تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں قرار دی جاسکتی ہے۔ ادیب اردو بھی کہتے تھے اور فارسی بھی۔ مصحفی نے ان کے دونوں قسم کا کلام اپنے تذکرے میں درج کیا ہے جس کا انتخاب یہ ہے:-

از بس کہ تو کسی کا صنم یار کم ہوا
روٹھا تو جس سے، تجھ سے وہ بیزار کم ہوا

عقدے سے تیری زلفِ معنبر سے مشک کو
تولا تو وزنِ نافۂ تاتار کم ہوا

لاکھوں ہی قتلگہ میں گئے جان سے ولے
غصہ ترا نہ اے بتِ خونخوار کم ہوا

کوچے سے اس کے اب کہیں اٹھ جاتو اے ادیب
اس جا علاجِ عاشقِ بیمار کم ہوا

---

قاصد یہ جا کے کہیو تو میرے حبیب سے
جاتا رہا ہے صبر دلِ ناشکیب سے

جانا کسی نے ہم کو نہ اتنا کہ کون ہے
شہر بتاں میں ہم رہے لیکن غریب سے

دل تھا جو اس کے پاس سو وہ کرچکا نثار
اب کیوں خفا رہو ہو میاں تم ادیب سے

---

(فارسی)

حاصل شود مرا بجہاں آرزوئے دل
گر یک نگاہ ناز تو افتد بہ سوئے دل

از گریۂ سحاب، چمن سبز می شود
آرے بود ز گریۂ من آبروئے دل

شاید بہ سینہ سوخت دلش کامشب اے ادیب
بوئے کباب سوختہ آید ز بوئے دل

---

در دلِ غمزدہ از عشق شرارے دارم
ہمچو گلگونہ چہ زیبندہ بہارے دارم

باعثِ روشنی چشم بصارت مشتاق
سرمۂ خاکِ کفِ پائے نگارے دارم

مئے عیش دو جہاں رفع ملالم نکند
من کہ از مستی چشم تو خمارے دارم

---

مردم ہمہ لباسِ بسنتی نمودہ اند
یعنی نوید داد، بہ پیر و جواں بسنت

نواب ما کہ غازی ادین است نام او
آں ناز و بہ کشور ہندوستان بسنت

---

ریاض الفصحا صہ ۳۶

# منشی سید مظفر علی اسیر لکھنوی

اسیر کے والد میر مدد علی ولد سید محمد علی ابن مولوی سید معین الدین بن محمد صالح کروڑی حضرت عباسؓ کی اولاد میں تھے اور امیٹھی ضلع لکھنؤ میں رہتے تھے۔ شاعر بھی تھے اور فارسی کہتے تھے مائلؔ تخلص تھا نواب علی حسن خاں نے ان کے یہ دو شعر اپنے تذکرے ''صبح گلشن'' میں درج کیے ہیں ؎

کج کلہ کردہ بصد شوخی و ناز آمدہ ٭ بارک اللہ بہ اہل نیاز آمدہ

آں قدر باش کہ من عمر ز سر بہ گیرم ٭ چوں در آغوش من اے عمر دراز آمدہ

اسیر کی ولادت ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۲۲۲ھ کو ہوئی۔ ہوش سنبھالنے پر انھوں نے اپنے چچا سید علی اور علمائے فرنگی محل سے معانی و بیان کی تکمیل کی۔ عربی صرف و نحو، منطق، فلسفہ اور حکمت میں بھی انھیں کے شاگرد ہوئے۔ فارسی کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ فقہ اور اصول فقہ میں مرزا کاظم علی اور میر قائم علی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مذاق شعرگوئی موروثی تھا۔ طبیعت کے رُجحان نے شعر گوئی کی ابتدا کی تو شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کے شاگرد ہوئے لیکن دو تین سال سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد خود مشق کی اور ایسی مشق کی کہ استاد الاساتذہ بن گئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شیخ زادگان لکھنؤ کے خاندان میں جو ننہال سے تعلق رکھتا تھا شادی ہو گئی اس کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگے۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ (۱۲۲۹ھ تا ۱۲۵۳ھ) کے عہد میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آٹھ سال تک صدر امانت میں امین رہے نواب امجد علی شاہ (۱۲۵۳ھ - ۱۲۵۸ھ) کے زمانے میں نواب امین الدولہ (۱۲۵۸ھ - ۱۲۵۹ھ) کا ستارۂ اقبال عروج پہ آیا تو ان کی عنایت سے اسیر کو میر منشی کا عہدہ مل گیا۔ جو ۴ - ۵ سال تک قائم رہا۔ زمانے کی گردش سے امین الدولہ معزول ہوئے

تو اسیر کو ان کی رفاقت کے جرم میں کچھ مدت قید بھگتنی پڑی۔

واجد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ان کی تقدیر نے پھر پلٹا کھایا۔ انھوں نے قید سے نکال کر تنخواہ مقرر کر دی اور تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کے خطابات سے نوازا۔ خاص سلطانی کچہری کے کارکن بھی تھے اور والیٔ ملک کی مصاحبت بھی رکھتے تھے لیکن ابھی چار ہی برس گزرے تھے کہ انتزاع سلطنت رونما ہوا اور ایک مرتبہ پھر بیکار ہو گئے۔ نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور (روہیلکھنڈ) نے لکھنؤ کے قیام میں اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لیے اسیر کو مقرر کیا تھا اور اب نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد اپنے والد کے جانشین ہو کر ریاست رام پور کے سپید و سیاہ کے مالک بن چکے تھے۔ اسیر کی بیکاری کا حال سن کر اپنے ہاں طلب کر لیا اور کلام کی اصلاح ان کے سپرد کر دی۔ یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں کی قدر دانی سے کچھ مدت فراغت کی زندگی بسر کرتے رہے آخر ۷۶ برس ۳ مہینے ۱۳ دن کی عمر پا کر ۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کو وفات پا گئے[1]۔ امیر مینائی مرحوم کے قطعہ تاریخ کے مصرع آخر

سلطان سخن، امام فن، قبلۂ من

۱۲۹۹ھ

سے سن وفات بر آمد ہوتا ہے۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی نے بھی ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے ؎

چوں بہادر جنگ اسیر از رزمگاہ دہر رفت | جان فن شاعری افتاد اندر دار و گیر
بر سر الفاظ خود جہل مرکب تیغ راند | بر گلوئے معنی آمد دشنۂ رنج کثیر
پا بہ زنجیر جہالت بندش اشعار شد | خانۂ زنجیر شد ہر بیت نظم دل پذیر
گردن علم عروض آمد بہ طوق دائرہ | قافیہ از حرف قید آمد بقید ناگزیر

---

[1] مسدس بے نظیر میں دبدبۂ سکندری کے حوالے سے عیسوی تاریخ وفات ۷ فروری ۱۸۸۲ء لکھی گئی ہے۔

قدرؔ تاریخ وفات آورد اندر قید نظم — شد زہجرِ المومنین آزاد قدسی نفس اسیر

۱۲۹۹ھ

خواجہ محمد یوسف یوسفؔ لکھنوی نے ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا جس کا آخری مصرع یہ ہے ؎

ہاں مصحفی کی باقی تھی ایک یہ نشانی

۱۲۹۹ھ

اسیرؔ بہت پرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے اور تمام اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ فارسی بھی لکھتے تھے اور اُردو بھی۔ البتہ رنگ کلام وہی ہے جو اس وقت کے تمام لکھنوی شعرا کا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت کم اشعار زبان زد خاص و عام ہو سکے۔ استاد مصحفی کے رنگ سخن کی کوئی چھینٹ ان کے کلام پر نہیں پڑ سکی۔

اسیرؔ کا گلستان شاعری بہت پھولا پھلا ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسیرؔ کے شاگرد یا ان کے متوسل موجود تھے۔ ان میں منشی امیر احمد امیرؔ مینائی اپنے استاد کے سچے جانشین ہوئے۔ دوسرے شاگردوں میں مولوی الٰہی بخش نازشؔ خیرآبادی منشی ریاض احمد ریاضؔ خیرآبادی حکیم عابد علی کوثرؔ خیرآبادی حکیم نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ بریلوی۔ نواب سلیمان خاں اسدؔ بریلوی۔ مردان علی خاں رعناؔ مرادآبادی منشی احمد علی شوقؔ قدوائی۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کے اصلاح یافتہ شعرا سے ملک کا کوئی حصہ خالی نہیں۔ اسیرؔ کے دونوں لڑکے غضنفر الدولہ سید غضنفر علی خاں حکیمؔ اور افضل الدولہ سید افضل علی خاں افضلؔ بھی اپنے والد بزرگوار کے شاگرد اور اُن کی صحیح یادگار تھے

اسیرؔ کی تصنیفات کی فہرست کافی طویل ہے۔ فارسی کا دیوان گلشن تعشق کے نام سے طبع ہوا تھا۔ اُردو کے چھ دیوان ہیں ان میں سے پہلے دیوان کا نام گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) اور دوسرے دیوان کا نام ریاض مصنف (۱۲۷۱ھ) ہے اور دونوں کے نام تاریخی ہیں۔ باقی

دواوین کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ چند مثنویاں لکھی ہیں۔ زرِ کامل العیار شرح معیار الاشعار اور شجرۃ العروض کے علاوہ کئی رسالے عروض و قافیہ اور صرف و نحو میں تصنیف کیے تھے۔ ایک مجموعہ کلام کا نام "گلدستہ امامت" ہے جس میں مناقب حضرت سید الشہدا رضی نظم کیے ہیں۔ معارج الفضائل، درۃ التاج۔ قواعد المظفریہ عربی مثنوی اصولِ زبان اردو۔ مثنوی فروغِ زبان اردو۔ رسالہ علم قوافی فارسی، رسالہ مختصر در عروض۔ رسالہ اضافات فارسی۔ رسالہ در تشریح الحروف۔ رسالہ در علم منطق۔ مجموعہ قصائد۔ ایک دفتر مراثی۔ اتنی کتابیں اور لکھی تھیں ان میں سے کچھ چھپیں کچھ غیر مطبوعہ رہ گئیں معلوم نہیں اب اُن کے قلمی نسخے کہیں ہیں یا ضائع ہو گئے۔

اسیر صحت زبان کے لحاظ سے مستند اور اصول فن کے اعتبار سے مسلّم تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عبد الغفور خاں نسّاخ نے جن شعرائے لکھنؤ کے کلام پہ اعتراض کیے تھے ان میں اسیر مرحوم شامل نہیں تھے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

دشمن جو سمجھتے ہو تو کیوں رہتے ہو غافل
دشمن سے جہاں میں کوئی غافل نہیں رہتا

آنکھ اُس کی پھری مجھ سے یہ باور نہیں آتا
کیا ضعف سے بیمار کو چکّر نہیں آتا

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پہ دمِ حشر
ناز نے غمزہ پہ غمزہ نے ادا پہ رکھّا

نفع پہنچا نہ کسی کو چمن گردوں سے
گُلِ خورشید کبھی زیبِ گریباں نہ ہوا

اُس کے دامن سے مرے خون کا دھبّا دھوتا
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا

تصوّر لبِ جاناں میں داغ کھاؤں گا
چراغ آتشِ یاقوت سے جلاؤں گا

یاد ایّام کہ رہتے تھے کھچے یار سے ہم
اب یہ عالم ہے کہ جھُکنے لگے اغیار سے ہم

احباب کی نظر میں سبک ہوں تو ہوں اسیر
کرتا ہوں شکر دل پہ کسی کے گراں نہیں

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمرزش کی
بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

باقی ابھی ہے ترکِ تمنا کی آرزو
کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شبِ ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
بہت آگے گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

نبضِ بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

کیونکر نہ دیکھیں رجعتِ انجم آسماں سے ہم
کوئی ستارہ نحس ہے کوئی سعید ہے

نشۂ بادہ اڑاتا ہے سلیماں کی طرح
کم نہیں کشتیِ مے تختِ سلیمانی سے

تختۂ گلزار ہے خونِ شہیداں سے زمین
دیکھ اے بلبل بہارِ بے خزانِ کوئے دوست

ضعف سے پیوند میں ہر جا زمیں کا ہو گیا
مثلِ نقشِ پا جہاں بیٹھا وہیں کا ہو گیا

دلِ مجروح کو کیا دیکھنے آئے ہو بے پردہ
چھپاؤ چہرہ دیکھو چاندنی پڑتی ہے بسمل پر

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضمون چراغ سے
روشن ابھی کا نام رہے جو جلائے دل

اٹھ گئی ساری کچہری ہو چکا سب کا حساب
ڈھونڈتے ہی رہ گئے محشر میں ہم جلاد کو

ایک کیا ایسے جو سو عالم خدا پیدا کرے
غیر ممکن ہے کہ تجھ سا دوسرا پیدا کرے

تھک چکے ہیں پاؤں اس کا آستانا دور ہے
دن ہے کم، منزل کڑی ہے اور جانا دور ہے

خاکساری سے نہیں بہتر جہاں میں منعمی
مل گئی جس کو یہ دولت کیمیا گر ہو گیا

اب کہاں وہ لکھنؤ، وہ ساکنانِ لکھنؤ
رہ گئی باقی زباں پہ داستانِ لکھنؤ

---

خوش معرکۂ زیبا اول ص ۵۳۱، بہارِ بے خزاں ص ـــ ، سراپا سخن ص ۱۱۸، ۲۷۳
سخن شعرا ص ۲۵ ، انتخابِ یادگار ص ۱۲ ،
بزمِ سخن ص ۱۳ ، کلیاتِ قدر ص ۳۵۸ ، گلِ رعنا ص ۳۹۶ ،
خمخانۂ جاوید اول ص ۲۹۹ ، آبِ بقا اشاعتِ ثانی ص ۲۷ ـ ۳۱

# منشی سید ہدایت علی اسیرؔ، زیدپوری

خلف سید امیر علی۔ زیدپور ضلع بارہ بنکی کے باشندے تھے۔ اول شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کے شاگرد رہے، ان کے انتقال کے بعد نواب حسین علی خاں اثرؔ کی شاگردی اختیار کی۔ عدالت دیوانی میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ اُردو کے ساتھ فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے اور اس میں اپنا تخلص اسیری رکھا تھا۔ مصنف سراپا سخن نے انہیں باشندۂ لکھنؤ لکھا ہے۔ ان کے اشعار لکھنؤ کے انداز سخن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تذکرہ سراپا سخن سے یہ کلام نقل کیا جاتا ہے۔

چار نخل آتشیں ہیں اب ہمارے ہاتھ پاؤں
ہر بُنِ مو سے اُڑاتے ہیں شرارے ہاتھ پاؤں

بحرِ الفت میں دِلا لاکھوں ہی مارے ہاتھ پاؤں
گوہرِ مقصود ہاتھ آیا نہ پایا آشنا

تو گرفتاروں نے بھی پھیلائے بارے ہاتھ پاؤں
شور اب زنجیر دست و پا کا پھر اُٹھنے لگا

آبلوں سے پھل گئے جب میرے سارے ہاتھ پاؤں
خوشہ ہائے تاک کی ہر ایک نے پھبتی کہی

کس طرح سے دست و پا اپنے چھڑائیں اے اسیرؔ
ہیں گروِ بازارِ میرٹھ میں ہمارے ہاتھ پاؤں

ان کے ایک شاگرد منشی کریم بخش ولد شیخ فتح علی تھے یہ اترولی نواح علی گڑھ کے ساکن تھے اور میرٹھ کی عدالت دیوانی میں محرری کرتے تھے۔ تخلص فائزؔ تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

دیکھے جب بہزاد نے وہ دست و پائے لاشبیہ
تھرتھرائے اس کے چاروں ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں

(سراپا سخن ص ۳۳۲)

# محمد وارث اظہار لکھنوی

حسب ونسب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ابتدا میں پیر بخش سرور کاکوروی کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ دن کے بعد شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مصحفی کے انتقال کے بعد پھر سرور کی طرف رجوع کیا۔ ملازمت گاؤخانے میں تھی۔ خوش معرکہ زیبا کے مصنف کا بیان ہے کہ "کلام اس کا جھگڑا اور پیری سے ٹھنڈا نہیں"

نکلتے ہی جاں تن سے کیا ہو گئی — ہوا کی طرح سے ہوا ہو گئی
شب تار جب اس کا آیا خیال — تری زلف کالی بلا ہو گئی
شریکِ مصیبت نہیں ہے کوئی — مری جان مجھ سے جدا ہو گئی
چمن میں لڑانے لگی تجھ سے آنکھ — یہ نرگس بہت بے حیا ہو گئی
لگا چلنے جب کاروانِ بہار — صدا گل کی بانگِ درا ہو گئی

ناتواں ہوں تو ہی پہنچا دے درِ دلدار تک — کون اے بادِ صبا منت کشِ احباب ہو

کسی شب کو تو آ کر جلوہ گر وہ شوخ پُرفن ہو — ہمارے خانۂ تاریک میں بھی شمع روشن ہو
میں وہ بیکس مسافر وادیٔ غربت میں ہوں یارو — کہ جس کو لوٹ کر دل میں پشیماں اپنے رہزن ہو

میرے رونے پہ یہ کہہ کر ہوا خنداں کوئی — ایسا بے صبر بھی دیکھا نہیں انساں کوئی
زلف کو رُخ پہ کرے گا جو پریشاں کوئی — پھاڑ ڈالے گا ابھی اپنا گریباں کوئی
شبنم و گل کا تماشا ہے تری محفل میں — کوئی گریاں ہے صنم اور ہے خنداں کوئی
آرسی میں نہیں معلوم نظر کیا آیا — صورت آئینہ بیٹھا ہے جو حیراں کوئی
بل پہ بل کھاتی ہے ناحق تو سیہ بختوں پہ — پیچ پڑ جائے نہ اے کاکل پیچاں کوئی

ریاض الفصحا ص ١٣ - خوش معرکہ اول۔ ص ۴۹

## شیخ غلام اشرف افسر دہلوی

ولد شیخ غلام رسول دہلی کے باشندے تھے ان کے بزرگ گاؤ خانہ بادشاہی کے داروغہ (چودھری) کی خدمت پر مامور تھے۔ افسر کی تعلیم رسمی تھی مگر ضروریات شعری سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ابتدا میں ایک دو سال مراثی و سلام کہتے رہے اور اس میں اشرف تخلص کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصحفی نے دہلی میں اپنے مکان پر بزم مشاعرہ کا انعقاد شروع کر دیا تھا۔ افسر بھی اس میں شریک ہوئے اور مصحفی کی ترغیب پر غزل کہنا شروع کر دی چونکہ طبیعت فن شعر سے کامل مطابقت رکھتی تھی اور مناقب گوئی کی وجہ سے قوت نظم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ غزل گوئی میں بھی کامیاب ہوئے اور اس میں مصحفی ہی سے اصلاح لی۔

دہلی کی بزم ادب اُجڑی اور وہاں کے اہل کمال مشرق کی طرف ہجرت کرنے لگے تو افسر نے بھی وطن کو خیرباد کہہ دیا، یہ لکھنؤ کب پہنچے۔ کس طرح پہنچے، اور راستے میں کہاں کہاں قیام کیا، ان سوالات کا جواب حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھنؤ آپہنچے تھے۔ کیونکہ مفتی غلام حضرت لکھنوی کے انتقال کا قطعہ تاریخ ان کے دیوان میں موجود ہے جو اسی سال فوت ہوئے تھے۔

ان کے سالِ وفات کا علم نہیں لیکن وہ نواب روشن الدولہ کی وزارت (   ) کے دور تک موجود تھے۔ افسر کا مکمل دیوان بانکی پور لائبریری میں ہے اس میں (۱۰۹) اوراق ہیں اور مصرعوں کی تعداد ۳۰۴۳ ہے اس دیوان میں غزلیں، مخمس، قطعات، مثنویاں اور ترکیب بند تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ مصحفی کی وفات کا قطعہ تاریخ بھی ہے جس کا مادہ "مصحفی نے سجا مقام بہشت" ہے۔ انتخاب کلام یہ ہے ؎

۱۲۴۰ھ

حسنِ جہاں ہے عکس تری آب و تاب کا — دریا سے اتصال نہیں کس حباب کا
ہو دے نصیب جلد کہیں وصل یار کا — احوال بے قرار ہے دلِ بے قرار کا
جہاں میں مجتمع بائیس جلدیں کر کے رحلت کی — اے افسر مصحفی شاعر بڑا استادِ کامل تھا
دارِ فانی میں اگر شاہِ زمن ہوں تو کیا — ایک دن چھوڑ کے میں تنگ محل جاؤں گا

---

خفتگانِ خواب مضطر ہی نظر آئے بخواب — مر مٹے پر بھی گیا ہرگز نہ دل کا اضطراب

---

جب دیکھے ہے مرد داغ سیہ اپنی جبیں پر — آتا ہے اسے رشک ترے روئے حسین پہ
معلوم نہیں کیا ہے تہِ خاک تماشا — نرگس کی جو رہتی ہے جھکی آنکھ زمیں پر

---

شاید صبا تری بو لائی چمن کے اندر — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر

---

کٹے ہے خواب میں غفلت کے دوستاں ہر روز — یہ عمر جاتی ہے افسوس رائگاں ہر روز
نہ طول اس کا ہوتا روزِ آخرت آخر — کہوں گر اپنی شبِ غم کی داستاں ہر روز
جگاتا پھرتا ہے فتنے کو خوابِ غفلت سے — یہ بے سبب نہیں غفلت میں آسماں ہر روز
غمِ فراق سے اُس شعلہ رُو کے اے افسر — جلا کرے ہے مرا مغزِ استخواں ہر روز

---

شام جاتی صبح کریں ہم آہ تڑپ کر اور کہیں — بزمِ طرب میں جلوہ کناں وہ شوخ ستمگر اور کہیں
طرفہ چلن اے ساقیٔ مہوش تم نے ہم سے نکالا ہے — شیشہ ہمیں تو خالی دکھانا بھر کر ساغر اور کہیں

---

خاکساروں سے ہو کیونکر اُس مہِ انور کو ربط — سخت مشکل ہے زمیں سے آسماں ملنا نہیں

---

فصلِ خزاں میں دیکھا نقشہ عجب چمن کا — نے گُل نہ بلبلوں کی شیریں مقالیاں ہیں

---

روبرو کس کے غزل اپنی پڑھوں اے افسر — مصحفی سا کوئی محفل میں جو استاد نہ ہو
چہرے پہ ماہ کے نہ کر اے خیال تو — آئینہ لے کے دیکھ ٹک اپنا جمال تو
گویا شفق میں پنجۂ خورشید ہے — جس وقت ہاتھ کرتا ہے مہندی سے لال تو

---

شب ساقیٔ مہوش کے کس ناز و کرشمہ سے — اک ہاتھ میں شیشہ تھا اک ہاتھ میں پیمانہ
کیا خارِ الم کھٹکا دل پر جو یہی بلبل نے — آغاز کیا گُل کی فرقت کا شب افسانہ

سوگند ہے صبا تجھے بلبل کی بات کی — کب میں نے اس چمن میں کسی گُل کی بات کی

جن کی خدمت میں بسر کرتے تھے اوقات کبھی — اُن سے ہوتی نہیں اب اپنی ملاقات کبھی

دستِ سیاہ ناز سے افسر بتانِ ہند — تاراج اپنا کشورِ اسلام کر چلے

لکھنؤ سے اُٹھ گیا وہ آصفِ دوراں کہ لوگ — نام پر آتے تھے جس کے ہفت کشور سے چلے

داغ نہ تازہ دو کوئی مر کے مجھے چراغ سے — کلبۂ غم میں روشنی ہے مرے دل کے داغ سے

تڑپ کر شام سے بیمار ترا صبح کرتا ہے — نہ پوچھا تو نے کیا صدمہ ترے دل پر گزرتا ہے

ایک جنسِ حُسن تھی سو وہ زلیخا لے گئی — کیا خریدیں جا کے اب ہم مصر کے بازار سے

ٹک نزاکت دیکھیو پہنے ہے جب گجرا وہ شوخ — شاخِ گل سا ہاتھ لچکے ہے گلوں کے بار سے

سیکڑوں کے خانۂ دل پر خرابی آ گئی — ایک دن جھانکا تھا اُس نے رخنۂ دیوار سے

کچھ تمنّا دل کو اپنے باغِ جنّت کی نہیں
کام اے افسرؔ ہے مجھ کو کوچۂ دلدار سے

---

## رباعی

افسرؔ غمِ عشق دل سے کھونا معلوم
جی وصلِ صنم سے شاد ہونا معلوم
مثلِ شبِ ہجر، عمر رقّت میں کٹی
آرام سے غیر مرگ سونا معلوم

---

تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۸، گلشن بے خار ص ۱۲۴، مجموعہ نغز اول ص ۶۰،
عمدۂ منتخبہ ص ۱۰۰، خمخانۂ جاوید اول ص ۳۴۲، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۴۳

# شاہ اکبرؔ

یہ عرف عام میں مرزا بھجو کہلاتے تھے۔ دہلی کے باشندے اور انتہا درجے کے ظریف تھے۔ مزاج میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ محمد شاہ کے نقیبوں میں شامل تھے اس کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کے خواصوں میں داخل ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں شاہ کمال ان سے ملے تھے۔ سرور کا بیان ہے کہ اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ مصحفی کی تحریر کے مطابق جب وہ ۱۱۸۶ھ میں دہلی پہنچے تو سب سے پہلے اکبر نے ان کی شاگردی اختیار کی اور ان کے مشاعرے میں شریک ہوتے رہے۔ مگر کچھ مدت اصلاح لینے کے بعد شاہ ظہور الدین حاتم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور رموز شعر و سخن سے کماحقہ واقفیت حاصل کی۔ قائم کہتے ہیں کہ ان کی شوخ مزاجی و خوش طبعی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ دوسروں کے اشعار اپنے نام سے پڑھ دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے کلام کا انداز وہی ہے جو اس زمانے میں عام تھا۔ اکبر کے دیوان کا نشان کسی کتب خانے سے نہیں ملا۔ البتہ ان کے ایک قصے کا پتا چلتا ہے جس میں ایک افیونی کا ذکر ہے اس کا مخطوطہ انڈیا آفس میں ہے اور ۲۲۲ میں شامل ہے۔ فہرست نگار نے اس کے مصنف کا نام مرزا بھجو بیگ اکبر لکھا ہے معلوم نہیں یہ قصہ نظم میں ہے یا نثر میں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

دل میں جو آج درد ہے اکبر کے دوستاں
کس کی نگہ کے تیر کا پیکان رہ گیا

ہے بر میں مرے یار کے کیا جامہ بھبکن کا
جو بات ہے جامے کا سوختہ ہے چمن کا

جو پردۂ فانوس میں ہو شمع درخشاں
یوں جھمکے ہے جامہ میں ترے رنگ بدن کا

ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا نہ گڑتے ہیں
یہ کافر خوبرو جس وقت تن تن کر اکڑتے ہیں

یہ جتنے خوبرو سرکش ہیں ان کو خوب دیکھا ہے
گھٹے پر حسن کے ایک ایک کے یہ پاؤں پڑتے ہیں

خدا چاہے سو ہووے اب ہمارے حق میں اے اکبر
صنم سے اپنے ہم بھی آج اک بوسہ پر اڑتے ہیں

چھیڑا جو ٹک اُسے تو بگڑ کر کہا کہ واہ     تم کون ہو کہ ہاتھ لگاتے ہو گات کو
سینے میں دل کہاں ہے تو اس کو مت ٹٹولے     بجائے دل میں یاں سیکڑوں پھپھولے
وہ ایک دن نہ سویا میرے گلے سے لگ کر     آتے ہیں اپنے دل میں رہ رہ کے یہ ملولے

باغِ دنیا سے جو سنبھل نکلے     وہی ہو کر نہال، پھل نکلے
آب صورت کو دیکھ کر میری     وجہ کیا گھر سے سج بدل نکلے
جوں قبا اُن کے پاؤں تک اکبر     کوئی پہنچے تو ہاتھ مل نکلے

صفائی کیجئے آئینۂ رخسار کو ملئے     نشے میں اپنے لب سے اُس لب گلنار کو ملئے
خدنگِ ناز کا زخمی ہے اے ابرو کماں اکبر     روا ہے گر لہو اس کا لب سوفار پہ ملئے

تذکرہ ہندی گویاں ص۲۳، مجموعہ نغز ص۶۸، عمدہ منتخبہ ص۹۷،
مجموعۃ الانتخاب - ورق ۱۶، خمخانۂ جاوید اول ص۳۷۴، طبقات الشعراکریم الدین ص۲۷۹

---

# محمد حسین خاں آلم

خلف الرشید حکمت علی خاں۔ اصل باشندے عظیم آباد (پٹنہ) کے تھے۔ لیکن غازی پور میں رہنے لگے تھے۔

آلم کے سلسلے میں دورِ حاضر کے ایک محقق انصار اللہ نظر نے لکھا ہے:

عبداللہ خاں ضیغم کے تذکرے میں آلم غازی پوری کا ذکر مختلف مقامات پر اس طرح ملتا ہے
رسا۔ نواب حسین دوست خاں۔ آلم غازی پوری کے شاگرد ہیں (ص۱۵۵)۔
انجم۔ تخلص بہادر حسین نام خلف نواب حسین دوست خاں رسالہ دار۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ (ص۳۴)

اور انجم کا حال تذکرہ طیبب میں ان الفاظ میں ہے
نواب سید بہادر حسین خاں بن نواب سید قاسم خاں عرف سید حسین صاحب
ان سب تحریروں کو مطابق کریں تو خیال یہ ہوتا ہے کہ
آلم کا نام نواب سید قاسم خاں اور سید حسین دوست خاں عرفیت تھی جسے مخفف کر کے کبھی محمد حسین خاں اور کبھی سید حسین دوست بھی لکھ دیتے تھے۔

اس تحقیق کی داد نہ دینا ظلم ہے جس کے نتیجے میں آلم کے نام، تخلص، ولدیت، وطن سب کو بیک جنبش قلم تبدیل کر کے رکھ دیا گیا اور یہ غلطی صرف اس نکتہ کی بنا پر ہوئی کہ رسا والے ٹیلے میں نواب حسین خاں کا تخلص آلم سمجھ لیا گیا حالانکہ ان کا تخلص رسا تھا اگر آلم نواب حسین دوست خاں کا تخلص سمجھ لیا جائے تو رسا کا سرے سے کوئی نام ہی نہیں باقی رہتا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ نواب بہادر حسین خاں انجم کے والد نواب حسین خاں رسالدار ساکن ملکھنؤ کو نہ صرف شاعر بنا کر پیش کر دیا بلکہ انھیں رسا جیسے شاعر کا استاد بھی ثابت کر دیا۔ کاش، وہ بہادر حسین خاں انجم کے حالات کے لیے خمخانۂ جاوید جلد اول کے ص ۱۱۶ کا مطالعہ کر لیتے۔

آمدم بر سر مطلب۔ آلم کی شاگردی میں قدرے اختلاف ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ انھیں مصحفی کا شاگرد لکھتے ہیں اور عبداللہ خاں ضیغم نے خواجہ حیدر علی آتش کا شاگرد بتایا ہے۔ عنایت حسین خاں مہجور نے کسی کا بھی شاگرد نہیں لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آلم مصحفی کے آخری زمانے میں اسیر، آتش، ذاکر وغیرہ کی طرح ان کے شاگرد ہوئے اور اُن کے انتقال کے بعد آتش سے مشورہ کرتے ہونگے۔

آلم صاحب تلامذہ تھے۔ غازی پور میں اُن کے چند شاگرد بھی تھے جن میں ایک شاگرد حسین دوست خاں رسا کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دوسرے شاگرد مولوی محمد عمر شفا تھے جو رہنے والے تو مچھلی شہر ضلع جون پور کے تھے مگر غازی پور چلے گئے تھے

اور آثم کی وفات کے بعد عظیم اللہ رعنی سے اصلاح لینے لگے تھے۔

آثم بدائع الشعرا کی تصنیف تک حیات تھے اور یادگار ضیغم کی ترتیب کے وقت وفات پا چکے تھے۔ اس لیے ان کی وفات ۱۲۵۵ھ اور ۱۳۰۵ھ کے درمیان واقع ہوئی۔

انصار اللہ نظر نے بیاض رعنی سے آثم کا جو کلام شائع کیا تھا اس کا انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب رسالہ پگڈنڈی امرتسر میں شائع ہوا تھا۔

کر چکے ہیں عشق زلفِ یار کا
زہر ہم پر چڑھ چکا ہے مار کا

غنچۂ نرگس نہ توڑ اے باغباں
خون گردن پر نہ لے بیمار کا

تیغِ ابرو خم رہتے ہم پہ سدا
بَل نہ نکلا ہم سے اس تلوار کا

یاں قیامت ہے دلِ بے صبر پر
حشر پہ وعدہ ہے واں دیدار کا

یہ معمّا کب کھلے گا، دیکھیے
شور ہے کب سے دہانِ یار کا

ربط ہے زاہد کو سبحہ سے کمال
معتقد ہے برہمن زنّار کا

ایک ہی بُت کی ہے دونوں کو تلاش
ہے یہ پردہ کافر و دیں دار کا

دل پہ پڑتے ہیں کبھی آنکھوں پہ پاؤں
یہ نیا انداز ہے رفتار کا

خاک ہونے پر کہاں جاتا ہے وہ
میں ہوں اور دامن ہے میرے یار کا

پھولوں ڈھالوں کے دکھاتی ہے بہار
کیا مزہ دیتا ہے پھل تلوار کا

جھولتی ہے غرّہ بہ شمشیرِ یار
بَل ہے اس کی ابروئے خمدار کا

خوفِ محشر اے آثم دل پہ نہ لا
آسرا ہے واں علَم بردار کا

---

چھو جائے گردہ زلفِ گرہ گیر ہاتھ سے
کیوں سانپ بن کے لپٹے نہ زنجیر ہاتھ سے

ہوگا وہی جو کاتبِ تقدیر نے لکھا
مٹتا نہیں کبھی خطِ تقدیر ہاتھ سے

ہے کتنا رہی جائے ۔ ہے کذا

کرتا ہے وہ اشاروں میں باتیں زباں ہے بند — گویا کہ صاف ہوتی ہے تقریر ہاتھ سے
بےکار راہِ عشق میں ہیں اپنے ہاتھ پاؤں — نے پاؤں سے بڑھ آئے نہ تدبیر ہاتھ سے

یا رب یہی آثم کی دعا ہے بروزِ حشر
چھوٹے نہ دامنِ شہ دلگیر ہاتھ سے

شوقِ بتاں ہے اس دلِ مضطر کے واسطے — یہ آگ ہے بنی اسی پتھر کے واسطے
گردن بنی ہے یار کی تلوار کے لیے — پہلو ہے اُس کی تیزیِ خنجر کے واسطے
باغِ جہاں میں مال جسے ہے اُسے ہے رنج — غنچے بھی خون تھوکتے ہیں زر کے واسطے
کیونکر نہ ہووے بادۂ اُلفت، فروغِ دل — ہے یہ شراب بس اسی ساغر کے واسطے

افشاں بنی ہے زینتِ رخسار کو آثم
ذرّے بنے ہیں مہرِ منوّر کے واسطے

گالیاں سنتا ہوں میں تیرے ہی منہ سے ورنہ — مجکو اک بات بھی کہتا یہ دہن کس کا تھا
مرے آنکھوں کا اگر اپنی وہ خوشخو پونچھتا — غنچۂ سوسن نہ کیوں نرگس کے آنسو پونچھتا
ہو جو ثابت اس غزالِ حسن کا سودا مجھے — کیوں نہ خاکِ پا مری آنکھوں سے آہو پونچھتا
داغ مٹ جاتا سراسر اس کی فرقت کا آثم — آستیں سے گر وہ اپنی میرے آنسو پونچھتا

اُس کے کاکل کا اگر سر میں نہ سودا ہوتا — حال اس درجہ پریشاں نہ ہمارا ہوتا
داغ لگتا نہ کبھی میری مسیحائی پر — ایک بیمار بھی تیرا اگر اچھا ہوتا
اُس کے چھلّے کا جو کھلتا ہی ہتھیلی میں گل — ہائے ہیہات کہ رشکِ ید بیضا ہوتا
مرغِ دل کو مرے آزاد کیا ہوتا کاشس — چشمِ بیمار کا صدقہ تو اُتارا ہوتا
حال وہ تب آثم خستہ کا ہوتا معلوم — دل ترا بھی جو کسی شوخ پہ آیا ہوتا

خمخانۂ جاوید اول ص ۲۶۱، سخن الشعرا ص ۴۳، مدائح الشعرا قلمی ورق ۱۴۰
یادگارِ ضیغم ص ۱۹۲،

# الٰہی بخش الٰہی

لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے فصادی و موئے تراشی ان کا پیشہ تھا اور ان فنون میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے بکمال امتیاز گزر اوقات کرتے تھے۔ پیر بخش سرور کے دوستوں میں تھے اور انھیں کے ساتھ اصلاح کلام کے لیے مصحفی کی خدمت میں آتے تھے۔ طبیعت رسا پائی تھی اور زبان صاف و شستہ استعمال کرتے تھے اس لیے اکثر اشعار نہایت دلدوز اور شور انگیز کہہ جاتے تھے اور اس میں عاشقانہ و عارفانہ دونوں رنگ شامل تھے۔ کلام کا انداز یہ ہے ؎

دامن کو گلنار بنایا آنکھوں سے برسا کے لہو ۔۔۔ غم نے ہماری سیر کی خاطر روز چمن تیار کیا

---

جب قبر میں ان دونوں کو اک بار اُتارا ۔۔۔ غل تھا یہی الفت نے انھیں مار اُتارا

---

رکھتا ہے قصد واں دل مضطر قیام کا ۔۔۔ مانا نہیں کسی کو پتا جس مقام کا

کس کی گلی میں ہوں نظر آتا ہے جو مجھے ۔۔۔ عالم، بہارِ گلشن دارالسّلام کا

اسرار عشق جس پہ کھلے رہ گیا خموش ۔۔۔ یعنی زباں کو یاں نہیں یارا کلام کا

---

جانا تھا کسی شمع کا پروانہ بنے گا ۔۔۔ ہم دل کو نہ سمجھے تھے کہ دیوانہ بنے گا

---

چمن میں گُل پہ کب وہ بلبل ناشاد نے دیکھا ۔۔۔ جو عالم یار پہ مجھ خانماں برباد نے دیکھا

نظر آتا تھا کوہِ طور پہ جلوہ جو موسیٰؑ کو ۔۔۔ رُخ شیریں کے پردے میں وہی فرہاد نے دیکھا

الٰہی اور ہی عالم ہوا اُس کی طبیعت کا ۔۔۔ نگاہِ لطف سے جس کی طرف استاد نے دیکھا

---

نخلِ اُمید نے عاشق کے جہاں سر کھینچا ۔۔۔ اڑہ تیغ ستم چرخ نے اس پہ کھینچا

جس مصور نے لکھے عاشق و معشوق بہم ۔۔۔ لے کر اس کو بنایا مجھے بے سر کھینچا

مہر رخسار پہ گر اس کے نہ تھی زلفِ دراز
اس قدر طول، شب ہجر نے کیونکر کھینچا

---

مٹایا عشق نے جب صفحۂ ہستی سے نام اپنا ——— دو عالم سے پرے ہم کو نظر آیا مقام اپنا
نہیں غم منزلِ مقصد کا یہاں فضلِ الٰہی سے ——— وصی مصطفیٰؐ ہے ساقیِ کوثر امام اپنا

کیوں نہ تڑپوں میں بھلا مرغِ گرفتار کی طرح ——— نیش غم کھٹکے ہے پہلو میں مرے خار کی طرح

بے سبب اور نہیں یہ کھینچتا گردن چراغ ——— دیکھتا ہے آپ میں اپنی ادا تن تن چراغ

صبا کانٹے ہی لا کر تو ہماری خاک پر رکھ دے
گلوں سے کب کسی بے کس کی تربت چھپائی جاتی ہے

ریاض الفصحا ص ۹ ، خوش معرکہ اول ص ۱۸۱ ، سرو چراغاں قلمی

---

## نواب سید علی حسین خاں اندوہ

عہد شاہ عالم ثانی کے امیر شمس الدولہ نواب شمس الدین خاں بہادر قسمت کے پسر بلند اقبال اور بارگاہ قلی خاں کے نبیرۂ باکمال تھے۔ لالہ سری رام نے اندوہ کے والد کا نام شمس الدولہ بارگاہ قلی خاں تحریر کیا ہے اور اس طرح باپ دادا کے ناموں کو یکجا کر دیا ہے۔ اندوہ کے یہاں مجلس مشاعرہ کا انعقاد اکثر ہوتا تھا جس میں شہر کے تمام اچھا کہنے والے شرکت کرتے تھے۔

مصحفی کہتے ہیں کہ "ایک قابل نوجوان ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کی طرح خود بھی پیری کی طرف رجوع کیا ہے کسی دوسرے کی طرف قطعی متوجہ نہیں ہوئے یعنی "پیر من خس است و اعتقادِ من بس است" پر عمل پیرا ہیں۔"

اندوہ کے کلام میں سادگی و بے ساختگی ہے جو کچھ کہتے ہیں اس میں تصنع و آورد کی آمیزش نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ خواہ مصحفی سے دور ہوں یا قریب

کلام انھیں کی نگاہ سے گزرتا ہے جس نے یکسانیت قائم و برقرار رکھی ہے —

ہے بوستانِ حسن میں وہ گلبدن ہنوز    چھلکے ہے تن جو اس کا تہ پیرہن ہنوز
انکار قتل سے ترے ہوتا ہے کیا میاں    لوہو سے تر ہے دیکھ لے میرا کفن ہنوز
تیرِ ستم جو مارے ہیں اس ترکتاز نے    غربال ہو رہا ہے ہمارا کفن ہنوز

---

گور پر مجھ دل جلے کے مت کر و روشن چراغ    لطف کیا ہے گر جلایا بر سرِ گلخن چراغ
غیرتِ مہتاب ہے خود چہرۂ روشن ترا    چاہیے کیا گھر میں تیرے اے بت پرفن چراغ
جب جلے پروانہ اس کی لو میں اے اندوہ تب    واسطے اس کے کرے کیونکہ نہ پھر شیون چراغ

---

کس سے دنیا میں رکھوں چشم مددگاریٔ دل    جز، غم دوست کسی نے بھی نہ کی یاریٔ دل
دانۂ خال نہ دکھلا ہمیں، کافی ہے فقط    دامِ گیسو ہی ترا، بہرِ گرفتاریٔ دل
اے غم یار، خدا تجھ کو سلامت رکھے    یاد ہے تیرے تئیں شیوۂ غمخواریٔ دل
سر اندوہ کو اندوہ ملوں مثل مگس    اسد اللہ رسد گر بہ مددگاریٔ دل

---

مسیح کو نہیں جرأت کہ وہ دوا دیوے    خدا ہی اب ترے بیمار کو شفا دیوے
رقیب نے جو برے دوست کو کیا دشمن    خدا ہی اس کے کیے کی اسے سزا دیوے

---

مت چلو لے کے سوئے باغ مجھے    دیکھنے دو جگر کے داغ مجھے
حیف اندوہ دردِ ہجراں سے    نہ ملا ایک دم فراغ مجھے

---

بیمار مجھے سن کے عیادت کو سب آئے    پر آپ نہ یوں آئے نہ وقتِ طلب آئے

---

غم صیاد و فکر باغباں ہے    دو عملے میں ہمارا آشیاں ہے

---

صیاد نے رکھے گل پژمردہ قفس پر    اچھی ہوس مرغ گرفتار نکالی
مارا تھا ہمیں عشق نے اک پردہ نشیں کے    کیوں نعش ہماری سر بازار نکالی
جو نخل اگا خاک شہیدان مسی سے    سوسن کی کلی اس نے کئی بار نکالی۔

---

ریاض الفصحا ص ۱۳۲، خوش معرکہ اول ص ۱۴۸، خمخانہ جاوید اول ص ۲۶۵، سرد چراغاں قلمی

# شیخ امیر الزماں اوباش

بقول قاسم بجنور کے باشندے تھے جو لکھنؤ سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہے۔ وطن کے بارے میں مظفر حسین صبا کا بھی یہی خیال ہے مگر انھوں نے نام محمد زماں غلط لکھا ہے۔ مصحفی نے ان کو "شیخ زادہائے لکھنؤ" بتایا ہے اور شیفتہ نے اسی کو صحیح سمجھا ہے۔ قاضی فخرالدین بجنوری کے احفاد میں تھے۔ مزاج میں صلاحیت تھی اور درسیات فارسی سے نابلد نہ تھے۔ مصحفی کی خدمت میں علی التواتر آتے رہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اصلاح کے بعد ایک بیاض میں نقل کر لیتے تھے۔ ایک دن یہ مجموعہ استاد کی خدمت میں پیش کیا جس کا انتخاب انھوں نے اپنے تذکرے ہندی گویاں میں درج کیا ہے۔ بقول مصنف خمخانہ جاوید اپنے زمانے کے خوش گو شعرا میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی مشق سخن کرتے تھے اور اس میں مرزا فاخر مکین سے اصلاح لیتے تھے ؎

چمکے ہے چشم تر میں رُخ اس بے حجاب کا　　پانی میں جیسے عکس پڑے آفتاب کا

خوں ہو دل، کاوش سے اُس کی بہہ گیا　　ٹوٹ کے سینے میں پیکاں رہ گیا
مجھ سے مت منزل کی پوچھو سرگزشت　　ہمرہاں آگے گئے، میں رہ گیا

دین و دنیا سے ہم پھرے، پر آہ　　اپنی خو سے وہ بدگماں نہ پھرا
بارے مجھ سے وہ مہ جبیں نہ ہوا　　میری خواہش پہ آسماں نہ پھرا
ہوگئے پیر انتظار میں ہم　　تو بھی اوباش وہ جواں نہ پھرا

کسی صورت سے اگر صورتِ یار آئے نظر　　چین ہو جی کو مرے، دل کو قرار آئے نظر

فقیرانہ جو کل جا نکلے ہم اُس بُت کے کوچے میں　(ق)　لگایا ہم نے تھا واں اور ہی اک تاک پہ بستر
وہ شاہِ گل رُخاں آ، ہم سے حُسنِ خلق سے بولا　　ہمارے گھر میں کیجیے آکے جائے پاک پہ بستر

کہا ہم نے میاں صاحب فقیروں کو برابر ہے — سر پہ عرش پر بسرام ہو یا خاک پر بستر

دل و دیدہ اپنے جو یار تھے سو وہ درد و غم میں پھنسا گئے
ہمیں جن سے چشم اُمید تھی وہی ہم سے آنکھ چرا گئے

باغباں! نخل محبت میں ثمر ہے کہ نہیں — کوئی اس باغ میں اُلفت کا شجر ہے کہ نہیں
مُو سے باریک بتاتے ہیں کمر اُس گُل کی — نہیں معلوم کہ اس گل کے کمر ہے کہ نہیں
سچ بتا مجھ کو صنم! تجھ کو خدا کی سوگند — وہ تری مہر کی اگلی سی نظر ہے کہ نہیں
بیٹھے کوچے میں مجھے دیکھا تو رُک کر بولے — یاں سے اُٹھ جایئے اب، آپ کا گھر ہے کہ نہیں
ہجر کی شب نہ گھٹی کٹ گئی سب عمر مری — یا الٰہی شبِ ہجراں کی سحر ہے کہ نہیں
بال و پر توڑ کے صیاد لگا یوں کہنے — کوئی بتلاؤ کہ اس مرغ کے پر ہے کہ نہیں

وہ جو اس سمت سے گزرے تو لگے یوں کہنے
میاں اوباش کا اس رہ میں گزر ہے کہ نہیں

فارسی

دیدہ آں قاتلِ بدخو سر راہے ما را — کُشت از نیمچۂ نیم نگاہے ما را

تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۹، مجموعہ نغز ص ۹۴، عمدہ منتخبہ ص ۱۰۱،
سخن شعرا ص ۵۷، گلشن بے خار ص ۳۰، روز روشن ص ۸۱
خمخانۂ جاوید اول ص ۵۰۷، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۰۷

## میاں شاہ جی یا شاہ جیو برق

ان کے حسب و نسب کے بارے میں کوئی تفصیلی بیان نظر سے نہیں گزرا۔ تذکروں

میں صرف یہ لکھا ہے کہ یہ دہلی کے باشندے تھے۔ مزاج ظریفانہ پایا تھا طبیعت میں شوخی تھی۔ پھبتی اور شمشیر زنی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مصحفیؔ دہلی میں پہنچے تو دوسرے ارباب ذوق کی طرح یہ بھی اُن کی خدمت میں عقیدت مندی کے ساتھ آنے جانے لگے۔ طبیعت میں موزونیت تھی۔ آخر شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے مصحفیؔ سے فرمائش کی کہ وہ تخلص کے انتخاب میں مدد دیں انھوں نے "برقؔ" تخلص تجویز کیا جسے شاہ جیو نے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا اس کے بعد جو پہلی غزل لکھی اُس کے چار شعر تذکرہ ہندی میں درج ہیں۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے کم و بیش یہی اشعار اپنی اپنی تالیفات میں درج کیے ہیں۔

یوں لاکھ ہوں دنیا میں تو کچھ کام نہیں ہے — واللہ کہ تجھ بن مجھے آرام نہیں ہے
ہووے دل پژمردہ مرا کیونکہ شگفتہ — ہے باغ میں گُل پہ وہ گُل اندام نہیں ہے
کیا دھوم سے اُٹھی ہے گھٹا ایسی ہوا میں — افسوس کہ ساقی و مے و جام نہیں ہے

اے برقؔ نہ جی اپنا جلا، یاد میں اُس کی
کچھ خوب، تو اس کام کا انجام نہیں ہے

عمدۂ منتخبہ ص ۱۵۲، تذکرہ ہندی ص ۴۵، خمخانۂ جاوید اول ص ۵۵۵،
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۰۸

---

## مرزا مظفر علی خاں بریاںؔ

ولد نواب احمد علی خاں سوزاںؔ شوکت جنگ ابن افتخار الدولہ نواب مرزا علی خاں المتخلص بہ سوزاںؔ۔ اچھے شاعر تھے اور انھوں نے میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی

سے جب وہ اُن کے والد کی رفاقت میں تھے اصلاح لی تھی اس طرح برّیاں نے ذوق شاعری ورثے میں پایا تھا۔ تہذیب واخلاق میں فقید المثال تھے ظاہر بھی درست تھا اور باطن بھی صلاح وپاکیزگی سے آراستہ تھا، حتیٰ کہ جوانی کے پرشور عہد میں بھی کریمانہ اخلاق اور بزرگانہ عادات کا مجسمہ معلوم ہوتے تھے۔ مستقل شاعر نہ تھے البتہ کبھی کبھی طبیعت اس طرف راغب ہو جاتی تھی کلام اچھا خاصہ ہوتا تھا مگر اسے اپنے لیے باعث افتخار خیال نہ کرتے تھے۔ زیادہ تر اپنے حقیقی چچا نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ سے اصلاح لیتے تھے اور وقتاً فوقتاً مصحفیؔ کو بھی کلام دکھاتے رہتے تھے۔ اس بات کا اظہار مصحفیؔ نے اپنے تذکرے ریاض الفصحا میں کیا ہے۔ فارسی واردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے بہم رسیدہ کلام کا انتخاب یہ ہے ؂

زخم جگر سے چاکِ گریباں خجل ہوا
صحرا نوردیوں سے بیاباں خجل ہوا

نکلا نہ اُس کی بزم میں حسرت سے ایک اشک
رکھ چشم پہ ہیں گوشۂ داماں خجل ہوا

کی آبلوں نے میرے بہت پہلے کاوشیں
آخر ہر ایک خارِ مغیلاں خجل ہوا

مت ہم سے پھرا چرخ کہن! دامنِ صحرا
مدّت سے ہمارا ہے وطن دامنِ صحرا

آتے ہیں طرف شہر کی اُس زلف کی بو پہ
رَت چھوڑ کے آہوئے ختن دامنِ صحرا

برچھی نے نہ خنجر نے نہ تلوار نے مارا
عالم کو ترے ابروئے خمدار نے مارا

دم تو بھی نہ نکلا درو دیوار قفس سے
سر اپنا بہت مرغِ گرفتار نے مارا

دل خون ہو کر کھنچ گیا یک لخت مژگاں کی طرف
لے جاؤں اب کیا آستیں میں چشم گریاں کی طرف

شاید کوئی دل سوختہ غم میں کسی کے مر گیا
اک شور سا تھا رات بھر گورِ غریباں کی طرف

برّیاں نہ جب باقی رہی کچھ ضبط کی طاقت مجھے
آخر گیا دستِ جنوں چاکِ گریباں کی طرف

برّیاں کی شبِ فرقت یہ نوحہ گری دیکھی
ہر نوکِ مژہ اُس کی لوہو میں بھری دیکھی

دیکھی ہے کسی مست کی بہکی ہوئی رفتار
جو مضطرب الحال ہے بادِ سحر ایسی

معلوم نہیں باغ میں کس گُل کا ہے ماتم
بلبل تو کبھی آتی نہ تھی نوحہ گر ایسی

بیتابیاں مجھے تا صبح ذرا نیند نہ آئی
دل پہ مرے اک کوفت رہی رات بھر ایسی

---

دیکھا نہیں مجھ سا کوئی ناشاد کسی نے
بھولے سے بھی مجھ کو نہ کیا یاد کسی نے

افسوس رہا یہ کہ ہوئی فصل گُل آخر
ہم کو نہ کیا قید سے آزاد کسی نے

---

## فارسی

بود پوشیدہ بدل حسرتِ دیدار مرا
کرد رسوائے جہاں دیدۂ خونبار مرا

جاں ز تن رفت و ہماں دیدۂ من حیراں ماند
چہ قدر بود بدل، حسرتِ دیدار مرا

آہ حالِ دل خود بکہ گویم بیتاباں
دامِ گیسوئے بُتاں کرد گرفتار مرا

---

چوں بہ رُخ آں کافر بدیں نظرم رفت
خواب و خرد و ہوش ہمہ اندم ز سرم رفت

صد بادیہ طے گشت بمنزل نہ رسیدم
چوں ریگ رواں عمر بہ سیر و سفرم رفت

---

ز بے پروائیش دیگر چہ گویم آہ اے بیتاباں
ندارد مہر در دل، طرفہ بے درد است یارِ من

---

خوش معرکۂ زیبا اول ص ۲۲۰، ریاض الفصحا ص ۴۲، گلشن سخن مبتلا ص ۱۵۴

---

## میر بندہ علی بندہ

ولد میر حاتم علی، لکھنؤ کے باشندے اور وہاں کے صحیح النسب سید تھے۔ دس سال کی عمر میں اپنے بزرگوں کے ساتھ عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوکر وطن واپس آئے تو شاعری کی طرف توجہ کی۔ بڑے ظریف اور خوش طبع تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ

جوان ظریف الطبع و خندہ رو است در ضلع جگت و پھبتی چناں حاضر جواب کہ نظیر او کم بر می آید امیر زادہ ہائے ایں دیار او را بسیار دوست میدارند۔ (ریاض الفصحا ص ۴۹)

تذکرہ ریاض الفصحا کی تالیف (۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ) کے وقت ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی مصحفی نے اپنے بارے میں ان کی راسخ الاعتقادی کا اعتراف بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے جو روش اوّل روز قائم ہوئی تھی وہ آخر وقت تک برقرار رہی منشی خیالی رام خیالی لطیفہ سنجی میں ان کے شاگرد تھے۔

صبح گلشن کے مصنف کا بیان ہے کہ میر بندہ علی نواب معتمد الدولہ وزیر شاہ اودھ کے مصاحبوں میں شامل تھے اور مزاح و تمسخر میں شہرت رکھتے تھے (ص ۶۰)

میر بندہ علی کے بڑے بھائی کا نام میر بندہ حسن تھا جو قمر و ہاشمی تخلص کرتے تھے یہ اپنے چھوٹے بھائی کے انداز معاشرت کے مخالف تھے اس لیے لکھنؤ چھوڑ کر دکن کی طرف چلے گئے تھے وہ کچھ مدت والیان ارکاٹ کے مشاعروں کی زینت رہے آخر میں حیدر آباد گئے جہاں عسرت و تنگ دستی میں انتقال کیا۔ ان کے حالات۔ تذکرہ صبح وطن، ریاض الفصحا اور صبح گلشن میں درج ہیں۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور کلام بہت پختہ ہوتا تھا۔ میر بندہ علی کا کلام یہ ہے ؎

سر پٹکتا میں رہا صبح سے لے شام تلک  
ہاتھ پہنچا نہ تری زلفِ سیہ فام تلک

بھلا بتاؤ تو دل پھر لگے کہاں اپنا  
جہاں نہ ہوئے کوئی یار مہرباں اپنا

بہار آئی ہے گلشن میں دیکھ لے اس کو  
ابھی اُجاڑ نہ بلبل تو آشیاں اپنا

گور کے مُردے جسے دیکھ کے جی جلتے ہیں  
ایک اس کے لیے یہاں سیکڑوں جی جاتے ہیں

---

۱؎ خوش معرکہ زیبا میں ان کا نام حیدر علی غلط درج ہے (ص ۲۲۹)

کچھ نظر آتے ہیں اب مرگ کے آثار ہمیں　　جینے دیتے کا نہیں عشق کا آزار ہمیں

شب ہجر میں جان جاتی نہیں ہے　　اجل مانگتا ہوں سو آتی نہیں ہے

مار ڈالا مجھ کو ناحق آن کے　　تم کہاں سے آئے دشمن جان کے

چھپ گئے تم بھیڑ میں تو کیا ہوا　　میں گلے لگ جاؤں گا پہچان کے

ہجر میں اس لالہ رو کے ہم یہ دکھ پاتے رہے　　خونِ دل پیتے رہے اور لختِ دل کھاتے رہے

ایسی تنہائی ہمیں کیوں تو نے دکھلائی فلک
ہم اکیلے رہ گئے اور مہرباں جاتے رہے

---

ریاض الفصحا ۴۹۔

## حکیم میر نجف علی بیباکؔ

عرب کے قدیم باشندے اور کاظمی سیّد تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے رضوی لکھا ہے ان کے بزرگ چند پشتوں سے سرکار کوٹل میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ بیباکؔ کی ولادت اسی قصبے میں ہوئی، نو سال کی عمر تھی کہ دہلی میں آئے اور یہاں سن تمیز کو پہنچ کر تحصیل فارسی بھی کی اور علم طب بھی سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ طبیعت ذہین پائی تھی اس لیے بہت جلد شہر کے اچھے اطبا میں شمار ہونے لگے، اور شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ کے معالج خصوصی بن گئے۔

یہیں کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف بھی متوجہ ہوتے تھے اور اس میں شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ شاہزادہ مذکور دہلی سے لکھنؤ ہوتے ہوئے بنارس گئے تو یہ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ مدت تک وہیں قیام تھا۔ جہاں دار شاہ کا ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے بنارس کا قیام ترک نہیں کیا اور وہاں کے رؤسا و عمائد کے

ساتھ حسن معاشرت کے ساتھ زندگی گزار کر ۱۲۳۱ھ میں وفات پائی۔
تذکرہ نویسوں نے ان کی شاعری و حکمت دونوں کی تعریف کی ہے
سرور کہتے ہیں "۔ شعر خوب و دلچسپ می گوید۔ در فن طب ہم مہارتے
دارد"۔
مہجور کا بیان ہے کہ "حکیمے حاذقے بود کہ شفا بدستش حکم ید بیضا داشت
د مرض بر بد طولانش مترصد الشفا و رائے ایں ہمہ صفات جمیلہ طبع بہ سخن نیز
داشت و شعر را بحد فصاحت و ادامے گفت"۔
مست کہتے ہیں "میل طبعش باشاہدان خیرمندی بیش تر ، باشیریں صنمان
شکر ریزہ فارسی کمتر"۔

بہم رسیدہ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے

ہم کو بیل و نہار نے مارا | گردش روزگار نے مارا
ایک تو آگے ہی تھے سودائی | اس پہ جوش بہار نے مارا
ایک دن ہو تو کوئی صبر کرے | روز کے انتظار نے مارا
صبر کس طرح کیجئے ۔بیباک | اس دل بے قرار نے مارا

جب ہمارا وہ شوخ یار ہوا | دل وحشی کو تب قرار ہوا
داد خواہوں سے گھر گئے رستے | اُس کا جس کوچے سے گزار ہوا
بیباک کیونکہ پہنچیں گے منزل کو دیکھیے | اپنی کھلی جب آنکھ کہ جب کارواں گیا

کہ خون اک جہاں کا اور ہی جہاں بدلا | یہ رنگ تو نے کیسا اے آسماں بدلا
مجلس میں اس کی ہم نے تہمت کے ڈر کے مارے | سو سو جگہ سے اُٹھ اُٹھ اپنا مکان بدلا

بحر میں اُس بحر خوبی کو نہاتے دیکھ کر | کانپتا ہے رعب سے موجوں میں تھر تھر آفتاب
عالم بالا پہ گر کچھ میکشی ہوتی نہیں | کس لیے ہر دم لیے پھرتا ہے ساغر آفتاب

صیاد یہ ہوس ہے دل داغ دار میں
گُل پوش کر قفس کو مرے نوبہار میں

مَلتے ہیں دل کو مثل حنا پاؤں کے تلے
یہ رسم اک نئی ہے بتوں کے دیار میں

بیباک کوئی کھول کے دیکھے تو اب تلک
آتش بھری ہوئی ہے ہمارے مزار میں

---

ہم غم زدوں کو خواہش صحن چمن کہاں
جو بے وطن ہیں اُن کو قرار وطن کہاں

نسبت خرام ناز سے کچھ کبک کو نہیں
چھل بل کہاں وہ چال کہاں وہ چلن کہاں

---

جو کوئی تجھ پہ مبتلا ہووے
پھر کسی کا نہ آشنا ہووے

---

ہمیں تیری ہی ہر دم جستجو ہے
کہ اپنا مطلب و مقصود تو ہے

اگر منظور ہے تم کو مرا قتل
تو فدوی بھی تمھارے روبرو ہے

گر اب کے اُٹھ گیا ہاتھ اپنا ناصح
گریباں اور دامن سب رفو ہے

(فارسی)

ظاہر چو کرد لطفِ تو فیض عمیم را
شُستیم ما ز صفحۂ دل، حرفِ بیم را

یابد شفائے عاجل اگر بنگرد ز لطف
دست طبیب لطف تو نبض سقیم را

زیں شرم بنگرد عیسیٰ مریم بہ آسماں
احیا چو کرد لعل تو عظم رمیم را

تذکرہ ہندی ص۱۴۱، طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۱۲، ریاض الوفاق (قلمی)
عمدہ منتخبہ (ورق ۱۵)، مجموعہ نغز ص۱۷، مدائح الشعرا (قلمی) عیار الشعرا (قلمی)،
خمخانہ جاوید جلد اوّل ص۶۲۹۔

# شیخ علی بخش بیمار

شیخ غلام علی کے لڑکے اور آنولے کے رہنے والے تھے (صابر نے ساکن سنبھل لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے)۔ اپنے وطن میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شاعری کا شوق اوائل عمر ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ منشی انور حسین تسلیم سہسوانی کے شاگرد بیمار مرحوم کے بیان کے مطابق جو ان کے دیوان قلمی کے دیباچے میں ہے۔ یہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے بھانجے تھے۔ اور مشق سخن کسی قدر ترقی کرنے کے بعد لکھنؤ جا کر ان کے تلامذہ میں شامل ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب محمد سعید خاں جیسے قدر دان ادب ریاست رام پور کے سیاہ و سپید کے مالک اور حکیم سعادت علی خاں[1] ساکن آنولہ وہاں کی فوج کی جنرلی پہ سرفراز ہو چکے تھے۔ نواب صاحب نے بیمار کی خوش گوئی کی شہرت سنی تو حکیم صاحب کی معرفت انھیں طلب کیا۔ یہ رام پور پہنچے اور نواب کے اشارے کے مطابق اخوند احمد خاں غفلت کی شاگردی اختیار کر لی۔ آخر وقت تک عزت و احترام کے ساتھ زندگی گزار کر ۲۳ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ کو ۶۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سید عابد حسین اوج نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے ؎

ز مرگ علی بخش از مدتے | شدہ بر جہاں روزِ روشن سیاہ
رفیقے بپرسید اے اوج سال | بگفتم "علی بخش بیمار آہ" ۱۲۷۱ھ

---

[1] یہ وہی حکیم سعادت علی خاں ہیں جو ایک زمانے میں وزیر اعظم ریاست رام پور تھے اور غدر کے ایام میں آپ جنرل افواج ریاست رام پور کے معزز عہدے پہ ممتاز تھے جنھوں نے اپنی اعلیٰ لیاقت اور شجاعت کی وجہ سے غدر میں رامپور، مرادآباد اور بریلی کے خزانوں کو محفوظ رکھا اور آپ نے ہی نانا راؤ کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دی تھی اور آپ ہی نے فیروز شاہ کو شکست دے کر بھگا دیا تھا چنانچہ اس خیر خواہی کے صلے میں آپ کو از طرف گورنمنٹ انگلشیہ بیس گاؤں مرحمت ہوئے تھے۔ حکیم ولایت علی خاں رئیس آنولہ آپ کے خلف ارشد تھے جن کی طلب پر نواب مرزا خاں داغ دہلوی آنولہ گئے۔ حکیم سعادت علی خاں نے ۲۵ محرم ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔

بیمار فارسی و عربی میں استادانہ استعداد رکھتے تھے فن شعر اور علم عروض و بیان پر عبور حاصل تھا۔ زبان پاکیزہ، طرز بیان شگفتہ اور الفاظ شستہ و رفتہ نظم کرنے کے خوگر تھے۔ طبیعت کی مضمون خیزی اور خیال کی ندرت اس پر سبحان اللہ۔ کلام کو دیکھیے ہلکے ہلکے خوشبودار اور خوش رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جس کی ظاہری صورت دل کش اور باطنی خوبی روح افزا ہے تمام تذکرہ نویس ان کی خوش گوئی کے قائل ہیں۔

باطن کہتے ہیں۔ الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکیزگی احاطۂ بیان سے خارج ہیں۔

نواب علی حسن خاں کہتے ہیں " پرواز طائرہ خیالش بالاتر از گمان است۔ قوت بیان و لطف زبان او اگر تیر و مصحفی میں نسبت دا ینہم تواں گفت کہ کمتر است "۔

نواب نور الحسن خاں کی رائے یہ ہے " صاحب زبان مخروار است و اوستاد قیامت کار "۔

مہری رام کا خیال ہے " سوز و درد کے مضامین بالخصوص نہایت موثر دل کش پیرائے میں نظم کیا کرتے تھے "۔

بیمار نے بقول صابر کئی دیوان مرتب و مکمل کیے تھے لیکن آج ان کے صرف دو نسخوں کا نشان ملتا ہے۔ ایک رام پور کے سرکاری کتب خانے میں ہے اور ایک مختصر سا دیوان محمد علی خاں اثر رامپوری کے پاس تھا جس میں غزلیات کے علاوہ کچھ قصیدے اور چند رباعیاں بھی تھیں۔ اپنے ولی نعمت کی فرمائش سے بوستان خیال کو نظم کرنا شروع کیا تھا مگر اس کے ابھی چند جزو ہوئے تھے کہ موت سد راہ ہوگئی البتہ ان کی زندگی بھر کی کمائی وہ تلامذہ ہیں جن کو محنت و مشقت کے ساتھ تیار کیا تھا اور ان میں منشی انور حسین تسلیم سہوانی منشی صابر حسین صابر برادر تسلیم مذکور۔ سید احمد علی رسا رام پوری اور سید ذکریا شاہ نظام رام پوری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جو بجائے خود اپنے اپنے وقت میں درجۂ استادی پر فائز ہوئے چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

| | |
|---|---|
| تصور بندھ گیا دل پہ سواد زلف جاناں کا | قیامت پر سحر ہونا رہا اب شام ہجراں کا |
| اُٹھا اس واسطے وہ جھڑ کر دامن کہ دیکھوں تو | پہنچا چاک تا دامن ہے کس کس کے گریباں کا |

نہ اصلاحِ جنابِ غفلتؔ اے بیمارؔ اگر ہوتی — تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی مجھ سے ناداں کا

---

نصیب ہم کو ملا سنگِ رہگذر کا سا — کہ ٹھوکروں ہی میں رہا سر کا عمر بھر، کا سا

خدا کے واسطے سودائے زلفِ خانہ بدوش — نہ ڈال عقل پہ پردا بتوں کے در کا سا

وہاں ہے چاند سے مکھڑے پہ زلف کا سایہ — سیاہ داغ یہاں قلب میں قمر کا سا

نسیم جانبِ بلبل سے کہہ یہ غنچوں کو — کہ تنگ دل نہ رکھو بندگانِ زر کا سا

برنگِ غنچہ و گل کیا کہے سُنے بیمارؔ — کہ گنگ کی سی زباں ہے تو گوش کر کا سا

---

نہ بتاتا جو دن جدائی کا — کیا بگڑتا تری خدائی کا

لالہ رکھتا ہے اپنے سینے پر — داغ اُن کے کفِ حنائی کا

تھا وہ بتلا کے دے دیا غوطہ — واہ رے پاسِ آشنائی کا

یار نے دیر تک گلے مل کر — داغ دل پہ دیا جدائی کا

کل تھے رندی کے مجتہد بیمارؔ — آج دعویٰ ہے پارسائی کا

---

دل چاک چاک ابروئے خمدار نے کیا — تجھے کو کربلا تری تلوار نے کیا

---

اس وقت رکھ لیا جو دل اس نے تو کیا ہوا — کافر نہ پھیر دے کہیں ایماں لیا ہوا

کہتا تھا وہ خدا سے جو سُنتے نہ تھے صنم — غفلت میں حرف پاس مرا مدعا ہوا

کہہ دو خیالِ نرگسِ بیمارِ یار سے — دل خانۂ خدا نہ ہوا میکدا ہوا

روئیں ترے ستم سے بھلا کس کے سامنے — اتنا بھی تو کوئی نہیں کہتا، بُرا ہوا

بیمارؔ لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحاں — کم بخت پھر وفا کا تجھے حوصلا ہوا

---

داغ ہر دل میں ترا مثل سویدا ہو گیا — الاماں اے زلفِ عالمگیر، سودا ہو گیا

شک ہمیں اپنے صنم کی بے نیازی میں نہیں — دل کے لینے کا خدا جانے سبب کیا ہو گیا

ہائے ری شوخی کہ آ پہنچا جو وہ گھر تک مرے — پھر گیا دربار سے یہ کہہ کر کہ دھوکا ہو گیا

جس کسی نے دل دیا اُن کو چھپے چوری دیا — ایک میں کم بخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

سنتے ہیں تائب ہوا اس بت کے گھر جانے سے تو — کیا ترا بیمار پتھر کا کلیجا ہو گیا

---

کون پرساں ہے حال بسمل کا — خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
گر پڑا تھک کے قیس اے لیلیٰ — دیکھ پردہ اٹھا کے محمل کا
مردنی پھر گئی مرے منہ پر — رنگ بدلا نہ اُن کی محفل کا
لب جو کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ہے ساحل کا
کام آیا نہ خطّ پیشانی — کیا نمونہ تھا نقشِ باطل کا
جان کنی، عاشقی سے آساں ہے — کام مشکل ہے کاوشِ دل کا
سانس آہستہ لیجیے بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

---

یہ مرا عالم ہے درہم زلفِ جاناں دیکھ کر — جس طرح کوئی اُٹھے خوابِ پریشاں دیکھ کر
ہو گئی سجدوں سے بت خانے کے پیشانی سیاہ — کیا کہیں گے مجھ کو کعبے میں مسلماں دیکھ کر
عشق نے پیدا یہ اپنے عہد میں تاثیر کی — ہو گئیں بیتاب دیوانوں کو پریاں دیکھ کر
رو کے ہنس پڑتا ہوں ظالم ہنس کے رو دیتا ہوں میں — مہربانی پر تری دشمن کو نازاں دیکھ کر
سال بھر بیمار کیجیے ابرِ رحمت کی دعا — کون رو دے گا تمہیں سرگرمِ عصیاں دیکھ کر

---

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز — بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

---

تیرِ قاتل سے سرِ شکوہ کہاں رکھتے ہیں — بے زباں صورتِ سوفار، زباں رکھتے ہیں
چاہِ بابل کے دکھانے کا دلوں کو نقشہ — دلربا ناف میں سیلی سے دھواں رکھتے ہیں

---

کیا یاس کو رو دیں، کہ نہ تھی چشمِ تر ایسی — ہچکی نہ لگی رہتی تھی دو دو پہر ایسی
شاید یہ روش سیکھی ہے پیچھے ترے پھر کر — پہلے تو نہ چلتی تھی نسیمِ سحر ایسی
بس بس دلِ نالاں! وہ خبر بھی نہیں ہوتے — کمبخت! تری آہ تو ہے بے اثر ایسی
ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آ کر — کچھ جذبِ محبت کو لگی ہے نظر ایسی
بیمار کو غفلت ہے بہت، خبر نہیں آج — ہر چند کہ تھی حالتِ غش کل بھی، پر ایسی؟ [1]

---

[1] ہرچند کہ تھی حالتِ غش کل بھی مگر ایسی ([illegible])

بیاں ہو عیبِ طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے
خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے

کمندِ عشق میں جس پر یہاں اسیر کیا
عدم میں کیا وہ خدایا ہوئی خطا مجھ سے

گیا نہ بزمِ بتاں میں نہ آپ میں آیا
کہیں نہ ہوں گے زمانے میں نارسا مجھ سے

کیا سفر کا ارادہ جو بزمِ جاناں سے
کوئی گلے نہ ملا، موت کے سوا مجھ سے

کہیں سُنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمارؔ
کہ اُٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

---

نہ ہر اک چوٹی کا کھُلنا ہے مجھے
غش نہیں مشاطہ، سکتا ہے مجھے

تم نے کیوں زلفِ مسلسل کھول دی
کون کہتا ہے کہ سودا ہے مجھے

کس میں طاقت ہے کہ اُس در سے اُٹھے
ناتوانی کا بھروسا ہے مجھے

اور مطلب آہِ سوزاں سے نہیں
خاک ہونے کی تمنا ہے مجھے

کفر ہے بیمارؔ صحت کی دوا
عشق میں مرنا ہی اچھا ہے مجھے

---

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے
کیا دردِ دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

کعبہ سمجھ لیا ہے مگر کوئے یار کو
بے امتیاز جانتے ہیں پارسا مجھے

اس شوخ کو جفا سے اب ہم نے نگا مرہ
آخر وبالِ جاں ہوئی اپنی وفا مجھے

او بدگماں، کہاں ہیں، کہاں محفلِ نشاط
بزمِ عزا میں بھی نہیں ملتی ہے جا مجھے

بیمارؔ بدگماں نہ رہے وہ تو فائدہ
پیدا ہوئی نہ وہم کی اپنے دوا مجھے

---

کہوں کیا خوبیاں اس بے وفا کی
کہ روٹھا، من گیا، مل کر دغا کی

یہ زلفیں کیا مرا دل چھین لیتیں
ستمگر! تیری آنکھوں نے دغا کی

نہ ٹھہرا غم بھی دل میں کس کی راحت
ہمیشہ خاک اس گھر میں اُڑا کی

نہیں یہاں ابتدائے عشق بھی یاد
خبر کیا پوچھتے ہو انتہا کی

ہمیں اس بزم میں تقدیر لائی
جہاں عنقا ہے صورت آشنا کی

وہ سُن کر حالِ میرا کچھ نہ بولے
مگر ہر بات پہ گردن ہلا کی

نہ رہنے دے گی وحشت بتکدے میں　　اٹھو بیمار جو مرضی خدا کی

---

مرنے کی سوزِ عشق سے کس کو امید ہے　　ہر دم بلند نعرۂ ہل من مزید ہے

قربانیوں میں اپنے کیا یار نے شمار　　عالم کو غم ہوا تو ہوا، ہم کو عید ہے

بیکار صورتِ گل و نرگس ہے گوش و چشم　　کیا لذتِ شنید ہے کیا لطفِ دید ہے

یاس و امید ان سے ہے دن رات صبح و شام　　انکار ہے، جواب ہے، وعدہ وعید ہے

دیتے ہیں وہ شکایتِ دوری کا یہ جواب　　بیمار پاسِ عشق سے شکوہ بعید ہے

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی　　دنیا میں تو مانگی نہ ملی موت خدا سے

---

حالِ دلِ بیمار نہیں ضبط کے قابل　　لیکن وہ زبان مجھ کو ہلانے نہیں دیتے

یا تو دنیا سے الٰہی دلِ شیدا اٹھ جائے　　وصلِ معشوق کی یا دل سے تمنا اٹھ جائے

---

موت سے بھاگنے لگے بیمار　　کیا تم اس کو شکستہ پا سمجھے

---

صنعت مرادآبادی نے بیمار کی ایک غزل کا خمسہ کیا ہے۔ وہ بھی اس سلسلے میں درج کر دیا جائے تو بہتر ہے ؎

کارِ نشتر، تیرِ مژگاں سے نکالا چاہیے　　خونِ ناتوانوں کا شریاں سے نکالا چاہیے

عکس کو اپنے خدارا رکھ نہ آئینے میں قید　　جلد اس یوسف کو زنداں سے نکالا چاہیے

واسطے زنار کے اے وحشتِ عشقِ بتاں　　تار داماں و گریباں سے نکالا چاہیے

جس جگہ رک جائے پانی بیٹھ جاتا ہے وہ گھر　　اشک اے دل چشمِ حیراں سے نکالا چاہیے

ساربان سے نجد میں آہستہ، لیلیٰ نے کہا　　نالہ ٹھہرا کر مرا یاں سے نکالا چاہیے

بار آئی تھی مزاجِ یار میں رہ ہے وہاں　　اب تعارف اس کے درباں سے نکالا چاہیے

وہ یہ کہتے ہیں لگا کر خارِ سرمہ زیرِ چشم　　مشک یوں نافِ غزالاں سے نکالا چاہیے

گر بیاضِ یار میں بیمار کرنا ہے رقم
شعر اچھے حسن کے دیواں سے نکالا چاہیے

---

(رباعی)

بیمار سے دنیا میں نہ ہوں گے گمراہ زر ہاتھ جو آیا تو لیا مول گناہ
دنیا بھی خراب، عاقبت بھی برباد لاحول ولا قوۃ الا باللہ

سوانح داغ از شہرت ۔ ص ۱۸۱ انتخاب یادگار ص ۱۸
گلستان سخن ص ۱۱۵ ۔ بزم سخن ص ۲۵ ۔ خمخانۂ جاوید اول ص ۶۸۴

---

# جسونت سنگھ پروانہ

کاکا جی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد راجہ بینی بہادر متوفی ۱۱۹۰ھ نواب شجاع الدولہ مرحوم کے عہد میں رکن رکین سلطنت سمجھے جاتے تھے۔ اور اچھی جاہ وحشمت کے مالک تھے جو آگے چل کر پروانہ کو وراثت میں ملی۔ یہ بھی اپنے بلند اقبال والد بزرگوار کی طرح خوش خلقی، نیک کرداری اور نیک خصلتی کی بنا پر مقبول خاص وعام رہے اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ مولانا حسرت موہانی نقل کرتے ہیں:

"اس زمانے میں مولوی غلام مصطفیٰ تسلیم موہانی ایک بزرگ تھے۔ پروانہ نے جب ان کا نام سنا تو لکھنؤ سے مسافت کی تکلیف برداشت کر کے وہاں پہنچے اور مولوی صاحب موصوف کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے جانے کے لیے بے حد کوشش کی لیکن تسلیم کی عزلت گزینی وقناعت پسند طبیعت نے ترک وطن گوارا نہ کیا اور پروانہ کچھ روز قیام کرنے کے بعد واپس آگئے۔"

پروانہ آغاز شباب میں حسن وجمال میں بے مثال تھے اور ایک زمانہ اُن کے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت کا بھی دیوانہ تھا۔ استعداد علمی بہت معقول تھی پھر بھی تحصیل علم کا شوق آخر وقت تک ان کے خمیر میں شامل رہا۔

یہ ابتدا میں فارسی لکھتے تھے اور اس میں لالہ سرب سکھ دیوانہ سے اصلاح لیتے تھے۔

مصحفی کے تذکرۂ فارسی "عقد ثریا" میں ان کا فارسی کلام موجود ہے جو پروانہ نے انھیں لکھنؤ سے دہلی بھیجا تھا۔ تعجب ہے کہ بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرے میں جو ۱۲۱۹ھ میں لکھا گیا ان کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

جب ۱۱۹۸ھ میں مصحفی دہلی سے لکھنؤ آئے تو اُس عقیدت وارادت کی بنا پر جو مصحفی کے ساتھ تھی پروانہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے تپاک وگرم جوشی کے ساتھ پیش آئے اور اصلاح سخن کا تمام وکمال فرض انھیں کے سپرد کر دیا۔ مصحفی کہتے ہیں:

"خود را شب و روز در گفتن شعر بندی مصروف داشت تا الی الیوم کہ عرصۂ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا و پختہ گردیدہ در گفتن قصیدہ و غزل طرز مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صید معانیہائے تازہ ہمت می گمارد پیش از آمدن ایں فقیر کہ ہنوز آغاز شوق او بود اعتقاد بہم رسانیدہ مثل میر تقی و میر حسن و میاں بقاء اللہ وغیرہ می داشت اکنوں از تہہ دل بفقیر رجوع کلی دارد و درستی اشعار درستش موقوف بر مشورۂ ہیچمدان بہ اعتقاد او افتادہ"۔

میر تقی و میر حسن کے ساتھ پروانہ کی اسی عقیدت کو تذکرہ نگاروں نے ان کی شاگردی پر محمول کیا ہے۔ پروانہ نے ۱۲۲۸ھ میں وفات پائی۔ ناسخ نے قطعۂ تاریخ لکھا ؎

| | |
|---|---|
| از مُردنِ پروانۂ جاں سوختہ | شمع بزم اہل سخن ہائے بمرد |
| تاریخ رقم نمودم ناسخ | پروانہ بمرد شمع ہم وائے بمرد |

۱۲۲۸ھ

۱۲۲۸ھ کی مطابقت ۱۸۱۲ء عیسوی سے ہوتی ہے لیکن اس تحقیق کی داد دیجیے کہ خمخانۂ جاوید کے مرتب نے لکھا ہے "۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔" حالاں کہ یہ سن ۱۲۶۷ھ کے مطابق ہوتا ہے اس وقت تو پروانہ کی وفات کا قطعہ تاریخ لکھنے والے ناسخ کو انتقال کیے ہوئے تیرہ (۱۳) برس اور ان کے استاد مصحفی کی وفات کو ۲۷ برس ہو چکے تھے۔ پروانہ کے فارسی دیوان کا

علم نہیں کہ کہیں موجود ہے یا نہیں البتہ ان کا ایک کلیات اُردو کا مخطوطہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے۔ اس میں ٦٥ہ صفحات اور ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں۔ حواشی میں بھی کلام کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر کسی نے اصلاح بھی کر رکھی ہے۔ اصلاح کرنے والے کا نام تحقیق نہیں کیا جا سکا۔ اس کلیات میں ردیف وار غزلوں کے ساتھ متعدد قصائد اور آخر میں ایک ہجویہ مثنوی ہے۔ قصائد میں ایک قصیدہ عماد الملک کی تعریف میں ہے۔ قطعات تاریخ صرف تین ہیں ان میں سے ایک جرأت کے انتقال کا ہے دوسرا ان کے والد بینی بہادر کے انتقال کا۔ تیسرے قطعے کا کاغذ نام کی جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ پروانہ کو شاگرد بنانے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ ان کے صرف ایک شاگرد کا نام ملتا ہے یعنی ٹیکارام فدا دہلوی مقیم لکھنؤ جو کچھ مدت ضلع مظفر نگر میں بھی رہے تھے۔

اب پروانہ کے منتخب کلام سے لطف اُٹھائیے۔

کیا کیجیے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم تو
ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا

ہو روتا ہے گو جوں خامۂ شنجرف نام اپنا
ولیکن سرخ رو ہے عشق کے دفتر میں نام اپنا

ڈھونڈ لاوے جو کوئی لاکھ اثر کا تعویذ
ہو محافظ نہ قضا اور قدر کا تعویذ

روئے کتابی سے ہے مخزن اسرارِ علم
رکھّے ہے کاکل سے وہ شملہ بمقدارِ علم

زاہد رہے ہے کعبے میں راہب کنشت میں
حیراں ہوں میں کہ رکھا ہے کیا سنگ و خشت میں

ہم کو بتوں کے سایۂ دیوار سے ہے کام
لے قصر زرنگار تو زاہد بہشت میں

کی جا کے ہم نے دید فضا دشت قیس کی
وہ لطف ہے کہ باغ میں نے سیر کشت میں

مت مل کہ پیر زال نپٹ ہے عروسِ دہر
پروانہ لطف کیا ہے بھلا اس بہشت میں

جو کثرت میں وحدت سدا دیکھتے ہیں
بتوں میں وہ نورِ خدا دیکھتے ہیں

جدا ہے جو پروانہ اُس شمع رو سے
نہایت دل اُس کا بجھا دیکھتے ہیں

میں ہوں وہ محجوب سے مجبور کس کا ہو رہوں      وہ پری ہے تو وہ رشک حور کس کا ہو رہوں

آئینہ ساں ہے صاحب جوہر کو زنگ غم      اس دور میں کہ عیب و ہنر دونوں ایک ہیں

چشم بد دور پری ہے کہ کوئی حور ہے تو      سر سے پا تک جو تجھے دیکھے اک نور ہے تو
لاکھ تدبیر کروں ہاتھ کوئی آتا ہے      اپنے نزدیک تو اے جان بہت دور ہے تو
بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانندِ حباب      بس یہ اک دم کی ہوا کھانے پہ مسرور ہے تو
تن بدن میں جو لگی آگ تو اے پروانہ      کیا کرے اپنے جلا دینے میں مجبور ہے تو

ضعف ہے غش ہے ناتوانی ہے      بن ترے موت زندگانی ہے
کون مدفون ہے چمن میں صبا      جس کی تربت پہ گل فشانی ہے
پوچھتے اب ہو مرغِ دل کا حال      کب سے وہ جنت آشیانی ہے
آہ پروانہ شمع ہے لیکن      زور اس میں شرر فشانی ہے

اے دل تو نہ ڈر حلقۂ گیسو سے کسی کے      یہ سانپ ہیں کیلے ہوئے جادو سے کسی کے
دل یار سے اور درد مرے دل سے کہے ہے      جانے کا نہیں اب تو ہیں پہلو سے کسی کے

تڑپتی جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب      ترے کوچے کو کربلا جانتا ہے
کوچۂ گیسو میں دل کو ڈھونڈ لے      کیا ہوا اگر راہ کا کچھ پھیر ہے

جس نے دیکھا اُسے کیا سجدہ      غرض اُس بت نے بھی خدائی کی
دیکھ تو ہم سے راست بازوں سے      تو نے آخر یہ کج ادائی کی
ہم سے رکھ کر غبار خاطر میں      جا کر اغیار سے صفائی کی
اے دل آزار تو ہی کر انصاف      ہے یہی طرز دلربائی کی
عہد کیا کیا تجھے اور قول و قرار      آہ تس پہ بھی بے وفائی کی

دیکھتے ہی اُس کو چہرے پہ بحالی آگئی      زعفرانی رنگ جو تھا اس پہ لالی آگئی

کہتی ہے عندلیب چمن میں پکار کے      اپنے بھی دن پھریں گے جو پھریں دن بہار کے

نسیم آہ نے شاید کسی کی تاثیر
شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی دلداری کرے
بیوفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے

اُس طفل سبق خواں کے ہے نت کینہ بہ سینہ
پہنچا ہے یہ علم اُس کو مگر سینہ بہ سینہ

ظاہر ہے مرے زخم نو و داغ کہن سے
پوشیدہ رہے کب غم دیرینہ بہ سینہ

تاروں سے فلک کے ہو حساب اس کا محاسب
داغوں کا مرے گر کرے تخمینہ بہ سینہ

ناصر کا بیان ہے کہ :

"یہ غزل مرزا جعفر کے مشاعرے کی تھی جس میں ناسخ اور مرزا مغل سبقت بھی موجود تھے۔ ناسخ نے تیسرا شعر سُن کر مرزا مغل سے کہا کہ مرزا احسن صاحب سے میری طرف سے پوچھو کہ تخمینہ بہ سینہ درست ہے؟ مرزا مغل نے استفسار کیا۔ مرزا محسن نے کہا درست ہے یہ سن کے ناسخ اُن سے کہنے لگے "آپ درست فرماتے ہیں"۔ مرزا صاحب نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کاکاجی بے علم ہیں۔ ناسخ نے کہا "بس پوچھنے سے یہی مطلب تھا" ——— ممکن ہے اعتراض صحیح ہو لیکن ہمارے خیال میں یہاں "بہ سینہ" تخمینہ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق داغوں کے ساتھ۔

(فارسی)

ازیں نظارہ بازی زود ترہ شیدا کُنی خود را
تو کارے میکنی اے دل کہ خود رسوا کُنی خود را

بہجر تو اے شمع پروانہ تا کے
کشد از جگر نالۂ آتشیں را

بگو حاجب بآں شمعِ دل افروز
کہ امشب عاشقاں را حکم بار است

غریبے بے کسے پروانہ نامے
برونِ در ز دیرہ اُمید دار ست

بے لعل لبت، غنچۂ دل ناتواں کرد
جاں را ز پیام تو شکیبانہ تواں کرد

وصل تو ز ہجر تیست بتر بہر عدم
ایں طرفہ کہ جز وصل تمنا نتواں کرد

عقد ثریا ص ۹۵، تذکرہ ہندی گویاں ص ۴۶، مجموعہ نغز ص ۱۰۴، عمدہ منتخبہ ص ۱۵۴
گلشن بیخار ص ۳۲، گلشن ہمیشہ بہار ص ۸۳، خوش معرکہ زیبا اول۔
خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۳، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۱۴۷۔

---

## شرف الدین علی خاں پیامؔ لکھنوی

پیامؔ کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اردو شعرا کے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں صرف سعادت خاں ناصرؔ نے شاگردان مصحفیؔ میں ذکر کیا ہے اور ان کا یہ شعر درج کیا ہے یہ ایک ہی شعر اس بات کا ثبوت ہے کہ خوش گو شاعر تھے ؎

ہائے اس دیوانے دل نے کام ہی ایسا کیا
آپ تو بدنام تھا اور مجھ کو بھی رسوا کیا

خوش معرکہ زیبا جلد اول ص ۱۳۴

---

## میر بندہ علی تائبؔ

میر محمدی کے لڑکے تھے۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا مگر میر محمدی نے لکھنؤ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ تائبؔ یہیں پیدا ہوئے اور اپنے والدین کے زیر سایہ نشو و نما پائی ابھی یہ مکتب نشین تھے کہ شوق شعر گوئی پیدا ہوا اُس وقت لکھنؤ میں سب سے بڑے استاد مصحفیؔ تھے، اس لیے یہ شاگردی کے لیے ان کی خدمت میں پہنچے لیکن مصحفیؔ مرحوم نے ہدایت

کی کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو جو شعر و سخن کے لیے ضروری چیز ہے۔ تائب نے اس نصیحت کو پلّے باندھا۔ پہلے تعلیم مکمل کی اور پھر مصحفی کی خدمت میں آکر شرفِ تلمذ سے بہرہ ور ہوئے۔ صرف یہی چار شعر مصحفی نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں کہیں اور جگہ ان کا تذکرہ نہیں ملتا ہے

اے دل خیال جب سے ترے رنگ و بو میں ہے ۔۔۔ دل جوں نسیمِ صبح تری جستجو میں ہے
اتنا تو کر کہ اشک رواں رُخ پہ ہو کوئی ۔۔۔ اے ضبطِ گریہ کچھ سے خلل آبرو میں ہے
رکھتے ہیں گرچہ مُہرِ خموشی دہن پہ ہم ۔۔۔ لیکن زبانِ حال تری گفتگو میں ہے

تائب نہ زخمِ سینہ سے میرے تو ہاتھ اُٹھا
بھائی ابھی تو کام بہت سارفو میں ہے

ریاض الفصحا صہ ٦٢

---

## رائے ٹیکارام تسلّیؔ

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں بہادر کے نائب بخشی گوپال رائے تھے جو شاعر بھی تھے اور حزیںؔ تخلص کرتے تھے، ان کے چار لڑکے تھے۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام بھولا ناتھ تھا یہ شجاع الدولہ کے عہد میں کچہری بخشی گری کے دیوان رہے۔ دوسرے اور تیسرے خوشحال رائے اور چھوٹے لال تھے۔ سب سے چھوٹے لڑکے رائے ٹیکارام تھے جو تسلّیؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے کانستوں کے ذی عزّت خاندان سے تھا۔

حکیم قاسمؔ نے تسلّیؔ کو "اصلش از اٹاوہ کہا ہے"۔ اور سرورؔ نے اٹاوہ از مضافات پورب تحریر کیا ہے۔ لیکن یہ درحقیقت کرہل متصل اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔

تسلی کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی یہیں نشوونما پاکر اور تعلیم و تربیت سے فارغ ہوکر موزونیٔ طبع کے جوہر دکھانے لگے ۔ حتیٰ کہ چھبیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے قادر الکلام شعرا میں شمار ہونے لگے ۔ اساتذہ کے دواوین و مثنویات جمع کرنے کا بہت شوق رکھتے تھے اور جب جگہ کسی دیوان کا علم ہوتا تھا اس کے نقل کرانے میں سعی کرتے تھے ۔ کتابیں جمع کرنے کے شوق کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے ۔ کہ جب مصحفی دہلی سے لکھنؤ پہنچے ۔ تسلی مکتب نشین تھے ۔ اس حالت میں بھی مصحفی کا اُردو دیوان اُن سے منگوایا اور بہت تھوڑی مدت میں خود نقل کرکے واپس کر دیا ۔ اس کے بعد ایک دیوان فارسی اور دو دیوان اُردو مصحفی سے نقل کرا کے بطور تبرک اپنے پاس رکھے ۔ اس طرح ہزاروں روپیہ خرچ کرکے بڑا اچھا کتب خانہ جمع کرلیا تھا ۔

فارسی میں مرزا فاخر مکین سے اور اُردو میں شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے ۔ تسلی کی خوش گوئی کے سب تذکرہ نویس معترف ہیں ۔

سرور کہتے ہیں " اشعار خوب دارد و خالی از کیفیت نیست ۔ "

قائم کی رائے ہے " مرد خوش فکر صاحب شعور معلوم می شود " ۔

تسلی خوش خو بھی تھے اور خوبرو بھی ۔ مزاج میں ہمدردی و موانست کا مادہ تھا دوستوں کے ساتھ سلوک سے پیش آتے تھے اور اہل احتیاج کی امداد سے جی نہ چراتے تھے بقول شیفتہ " بروش پسندیدہ و خلق گزیدہ زندگانی میکرد " مصحفی نے تو اپنے اس شاگرد کی تعریف میں یہ الفاظ لکھ کر کہ

" باہمہ خوبیہا کہ دارد اخلاقِ ایشاں بر زبان کہ مہ جاری است ۔ چنانچہ فقیر ہم دراں جملہ مرہون حسن سلوک ایں بلند اقبال است "

ان کے حق میں دعا کی ہے

" حق تعالیٰ ہمیشہ بر مسندِ ایالت ذاتِ شریفش را متمکن داشتہ در سایۂ حفظ

خود نگاہ دارد"۔

بقول شیام سندر لال برقؔ سیتا پوری ۱۸۶۲ء میں وفات پائی۔

تسلیؔ کے ایک لڑکے امراؤ سنگھ تھے یہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام مراد علی تھا شاعر بھی تھے اور ناؔمی تخلص کرتے تھے۔ لامع الافہام درج گوہر اور مثنوی گل و بلبل وغیرہ کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ تسلیؔ صرف شاعر نہ تھے ناثر بھی تھے اُن کی نثر کا نمونہ یہ ہے:

نقل ہے کہ نادر شاہ جب شاہجہان آباد میں داخل ہوا تو اس کی فوج میں سے کتنے مغل شہر کی سیر کو آئے ایک اُن میں بھوکا تھا اتفاقاً کسی صابن گر کی دوکان میں صابن کے بڑے بڑے ڈلے نظر آئے کہنے لگا۔

"ازیں چکدیہائے پنیر یکے نزد من بدہ کہ بسیار گرسنہ ام"۔

صابن گر بولا "آغا صاحب یہ صابن ہے پنیر نہیں"۔ تب جھنجھلا کر مغل نے کہا "قرم ساق غلط می گوئی! بیار!!"

جب اُس نے دیکھا کہ یہ عقل کا اندھا مانے گا نہیں ایک ڈلا صابن کا حوالے کیا۔ اُس نے ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔ سارے ہونٹ پھٹ گئے۔ جیب ٹرک گئی تب گھبرا کے کہنے لگا۔

اے وائے وائے۔ دہنم سوختہ شد

سب بازاری ہنسنے لگے اور ان سے کہا "مرزا صاحب اس پنیر کا مزا تو خوب چکھا" بڑا شرمندہ ہو کر گردن نیچی کیے چلا گیا۔

یہ نثر ۱۲۲۲ھ سے پہلے کی ہے جو قریب قریب ۱۸۰۷ء کے برابر ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فورٹ ولیم کالج میں اردو ترجموں کا زور تھا ہماری آج کی اردو اور اس اردو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا

ہے کہ شمالی ہند میں اُردو نثر نگاری کی ابتدا اس سے کم از کم ایک صدی پیشتر ہو چکی ہوگی مگر افسوس یہ ہے کہ اُس وقت کی کوئی تصنیف ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی۔

اب تسلیؔ کے کلام کی سیر کیجیے ؎

دیکھے سماں جو اس مژۂ اشکبار کا — ہو جائے شق جگہ رگِ ابرِ بہار کا
فہمیدہ والے کرتے ہیں دولت پہ کب گھمنڈ — کیا اعتماد زندگیٔ مستعار کا
آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں — کیا پوچھتے ہو حال شبِ انتظار کا

---

تجھ سا جو بے وفا ہوا ہوگا — اُس کا عاشق نہ کوئی جیا ہوگا
کیوں تسلیؔ سے اب نہیں ملتے — غیر نے کچھ سکھا دیا ہوگا

---

نہ سُنی تونے ایک بات کبھو — ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا
تم خفا ہی رہے تسلیؔ سے — اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

---

کیا ترک ملنا مرا کس سبب سے — وہ بات آکے مجھ سے تو اک بار کہہ جا
خفا کیوں ہوا بیوفا کہنے سے تو — جفاکار تو ہم کو سو بار کہہ جا

---

کیا منہ جو کوئی آوے ترے تیر کے منہ پہ — یہ ہم تھے کہ منہ رکھ دیا شمشیر کے منہ اوپر
گر دل میں خفا ہے تو پہ اس بات کو ناداں — کہہ بیٹھو مت عاشق دلگیر کے منہ پر
جب سے تری تصویر لکھی کلکِ قضا نے — یہ حسن نہ دیکھا کسی تصویر کے منہ پر
جانے دے تسلیؔ تو نہ کر فکر سخن کا — پھبتا ہے سخن مصحفیؔ و میرؔ کے منہ پہ

---

جو چاہے سلطنت اُسے ظلِّ ہما ملے — مجھ کو یہی ہوس ہے کہ وہ مجھ سے آ ملے

---

گذر چمن میں اگر وقت صبح تو نہ کرے — نسیم پاس نہ جا گل کے اُس کو بُو نہ کرے
کوئی بشر نہ زمانے میں ہووے گا ایسا — کہ جس کے دل میں جگہ تیری آرزو نہ کرے

---

تو نہ میری ہی جان ہے کافر — تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگتا ہے مرے تصوّر سے — کس قدر بدگمان ہے کافر

دن بچھڑے بچھڑ گئی تسلّی کے
ان دنوں مہربان ہے کافر

اب بھی اس نیم جان میں کچھ ہے؟
فائدہ امتحاں میں کچھ ہے

کیوں ستاتا ہے دیکھ تو پیارے
اس دل ناتواں میں کچھ ہے

دکھاتا ہے مہ، حسن کا اپنے جلوہ
اگر تم بھی آؤ لب بام کیا ہو

ترے لب سے غنچہ کرے ہمسری کیا
ترے آگے گُل، نازک اندام کیا ہو

تسلّی عجب بے وفا کو دیا دل
اس آغاز کا دیکھیں انجام کیا ہو

صبا منہ کو رجب کچھ لے چلے ہے تیری زلفوں کا
چمن سے بوئے سنبل ہو کے سودائی نکلتی ہے

خدا سے ڈر، برابر کر نہ اوروں کے تسلّی کو
کہ تیرے عاشقوں میں اس میں یکتائی نکلتی ہے

تجھ پہ آفت یہ نئی اے دلِ زار آئی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

دیکھیے حال تسلّی کا ہو کیا اب کے سال
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

تذکرہ ہندی ص۵۵، طبقات سخن قلمی، عمدۂ منتخبہ ص۱۷۱،
مجموعۂ نغز ص۱۴۰، عیار الشعرا (قلمی)، گلشن بہار ص۱۴۱،
خوش معرکۂ زیبا اول ص۳۹۵، یادگار ضیغم ص۳۴۵، خمخانۂ جاوید دوم ص۶۵
مرقع شعرا، طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۶۳

---

## بھیرو دی داس تمنّا

کائستھ برادری کے ایک فرد تھے۔ اصلی وطن پرگنہ جھوہ ضلع ہمیر پور تھا، جہاں ان کے والد قانون گوئی کرتے تھے۔ مگر سعادت علی خان کے دور میں لکھنؤ آگئے تھے تمنّا کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔ اور اُنیس سال کی عمر سے شعروسخن کی طرف رجحان

پیدا ہوا۔ اس وقت شیخ محمد عیسیٰ حیات تھے، اور شہر کے متعدد نومشق جن میں ناسخ بھی شامل ہیں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ تمنّا نے بھی انھیں کی طرف رجوع کیا۔ طبیعت میں جودت تھی۔ تنہا نے ترقی کرنے کی صلاحیت دیکھ کر ان کو کچھ دن کے بعد اپنے استاد شیخ مصحفی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلیقۂ مناسب کی بدولت بہت تھوڑی مدّت میں کلام صحیح معیار پہ آگیا۔ سال وفات معلوم نہیں

کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

پہلو میں سرنگوں وہ مرے بے نقاب تھا / شب اختلاط میں اُسے اتنا حجاب تھا
زلفیں سنوارتا تھا وہ شاید کہ رات کو / تارِ حیات پر جو مرے پیچ و تاب تھا

---

سرگرم شبِ ہجر ہے بے داد گری پر / اور آہ نے باندھی ہے کمر بے اثری پر
پروانے کو کیا سوزِ دل اس کے کی خبر ہے / گزرے ہے جو کچھ حال چراغ سحری پر

---

یا تو گلگشتِ چمن سے مجھے کر شاد کہیں / یا چھری پھیر گلے پر مرے صیّاد کہیں
رکھ قفس دُور چمن سے مرا صیّاد کہیں / کان میں گل کے نہ پہنچے مری فریاد کہیں
سچ تو یہ ہے کہ تمنّا کو جہاں میں ہرگز / مصحفی سا نہ ملے گا کوئی استاد کہیں

---

سمجھائیں کس کو آہ غمِ ہجر یار میں / اپنا تو دل ہی اپنے نہیں اختیار میں
میں ہوں وہ نخل سوختۂ باغِ روزگار / کاٹے ہے باغباں جسے فصلِ بہار میں
جو محنت سفر نہ تمنّا ہوا حصول / ملکِ عدم سے آئے عبث اس دیار میں
بحرِ جہاں کی سیر میں کس طرح دیکھتا / یاں دورِ زندگی تہہ دورِ حباب تھا
ہووے گا اور اس سے مرا داغِ دل زیاد / مدفوں نہ کیجیو تو مجھے لالہ زار میں

---

ریاض الفصحا، ص ۶۲، خوش معرکہ زیبا اول ص ۴۳، ۴۴

# شیخ محمد عیسیٰ تنہا دہلوی

بزرگوں کا وطن دہلی تھا مگر تنہا بقول مصحفی لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں علوم ضروری سے بہرہ ور ہوئے طبیعت نہایت باصلاحیت پائی تھی اس لیے عنفوان شباب ہی سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور جو کچھ کہا شیخ مصحفی سے اس میں اصلاح لی سلام بھی لکھتے تھے اور مرثیہ خوانی بھی کرتے تھے۔

تنہا خوش خلق، سلیم الطبع اور رنگین مزاج ہونے کے علاوہ قدامت پرست بھی تھے لکھنؤ میں رہتے ہوئے زبان قدیم کے پابند رہے اور حتی الامکان لکھنؤ کے رنگِ شاعری سے دامن بچایا۔

اکثر تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ ناسخ نے انھیں کے دامن تربیت میں اول اول پرورش پائی تھی اور اُن کے گلشن سخن میں ابتدائی بہار انھیں کی نسیم توجہ سے آئی تھی۔ ناصر لکھتے ہیں:

"کلام اس کا راسخ، بقول میاں صاحب کے استاد ناسخ"

مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں

"تنہا وہ شخص ہیں جن پر بعض لوگ استادیٔ ناسخ کا گمان کرتے ہیں اور اُن کے دیوان کو دیکھتے ہوئے یہ امر قیاس سے بعید نہیں معلوم ہوتا۔ کیا عجب کہ ناسخ و آتش دونوں مصحفی کے شاگرد ہوئے ہوں مصحفی نے شاگردوں کی کثرت کی بنا پر ناسخ کے کلام کی درستی تنہا کے سپرد کر دی ہو۔ ناسخ کو یہ ناگوار گزرا ہو اور چند دن کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر علیحدہ ہو گئے ہوں، راقم الحروف کی یہ تحریر بھی محض ظنی نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی سند کی بنا پر ہے جس کا ذکر ناسخ کے بیان میں بہ ضمن تذکرۃ الشعرا آئے گا"

دراصل وہ سند جس کا ذکر مولانا حسرت کی تحریر میں ہے اور جس سے ناسخ کا شاگرد تنہا ہونا ثابت ہے۔ مصحفی کے دیوان ششم کا دیباچہ ہے جس میں نہ صرف ناسخ کے شاگرد تنہا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بلکہ آتش کی طرح عیشی کے تلمذ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ یہ دیباچہ "مصحفی حیات و کلام" میں درج ہو چکا ہے۔

۱۲۲۲ھ میں تنہا لکھنؤ سے دہلی جا رہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔ تنہا اور ناسخ کے دوستانہ تعلقات آخر وقت تک قائم رہے جس کا ثبوت ان کا قطعہ تاریخ وفات ہے ؎

مونسِ جانِ حزیں دشتِ بلاخیز میں آہ — اُٹھ گیا سوئے عدم چھوڑ کے ہم کو تنہا
کلکِ ناسخ نے لکھا مصرعِ تاریخِ وفات — آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا

۱۲۲۲ھ

اس قطعہ کے مصرعِ اول میں "مونسِ جانِ حزیں" کا ٹکڑا خاص طور پر قابل توجہ ہے جس سے اُس تاثر اور خصوصیت کا پتا چلتا ہے جو ناسخ کو تنہا کے ساتھ تھی۔ تنہا کا یہ قطعہ تاریخ نہیں معلوم کیوں دیوان ناسخ سے خارج کر دیا گیا ہے مگر اسے ناصر نے درج کیا ہے جو ناسخ کے معاصر اور اُن کے دوست تھے۔

مصحفی کو بھی اپنے اس باکمال شاگرد کی وفات کا بہت صدمہ ہوا جس کا ثبوت ان کے اس قطعہ تاریخ سے ملتا ہے ؎

صدرِ مجلس، محمد عیسےٰ — کہ خیالش ز اوجِ کیواں شد
چوں ازیں خاکدانِ جسمانی — بر فلک رفت و دامن افشاں شد
بلبلِ خامہ در ریاضِ سخن — کہ از و صفحہ گلستاں شد
از سرِ آہ ایں نوا بکشید — گنجِ معنی بخاک پنہاں شد

آخری بیت کے مصرعے کے اعداد ۱۲۷۸ میں سے نوا کے ۵۷ گھٹا کر آہ کے الف

کا ایک جمع کرنے سے ۱۲۲۲ھ بر آمد ہوتا ہے۔

تنہاؔ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اُن کے مزاج میں خود داری اس حد تک تھی کہ بے انتہا ضرورت کے وقت بھی اپنے دوستوں خصوصاً اُن دوستوں کے سامنے جن کے ساتھ وہ کبھی سلوک کر چکے ہوں، اپنی ضرورت مندی کا اظہار بے غیرتی خیال کرتے تھے اس بات کا ثبوت ناصر کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"جب محمد عیسیٰ مرض موت میں مبتلا ہوا۔ زوجہ نے تنہا کی کہا۔ تم میں اور ناسخؔ میں نہایت محبت ہے اگر اپنی تنگ دستی اُس سے کہلا بھیجو، کچھ ننگ و عار نہیں۔ تنہاؔ نے اُس جفت باوفا سے کہا کہ "تمام عمر وہ اپنا ہاتھ دیکھا کیے ہیں اب ان کا دست نگر ہونا غیرت سے بعید ہے۔"

اس واقعہ سے نہ صرف تنہاؔ کی غیرت مندی کا ثبوت ملتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ناسخؔ کے استاد ہی نہیں تھے بلکہ اکثر و بیشتر مالی معاونت بھی کرتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں تنہاؔ کی شاگردی سے انکار بلکہ اپنے استاد کے استاد مصحفیؔ پہ زبان طعن دراز کرنے کو جیساکہ نوازش کے حوالے سے ناصر نے لکھا ہے۔ ناسخؔ کی احسان فراموشی اور محسن کشی کے سوا اور کس چیز کا نام دیا جا سکتا ہے۔

تصنیفات کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس سلسلے میں لالہ سری رام نے جو کچھ ظاہر کیا ہے اُسے من و عن یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے ان کے رنگ شاعری پر مفید روشنی پڑتی ہے۔

"صاحب دیوان گزرے ہیں اس میں اکثر مقامات پہ قدیم زبان کا تتبع کیا ہے اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے بہت استعمال کیے ہیں اگرچہ دل دادگان طرز ناسخؔ و اسیرؔ نے انھیں بالکل فراموش کر دیا مگر اس سے ان کی مشاقی اوستادی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ مصحفیؔ کے شاگردوں میں آتشؔ کے بعد ان کا نمبر سمجھنا چاہیے

دیوان فارسی کے علاوہ آپ کا کلیات ۱۲۲۲ھ کا لکھا ہوا جس میں ۸۵ صفحات پر غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی۔ چند مخمس اور ۲۵ رباعیاں ہیں۔ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔"

تھم کے بے وجہ تڑپتے نہیں بسمل تیرے — آبِ خنجر سے یہ رہ رہ کے مزا لیتے ہیں

---

ان دنوں چاک ہے پیراہنِ گل اے تنہاؔ — ہم کوئی اپنے گریباں کو سلا سکتے ہیں

---

غیر سے شکوہ مرا بس دیکھی دانائی تری — میں ہوا رسوا تو کیا ہوگی نہ رسوائی تری

---

حشر میں کس لیے ہم آہ بھٹکتے پھرتے — اپنا منہ ہم سے اگر یاں نہ چھپاتا کوئی

---

آئے تو ولے آن کے اک آن نہ ٹھہرے — کتنا ہی کہا وہ کسی عنوان نہ ٹھہرے

---

مذکور کر رہا تھا شب ہم نشیں کسی کا — دل میں خیال گزرا میرے وہیں کسی کا

سینے پہ ایک پرزہ اب جیب کا نہیں ہے — دیکھا تھا ہاتھ میں نے بے آستیں کسی کا

---

معمورۂ دنیا میں یہ کثرت ہے کہ اللہ — آئے تھے اسے ہم تو بیاباں سمجھ کر

کرتا ہے ستم ہم پہ تو آسان سمجھ کر — ہم کچھ نہیں کہتے تجھے نادان سمجھ کر

---

گر عیادت کو کسی کی کبھی آتا کوئی — تو بھلا مفت میں کیوں جان سے جاتا کوئی

---

رویا تھا میں اک شب کسی نادان کے آگے — وہ صبح لگے کہنے ہر انسان کے آگے

اے دستِ جنوں چاہے تو کر اسکے بھی ٹکڑے — اب باقی ہے دامن ہی گریبان کے آگے

بجلی کی چمک، شعلہ جوالہ کا عالم — ہے گرد تری جنبشِ دامان کے آگے

---

عجب طرح کی بہار ان دنوں کسی پہ ہے — نہ حور پہ وہ لطافت نہ وہ پری پہ ہے

نہ غافل اب ہو یہ ارشاد مصحفی تنہاؔ — بہوش باش کہ عالم روا روی پہ ہے

---

میں وہ اسیرِ سیرِ چمن ہوں شکستہ بال — روتے ہیں جس کو مرغِ گرفتار دیکھ کر

دل ہے وہ جنس بیچ جسے بازارِ دہر میں — منہ پھیر لیوے اپنا خریدار دیکھ کر

بلبل کو لے کے نکلا تھا صیاد گل کہیں — شاید کہ خوش ہو یہ گل و گلزار دیکھ کر

گلشن تلک پہنچنے نہ پایا کہ مرگئی　　چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھ کر
تلوار پہ نہ ہاتھ رکھو جان، مرگیا　　تنہاؔ تمھاری ابروے خمدار دیکھ کر

---

گو قافلے سے یارو تنہاؔ رہا ہے پیچھے　　دل تو ابھی بہت ہے، کیا ڈر ہے، جا ملے گا

---

تنہاؔ رکھیں توقع کس بات کی کسی سے　　ہاں سچ تو یہ ہے بھائی کوئی نہیں کسی کا

---

وہ مرا شعلہ خو، آتش کا پرکالہ بھبھوکا ہے　　کہ جس کو دیکھ کر ہوتا ہے دل بیتاب آتش کا
لگا دی آگ ساقی نے لنڈھا کر شیشۂ مے کو　　بہایا اُس نے شب محفل میں کیا سیلاب آتش کا

---

یہ جی میں ہے کہ لوں تجھ سے اُٹھا دل　　نہیں کہنے میں میرے پہ مرا دل
ہجوم عاشقاں تھا اس گلی میں　　یہ کہتا تھا ہر اک ہے ہے مرا دل
کدھر کو جاؤں اور کس سے کہوں ہائے　　ابھی پہلو میں تھا میرے مرا دل
خفا رہنے سے کیا حاصل ہے تنہاؔ　　نہیں کہنے میں تیرے جب ترا دل

---

کر اپنے کرم پہ تو نگہ اے ہمہ الطاف　　ہر چند گنہگار ہے شایانِ تغافل

---

یہ تو فرمائیے ہم آپ کا کیا لیتے ہیں　　آپ بے وجہ جو منہ ہم سے چھپا لیتے ہیں

---

چشم تر گورِ غریباں پہ نہ . کی　　ابرِ رحمت ! اسے کیا کہتے ہیں

---

بازار دہر میں ہوں میں وہ جنس ناقبول　　جس کو کبھی نہ لیوے خریدار ہاتھ میں

---

یاد آتے ہیں پھر ہم کو ایامِ گرفتاری　　پھر جوشِ جنوں لایا پیغامِ گرفتاری
ساقی نے دیا تھا جو معلوم نہیں مجھ کو　　جامِ مئے گلگوں تھا یا جامِ گرفتاری
کیوں دام و قفس لاوے صیاد اگر سمجھے　　صیاد کی الفت ہے خود دامِ گرفتاری
جو ہیں ترے زندانی بہتر وہ سمجھتے ہیں　　آرام رہائی سے آلامِ گرفتاری
گھبراؤں جو اے تنہاؔ تقدیر یہ کہتی ہے　　بے صبر نہ ہو اتنا اے خامِ گرفتاری

---

ہے جی میں اُس کی کاکلِ پرخم کو دیکھیے　　اس آرزو کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

---

لے کے سو دم آہ دل سے لب تلک آنے لگی　　ناتوانی بھی نہیں زور اپنا دکھلانے لگی

---

ملی جو روٹھا تو منا کر مجھے وہ یوں بولا ___ کہیے کیا کرتے جو تم کو نہ منا تا کوئی

تذکرہ ہندی ۔ ص ۱۵ ، مجموعۂ نغز ۔ ص ۱۴۷ ، گلشن بے خار ۔ ص ۴۲ ، عیار الشعرا (قلمی) خوش معرکہ زیبا اول ص ۳۸۳ ، عمدہ منتخبہ ص ۱۶۲ ، خمخانہ جاوید دوم ص ۱۱۲ ، طور کلیم ص ۲۳

---

## عیوض علی خاں تنہاؔ

ان کے جد امجد قاسم علی خاں مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے اور ملاّ قاسم علی کہلاتے تھے ۔ وہاں سے ایران آئے اور ایران سے ہمایوں کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے اکبر کے زمانے میں یہ خطاب خانی پاکر منصب داروں کی فہرست میں شامل ہوئے اور اپنے لڑکے محمد قائم علی خاں کے لیے دربار اکبری سے پرگنہ ڈاسنہ کی فوج داری کا پروانہ حاصل کیا جو مدد معاش حکومت سے ملی وہ ان کے پس ماندگان میں گزشتہ صدی ہجری تک برقرار رہی ۔ قائم علی خاں جہانگیر کے زمانے سے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک بقید حیات رہے ۔ محمد سعید خاں نے جو قائم علی خاں کے لڑکے تھے کچھ مدت سرکار روشن الدولہ میں گزاری پھر محمد شاہ کی جانب سے سرہند کی فوج داری پر تعینات ہوئے ۔ محمد سعید خاں کے لڑکے محمد وحید خاں نے (یہ عیوض علی خاں کے باپ تھے) نادر شاہ کے ہنگامے کے بعد نواب غازی الدین خاں کی خدمت میں کچھ وقت گزارا پھر شاہ عالم کی جانب سے اپنی موروثی خدمت فوج داری پرگنہ ڈاسنہ پر فائز ہوئے ۔

عیوض علی خاں تنہاؔ نواب ذوالفقار الدولہ کی وفات کے بعد دہلی میں روزگار کا سلسلہ نہ دیکھ کر لکھنؤ چلے آئے یہاں کچھ مدت مرشد زادہ جہاں دار شاہ کی رفاقت میں گزاری اور جب وہ بنارس چلے گئے تو اول خواجہ الماس علی خاں اور پھر نواب مہدی علی خاں مہدیؔ

کی رفاقت میں اوقات بسری کرنے لگے انھیں دنوں میں ان کی توجہ شعروشاعری کی جانب راغب ہوئی اور چونکہ مصحفی بھی انھیں کے دربار سے وابستہ تھے۔ تنہاؔ نے انھیں سے استفادہ کیا۔ آخر کار لکھنؤ سے واپس ہوئے اور میرٹھ میں قدرے قیام کر کے دہلی چلے گئے میرٹھ میں ان کی ملاقات محی الدین عشقؔ و مبتلاؔ سے بھی ہوئی تھی۔

بے جگر کا بیان ہے کہ تنہاؔ کے اکثر کلام میں تصوّف کی جھلک نظر آتی ہے۔

ذکاؔ کہتے ہیں کہ

"سپاہ گری کے اوصاف کے ساتھ خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کی تصانیف بہت مطبوع و دل کش ہیں"۔

سن وفات کا علم نہ ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب ذکاؔ نے اپنا تذکرہ لکھا تو یہ دہلی میں تھے۔

تنہاؔ کے ایک شاگرد حسین بخش مشتاقؔ کا نام تذکروں میں ملتا ہے یہ رہنے والے تو قصبہ کول (علی گڑھ) کے تھے، لیکن بیگم سمرو کی ملازمت کی وجہ سے سردھنہ میں قیام تھا۔

سرورؔ ان کو جوان ذہین بتاتے ہیں۔ یہ مطلع ان کا ہے ؎

جس پہ بھی رکھتی ہے کاوش تیغ قاتل اب تلک | لوٹتے ہیں ہم تو ہو کر نیم بسمل اب تلک

---

تنہاؔ کی کوئی تصنیف ہماری نظر سے نہیں گزری۔ مختلف تذکروں سے جو کلام دستیاب ہوا اُسے درج کیا جاتا ہے۔

نسیم صبح گیسوئے نازنیں سے | گزر بیٹھے ہم اب دنیا و دیں سے
میں کچھ واقف نہیں سنتا ہے قاصد | خبر لا دے مجھے اس کی کہیں سے

کل شب کو ماہرو سے میں پوچھا کہ کیا تمھیں | منظور میری دوستی اے نازنیں نہیں
سُن کر خفا ہو تیوری چڑھا اور مسکرا | کہنے لگا نہیں، ارے ہرگز نہیں نہیں

جلوے سے تیرے خالی یہ کون و مکاں نہیں
ایسی نہیں ہے کوئی جگہ تو جہاں نہیں

مردماں! یہ چشم اپنی بس کہ گوہر بار ہے
ہے بجا گر اشک کو کہیے در شہوار ہے

کیا بلا پھونکی ہے سوزِ عشق نے دل میں مرے
آہ کا شعلہ جو نکلے ہے وہ آتش بار ہے

دلبروں کو کیا ادا تو نے عنایت کی خدا
جو نگہ ترچھی پڑے برچھی سی دل کے پار ہے

تھا یہی پیغام وقتِ نزع تنہا یار سے
اب قیامت پر ہمارا وعدۂ دیدار ہے

ذرا چشم حقیقت بیں کو اپنی کھول کر دیکھو
وہی اک نور ہے سارے جہاں میں جلوہ گر دیکھو

قد بھی ہے قیامت ترا فتنہ بھی ستم ہے
خندہ نہیں یہ صفحہ پہ یاقوت رقم ہے

عمدہ منتخبہ ص ۱۷۳، مجموعۂ نغز۔ ص ۱۴۰، طبقات الشعرا کریم الدین۔ ص ۲۸۸

---

تذکرہ بے جگر قلمی

# مرزا علی بیگ ثمر

مرزا جعفر علی بیگ کے لڑکے تھے۔ بزرگوں کا وطن شاہ جہاں آباد تھا لیکن یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد طبیعت شعر و سخن کی طرف راغب ہوئی جو کچھ لکھا اسے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی خدمت میں پیش کیا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ مشق و مزاولت نے انھیں نغز گو شاعر بنا دیا تھا۔ ضرورت شعری سے واقف ہونے کے باعث بے سقم اشعار لکھتے تھے۔ کہیں کہیں صنائع لفظی کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

آنکھوں سے ملتے چلتے اگر سیم تن کے پاؤں
آتے جو ہاتھ، چومتے اس گلبدن کے پاؤں

پہلے مصرع میں ملتے اور چلتے تجنیس کی بہت اچھی مثال ہے اور دوسرے میں ہاتھ اور پاؤں کے اجتماع نے مراعات النظیر کی صنعت پیدا کر دی ہے۔ ۱۲۶۹ھ کے قریب انتقال کیا۔

کلام کا انتخاب ریاض الفصحا، خوش معرکہ زیبا اور سراپا سخن سے پیش کیا جاتا ہے۔

جس نے رکھی تیرے لب میگوں پہ انگشت
گویا کہ دھری بادۂ سر جوش پہ انگشت

آغوش میں لینا تو ہے دشوار صنم کا
ہو قطع رکھوں اس کے اگر دوش پہ انگشت

اللہ ری نزاکت کہ ہوئی بارِ گراں وہ
تھی میں نے رکھی اس کے سبک دوش پہ انگشت

سب پڑھتے ہیں تربت پہ ترے کشتے کی الحمد
رکھتے نہیں تم قبر وفا کوش پہ انگشت

آغشتۂ خوشبو ہے جو اے بادِ صبا تو
کیا آئی ہے رکھ کر کسی گل پوش پہ انگشت

مجنّث میں بھی تحریر کر اشعار ثمر کچھ
اس وقت نہایت ہے تری جوش پہ انگشت

---

زیرِ مژگاں کیوں نہ ہووے چشم کا روشن چراغ
باد سے بے خوف رہتا ہے تہِ دامن چراغ

---

آنکھوں سے ملتے ملتے اگر سیمتن کے پاؤں
آئے جو ہاتھ چومتے اس گلبدن کے پاؤں

کوئے صنم سے جانا نہ ہوئے کبھی نصیب
ہو جائیں یا الٰہی مرے لاکھ من کے پاؤں

آنکھوں کو اس کی ملیے ترے تلووں کے تلے
قربان کیجیے پاؤں پہ تیرے ہرن کے پاؤں

حد سے ہیں گزری یار کی وعدہ خلافیاں
پوجیں گے آج اس بت پیماں شکن کے پاؤں

سیکھی انھیں سے اس نے ہے طرزِ رمیدگی
ٹوٹیں کہیں الٰہی غزالِ ختن کے پاؤں

دونوں کی ایک تو نہ پرستش سمجھ ثمر
پائے صنم کجا و کجا برہمن کے پاؤں

---

شکل وصل آئی نظر آئینۂ فولاد میں
زندگیٔ خضر پائی خنجرِ جلاد میں

اس نے نور آگیں تری تصویر کھینچی جو صنم
خامہ مو بن گیا خود پنجۂ بہزاد میں

آہ موزوں پہ ہماری کیوں نہ قمری جان دے
پائے رعنائی کہاں یہ قامتِ شمشاد میں

(زیبا)

---

قاتل بہت سا خوش ہوا مجھ پر لگا کے ہاتھ
سر نے لیا جو بوسہ پا اس کا کھا کے ہاتھ

غمزے سے تڑپے ہے کوئی عشوے سے مر گیا
چلتے ہیں کس طرح ترے ناز و ادا کے ہاتھ

روندا اگرچہ توسنِ جاناں نے لاش کو
آویں گے استخواں مرے کیونکر ہما کے ہاتھ

کیا رنگِ شوخ، شوخ ہاتھوں میں لائی ہے
کیا خوں لکھا ہوا ہے ہمارا حنا کے ہاتھ

لیلیٰ و شیریں پہ ہم عبث ناز کرتے ہیں
ہم اور ہی بکے ہوئے ہیں دلربا کے ہاتھ

رخسارِ یار پہ ہے دھرا آج دستِ غیر
کیا گنج شائگاں ہے لگا اک گدا کے ہاتھ

پھل زیب دیتا ہاتھ میں خوباں کے خوب ہے
بیچیں گے ہم ثمر تجھے اک دلربا کے ہاتھ

جستجو دل کی عبث گیسوئے خمدار میں ہے
چیز گم گشتہ کہیں ملتی شب تار میں ہے

ہو دم نالہ کشی دیکھیے کیا شور بلند
برگ گل تو ابھی بلبل تری منقار میں ہے

خاک جو ہم بعدِ فنا ہو گئے
بار گراں تجھ پہ صبا ہو گئے

بخیہ گری کا جو ہوا شوق اُسے
لاکھوں گریباں فنا ہو گئے

اُس کے رخسار سے پردہ جو اُٹھا
شمس و قمر دیکھ فدا ہو گئے

موج نسیم لطمۂ صرصر ہوئی انھیں
جو بارِ گل سے ساعد سیمیں لچک گئے

کس کی شمیم زلف صبا لائی تھی سَحَر
سکّان شہر و دشت جو سارے مہک گئے

ریاض الفصحا ص۱۶۔ ، سرور چراغاں (قلمی) ، خوش معرکہ زیبا جلد اول ص۵۰۳

---

## شیخ محمد ابراہیم جاہ

خلف شیخ امام بخش مصحفی کے آخری ایام کے تلامذہ میں ہیں۔ ناصر کہتے ہیں ۔

" کلام میں ایک فصاحت ۔ سخن میں شیشے کی نزاکت " ہے ۔ ان کا اشارہ غالباً ان کے پیشے کی طرف ہے یعنی یا تو وہ چوڑی کا کاروبار کرتے ہوں گے یا کوئی اور ایسا کام جس میں شیشہ استعمال ہوتا ہو ۔ ۱۸۹۷ھ میں جب میاں داد خاں سیاح شاگرد مرزا غالب گھومتے پھرتے کان پور پہنچے تھے تو ان کی موجودگی میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اس میں جو غزل جاہ نے

پڑھی تھی وہ سیّاح کی تصنیف 'سیر سیّاح' میں درج ہے۔ اُس کا انتخاب یہاں لکھا جاتا ہے ؎

پہنچا وہاں یہ طائرِ دل کرّ و فر کے ساتھ
روح الامیں جہاں نہ گئے بال و پر کے ساتھ

لے جائے شب کو دل ہمیں داغِ جگر کے ساتھ
جلتا ہے یہ چراغ بھی اس راہبر کے ساتھ

لکھ لکھ کے خیر و شر مرا نامہ سیہ نہ کر
اے کاتبِ عمل، غمِ زلفِ دو سر کے ساتھ

قسمت میں درج آپ کی ابرو کا عشق ہے
لائے ہیں ہم ازل سے یہ تلوار سر کے ساتھ

گل برگِ تر میں قطرۂ شبنم چھلک گئے
آنسو جو گر پڑے کہیں لختِ جگر کے ساتھ

بلبل نے خار و گُل کو بہم دیکھ کر کہا
کھٹکا ہزار طرح کا ہے اہلِ زر کے ساتھ

ٹکرایا سر جو میں نے شبِ انتظار میں
ہم چشم ہو گئی مری دیوار در کے ساتھ

کرتا ہے روز ذبح موذن شبِ وصال
تکبیر کہہ کے نالۂ مرغِ سحر کے ساتھ

ہم دیکھ لیں گے سنگ دلی ان بُتوں کی جاہؔ
نالہ کوئی دہن سے جو نکلا اثر کے ساتھ

---

یہ غزل خوش معرکہ زیبا میں ہے ؎

زنجیر کا ہو کہ زلف کا ہو
وحشت کا کوئی تو سلسلا ہو

دل موردِ صد غم و بلا ہو
لیکن نہ کسی یہ مُبتلا ہو

مٹ جائے مرا طلسم خاکی
یہ نقشِ فنا کہیں فنا ہو

آرام سے ہم لحد میں سوئے
اے خوابِ اجل ترا بھلا ہو

اس دل کی کشش سے کھینچ مانی!
تصویرِ صنم جو کھینچنا ہو

میں سیف زباں ہوں جاہؔ میرا
دشمن تہِ تیغ مرتضا ہو

---

جاہؔ کے تلامذہ کا سلسلہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ ان کے ایک شاگرد شیخ امام الدین افسرؔ کان پوری تھے جو سیّاح کے مندرجہ بالا مشاعرہ میں شامل تھے ان کے یہ تین شعر سیر سیّاح میں درج ہیں ؎

رہتا ہوں روز و شب اسی بیدادگر کے ساتھ
پنبہ کو اب تو ربط ہوا ہے شرر کے ساتھ

پُر کر دیا ہے درہم داغِ ملال سے — دل نے بڑے سلوک کیے ہیں جگر کے ساتھ
دیکھا تو ہاتھ خالی ہیں دونوں کے قبر میں — مفلس کے ساتھ کچھ ہے نہ کچھ اہلِ زر کے ساتھ

انسرؔ مذکور نے قدسی کی غزل کا مخمس بھی لکھا تھا جس کا پہلا بند یہ ہے ؎

دوسرا کون ہوا صاحب لولاک نبی — ختم ہے کس پہ سوا تیرے معلا حسبی
بانیٔ آدم نے ترقی وجہ سے عالی نسبی — دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی

دوسرے شاگرد حافظ عبدالعزیز تھے یہ آرہ (بہار) کے رہنے والے ظہور علی کے لڑکے تھے غضنفرؔ تخلص کرتے تھے۔ نقشہ نویسی پیشہ تھا۔ کان پور سے کلکتے چلے گئے تھے اور وہاں مولوی عصمت اللہ الفسخ کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ میلاد خواں اچھے تھے۔ آواز میں دل کشی تھی اس لیے مشاعروں میں کامیاب ہوجاتے تھے۔

صاحب غنچۂ ارم نے ان کے یہ دو شعر اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں ؎

کچھ نہ پایا جب کہ دیکھا جیب و داماں کی طرف — بڑھ چلا جوش جنوں پھر تو گریباں کی طرف
اے غضنفرؔ بھول جائے لعل و گوہر جوہری — دیکھ لیوے گر لب و دندانِ جاناں کی طرف

غنچۂ ارم ص ۱۵۷

---

## مرزا نعیم بیگ جواںؔ

دہلی کے محلہ کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ وجیہہ، خوش قامت، خوش تقریر، عظیم الشان اور خندہ رو تھے۔ آغازِ شباب ہی سے شعر گوئی کی طرف طبیعت راغب ہو چلی تھی۔

مصحفی اُس زمانے میں اُنھیں کے محلّے میں مقیم تھے اس لیے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ جواں بڑے تپاک و نیاز مندی کے ساتھ پیش آتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اُس میں مشورہ بھی کرتے تھے۔ مصحفی کے لکھنؤ چلے آنے اور دہلی کے معاشی و اقتصادی حالات بگڑ جانے کی وجہ سے یہ مشغلہ قریب قریب ترک ہو گیا تھا۔ یہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے خاص الخاص ملازموں میں تھے اس لیے جب وہ دہلی سے لکھنؤ آئے تو جواں بھی ساتھ تھے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد مرزا سلیمان شکوہ نے جب محفل شعر و سخن گرم کی اور مصحفی بھی اس مجلس میں شریک کیے گئے تو جواں نے بھی اپنے آقا کے مشاعرے کے لیے سعی بلیغ کے ساتھ غزل کہنا شروع کی اور پرانی معرفت کے باعث اس میں مصحفی ہی سے اصلاح لی۔ جواں مرزا سعادت یار خاں رنگین کے اچھے دوستوں میں تھے اور انھیں کی فرمائش سے رنگین نے ۱۲۱۵ھ میں "مجالس رنگیں" ترتیب دی تھی۔

معلوم نہیں کہ مرزا سلیمان شکوہ کی رفاقت سے جواں کب الگ ہوئے اور کب شمس الدولہ نواب احمد علی خاں کی رفاقت میں پہنچے مگر مست کے بیان کے مطابق جب شمس الدولہ ۱۲۲۹ھ میں لکھنؤ سے بنارس گئے تو جواں اُن کی رفاقت میں بنارس چلے گئے تھے۔ مست نے لکھا ہے کہ جواں مرد خوش سلیقہ و ذی استعداد ہیں اور میرے ساتھ دید و وادید کے تعلقات ہیں۔

جواں کی شاعری کی ابتدا چونکہ بارھویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی تھی اس لیے ان کی زبان میں وہ تمام الفاظ موجود ہیں جو بعد کے زمانے میں متروک قرار دیے گئے۔ صاحب گلدستۂ نشاط نے تخلص کی ملابست کی وجہ سے ان کا نام مرزا کاظم علی لکھ دیا ہے جو کلکتے میں تھے۔ حالانکہ اشعار وہی ہیں جو نعیم بیگ جواں کے نام سے تذکروں میں درج ہیں۔

صحیح سنہ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ مگر ۱۲۴۵ھ سے قبل انتقال کر چکے تھے کیونکہ کریم الدین نے لکھا ہے کہ مدت ہوئی دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا۔

کلام کا اندازہ اس انتخاب سے کیا جا سکتا ہے ؎

تمنا ہے اُس کا درس دیکھنا
مجھے اور مری یہ ہوس دیکھنا

پہلو میں دل اپنے کو بھی غمخوار نہ پایا
یہ خوبیٔ قسمت کہ کوئی یار نہ پایا

ازبس کہ ہوئی گرمیٔ خورشید قیامت
کوچے میں ترے سایۂ دیوار نہ پایا

ظلم و ستم و جور سبھی ہم نے اُٹھائے
جب اور کوئی تجھ سا طرحدار نہ پایا

ہم بیچتے آئینۂ دل تیرے ہی ہاتھوں
پر ہم نے تجھے اس کا خریدار نہ پایا

شب درد سے کرتا تھا جوآں نالۂ و فریاد
محفل میں تری اُس نے مگر بار نہ پایا

ساتھ ہر اک کے اُسے شوق ہے اب کُشتی کا
اے جوآں تو بھی تو اس فتنۂ دوراں سے لپٹ

سیہ خال اس طرح سے ہیں گے اُس کی ناف کے اوپر
رشید انے دیے ہوں جیسے نقطے قاف کے اوپر

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رُکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سکھائیاں ہیں

اے عندلیب سچ کہہ، کیا فصل گُل پھر آئی
فوج جنوں کی ہم پہ کیسی چڑھائیاں ہیں

کس بے ادب نے تم سے گلبازی آج کی ہے
منہ پر تمھارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں

دیوار و در کی چھاتی سوراخ ہو گئی ہے
کیا روزنوں سے اُس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

پیوستہ ابرو اس کی میں دیکھ کر یہ سمجھا
دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

گر اُس کی بے وفائی کا شکوہ بیاں کروں
تو رفتہ رفتہ جمع میں اک داستاں کروں

اُس سے تو اپنے حسن کا شعلہ نہ چھپ سکا
میں ضبط آہ کیونکہ بھلا اے جوآں کروں

چین نہیں ہے جی کو ٹک آہِ جگر خراش سے
ہوک اُٹھے ہے دمبدم دل میں عجب تماش سے

جب تیغ و سپر لے وہ سپاہی پسر آوے
کیا تاب ہے رستم کی جو اس سے بسر آوے

جیتا نہیں پھرتا ہے کوئی اُس کی گلی سے
مجھ تک مرے دلدار کی کیونکہ خبر آوے

اُٹھ چل نہ جوآں آج تو پھر اُس کی گلی کو
شاید وہ نکلتا ہوا گھر سے نظر آوے

نقاب اُلٹ کے جو شب کو وہ مہ لقا نکلے | تو چاند شرم سے بادل میں منہ چھپا نکلے
ہوا تو تب ہے کہ کشتے کی اپنے تربت پر | حنائی ہاتھوں کو مَلتا ہوا وہ آ نکلے
جو دیکھ کر دُرِ گوش اُس کا مر گیا ہووے | بجا ہے خاک سے گر اس کی موتیا نکلے
کسی کو اپنی سفارش کے واسطے اُس پاس | جو لے کے جاؤں تو اُس کا وہ آشنا نکلے
غزل جو آں کی پڑھی جائے جب کہ محفل میں | زبانِ اہل فراست سے مرحبا نکلے
تیرے منہ سے ہر کوئی دیتا ہے پیارے رو مجھے | منہ لگاتا ہی نہیں افسوس لیکن تو مجھے

---

تذکرہ ہندی گویاں۔ ص ۶۶، عمدۂ منتخبہ۔ ص ۱۸۹، مجموعہ نغز۔ ص ۱۷۴
خوش معرکہ جلد اول۔ ص ۳۷۶، بزم سخن ص ۳۸، ریاض الوفاق مخطوطہ
گلدستۂ نشاط۔ ص ـــ، گلشن بیخار۔ ص ۵۳، گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۰۸
طبقات الشعرا کریم الدین۔ ص ۳۲۲/۳۸۴، یادگار شعرا ص ۶۳

---

## رحیم اللہ جوشش

عام طور پر رحمو کہلاتے تھے۔ پہلوان قسم کے آدمی تھے۔ ابتدا میں یہ شوق رہا کہ سڑک پر مجمع لگاتے اور اس میں دوسروں کے شعر پڑھا کرتے تھے رفتہ رفتہ طبیعت میں موزونیت پیدا ہو گئی اساتذہ کے سیکڑوں اشعار بر زبان تھے ہی۔ اس لیے خود بھی شعر کہنے لگے۔ ابتداءً کچھ روز مرزا قدروی سے اصلاح لی۔ اُن کے انتقال کے بعد مصحفی کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ مذاق شاعری بہت بلند نہ تھا۔ عام فہم اور عامیانہ اشعار لکھنے کی طرف زیادہ رغبت رہی۔ دہلی میں ایک رئیس زادے نواب مہدی علی خاں

تھے وہ اپنے دولت خانے پر بزم مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے جس میں دہلی کے تمام شعرا شریک ہوتے تھے جوش بھی ان مشاعروں میں برابر شریک رہے۔ آزاد منش، یار باش اور بے تکلف آدمی تھے۔ ہولی کے زمانے میں دوسرے آزاد مزاج لوگوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی جا بجا گلی کوچوں میں غزل خوانی کرتے پھرا کرتے تھے۔ بعض اوقات اپنے دوستوں کے مجمع میں ظرافت آمیز اشعار پڑھ کر اہل مجلس کو ہنسا دیتے تھے مگر خود بالکل ساکت و صامت رہتے تھے۔ ذکا کے مطابق جوش نے دو دیوان تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے ایک دیوان ہزلیات و مضحکات کا تھا اور دوسرا دیوان سنجیدہ مضامین کا۔ اس میں برجستہ غزلیات، عمدہ مخمسات و رباعیات اور دوسری اصناف سخن شامل تھیں۔ ۱۲۰۹ھ تک حیات اور دہلی میں موجود تھے۔ دیوان دستیاب نہیں ہوئے صرف تین شعر مختلف تذکروں سے فراہم ہوئے ہیں جن کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بولے کہ اب تیرا روتے ہی جنم گزرا　　میں نے جو کہا تجھ بن کیا کیا نہ الم گزرا

منہ صراحی سے نہ او دلبر میخوار لگا　　ظرف پر اپنے نظر کر تو ابھی لڑکا ہے

بیدرد تو کیا جانے کیا رنگ کسو کا ہے　　دریا مری آنکھوں سے نت جاری ہوا کا ہے

تذکرہ ہندی گویاں. ص۹۶، عمدہ منتخبہ. ص۱۸۳، مجموعہ نغز. ص۱۷۳
گلشن ہمیشہ بہار. ص۱۰۸، عیار الشعرا (قلمی)، گلشن بے خار ص۵۳
طبقات الشعرا کریم الدین. ص۳۲۸،

---

## حکیم شاہ عالم خاں حاذق

مولوی محمد عالم کے لڑکے، مولوی محمد عزیز کے پوتے اور یوسف زئی پٹھان تھے۔

مصحفی نے ان کو شاہ جہان پور کا ساکن لکھا ہے مگر مصنفہ تاریخ شاہ جہان پور نے لکھنوی قرار دیا ہے (ص ۲۳۳) مولوی محمد عالم کو اخوند زادہ کہا جاتا تھا۔ وہ بڑے ذی علم، صاحب استعداد بزرگ تھے اور حسب روایت تذکرۃ الاحباب ۱۲۵۴ھ تک حیات تھے۔ نوابان قلعہ شاہ جہان پوران کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔

حاذق شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی اُردو فارسی کی تعلیم منشی عوض رائے مسرت شاہ جہان پوری متوفی ۱۲۳۶ھ سے حاصل کی اور ابتدا میں انھیں سے اصلاح بھی لی۔ تکمیل تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے تو یہاں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر ضرورت شعری سے باخبر ہوئے۔ فن طبابت اور صرف و نحو میں استعداد کلّی رکھتے تھے اور خوش فکر شاعر تھے۔ شعرا کے عام تذکرے ان کے حالات و کلام سے خالی ہیں صرف سعادت خاں ناصر نے ذکر کیا ہے اور ان کا ماخذ بھی مصحفی کا ریاض الفصحا ہی ہے ہم نے بھی وہی کلام درج کیا ہے جو اس تذکرے میں ہے ۔

اُٹھ کے میرے پاس سے جب وقت وہ جانے لگا — بیخودی طاری ہوئی ایسی کہ غش آنے لگا
گور میں بھی اُس کے دھوکے سے فرشتوں کی طرف — کیا خوشی سے اُٹھ کے میں آغوش پھیلانے لگا
میں نے گر چشم خریداری سے دیکھا اس طرف — پھول نرگس کا بھی مجھ کو آنکھ دکھلانے لگا

اے صبا! باغ سے خنداں تجھے آنا کیا تھا — موسم گل میں اسیروں کو ستانا کیا تھا

یہ ان دنوں میں عشق نے دیوانہ کر دیا — ہر اک یگانے سے مجھے بیگانہ کر دیا
دیکھا جو اپنے عکس کو خوش ہو کے یوں کہا — آئینے کو بھی ہم نے پری خانہ کر دیا

روز کیوں باڑھ دھری جاتی ہے تلواروں پہ — کوئی ہوتا ہے خفا اتنا گنہ گاروں پہ
ذبح کر یا انھیں آزاد کر اس دم صیّاد — حالت نزع ہے اب تیرے گرفتاروں پہ

عشق میں جیب سے تڑپا ہے دلِ ناشاد سے کام — ہے مجھے شے کی طرح نالہ و فریاد سے کام

باغباں سے نہیں دانستہ غرض کچھ انکی | جو گرفتارِ قفس رکھتے ہیں صیاد سے کام
سخت مشکل ہے فن شعر کا آنا حاذق | چاہیے نت رہے شاگرد کو استاد سے کام

دیویں گے تجھ کو کُشتۂ الفت دعا نسیم | کوئی تو گُل تو ان کی بھی تربت پہ لا نسیم

خود بخود تو جو ہوا آج پریشاں ایسا | کام کیا تجھ سے ہوا اے دلِ ناداں ایسا
سنبلِ زلفِ بتاں کو نہ رہی تاب نگاہ | ان دنوں حال ہے اپنا پریشاں ایسا

ریاض الفصحا ص ۲۴۸، خوش معرکہ اول ص ۴۹۱، تاریخ شاہجہان پور جلد دوم ص ۱۹۸ تا ۱۷۱

---

## مرزا لطف علی بیگ حباب لکھنوی

حباب کے والد مرزا کلو بیگ کو میاں آفریں علی خاں کی سرکار سے "تحویل کو ٹھہ" کا امتیاز حاصل تھا۔ حباب نے بدو شعور کے ساتھ شعر و شاعری کی طرف توجہ کی اور شعرائے معنی بند کی تقلید میں ایسے شعر کہنے لگے جو میاں مصحفی کی روش کلام سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ اُن کے شاگرد تھے اور اُن کے رنگِ سخن کے خلاف لکھ کر انھیں سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ مصحفی نے ان کے ذہن و ذکا اور طبعِ رسا کی تعریف کی ہے اور اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں ان کی عمر بائیس سال بتائی ہے۔ کلام یہ ہے ۔

سرنگوں میں ورقِ دل کی جو تحریر میں تھا | رنگ بھرنا قلمِ فکر کی تصویر میں تھا
گردشِ چرخ ستمگر نے مٹایا آخر | نقشِ بہزاد میں اس چرخ کی تعمیر میں تھا

سر اُٹھایا نہ کسی نے بھی بہ پیشِ قاتل
ملک اللہ کا سب قبضۂ شمشیر میں تھا

تصویر خیالی ہی سے سوویں گے چمٹ کر — ارمان نکالیں گے شبِ وصل لپٹ کر
دعویٰ نہ کرے بادِ صبا تیز روی کا — چھو لوں گا میں دیوارِ سکندر کو جھپٹ کر
ہے چشم مری خانۂ تحویلِ جواہر — آیا ہے سمندر مرے کوزے میں سمٹ کر
پیغام زبانی ملک الموت کا آیا — بیٹھے مری بالیں سے مسیحا کہیں ہٹ کر

---

طے راہِ عدم ہو نہ سکی، چلتے ہی چلتے — جوں رنگِ رواں کٹ گئی عمر اپنی سفر میں
صنعت قلمِ صانعِ عالم کی یہ دیکھی — ہر نقشۂ نیرنگ ہے طاؤس کے پَر میں
برسوں سے نہیں منزلِ مقصود کو پہنچا — ہر دم فلکِ پیر جو رہتا ہے سفر میں

---

حباب دار جو مٹنے کی آرزو کرتے — چمن میں ہم بھی سرِ سیرِ آبِ جو کرتے
ہمارے خانۂ دل میں ہے روشنی اُس کی — کہ جس کی دیر و حرم میں ہیں جستجو کرتے

---

عمر گزری کہ میں واقف نہیں میخواری سے — ہاتھ ساقی نے بھی کھینچا مری ناداری سے
قفسِ تنگ میں کہتے ہیں یہ مرغانِ قفس — کب چھٹیں دیکھیے اس رنجِ گرفتاری سے
پاؤں پھیلا لحدِ تیرہ میں سونا بہتر — دم اُلٹتا ہے شبِ ہجر کی بیداری سے
تختۂ مضموں کے سدا چیرتا ہوں اس سے حبابؔ — کم نہیں تیغِ زباں اپنی بھی کچھ آری سے

ریاض الفصحا۔ ص ۸۲، خوش معرکہ زیبا دوم۔ ص ۴۳۳

---

## لالہ چینی لال حریفؔ

روشن لال کے بیٹے قوم کے کایستھ اور لکھنؤ کے پرانے باشندے تھے۔ مصحفی نے ان کے جد مادری کا وطن دہلی بتایا ہے۔ اردو اور فارسی کی تعلیم مصحفی سے شروع کی اور چھ سال تک ان کی خدمت میں رہ کر درجۂ کمال کو پہنچے۔ دونوں زبانوں

میں فکر سخن کرتے تھے اور مصحفی کے راسخ العقیدہ و مخلص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولوی علی حسن خاں نے ان کا ذکر "نحیف" تخلص کے تحت کیا ہے اور مرزا فاخر مکین کا شاگرد لکھا ہے۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں نحیفؔ تخلص ہو اور آخر میں حریفؔ کر لیا ہو یا یہ صورت ہو کہ اردو میں حریفؔ اور فارسی میں نحیفؔ تخلص کرتے ہوں۔ کلام کا انداز یہ ہے ؎

یہ کون غیرتِ حور آج بے نقاب ہوا | کہ جس کے جلوے سے ہر ذرہ آفتاب ہوا
غم دوری سے ہے ہمدم نہایت جی یہ تنگ اپنا | نہ کھا دیں خونِ دل کیونکر نہ ہو کیوں زرد رنگ اپنا
کریں تھے جب حجر سے سینہ کوبی اس کے کوچے میں | وہی پھر بعد مرنے کے ہوا چھاتی کا سنگ اپنا
شب کہ از گرم تپش میرا دل بے تاب تھا | اشک جو آنکھوں سے نکلا قطرۂ سیماب تھا
تجکو منظور اگر زلف کا سلجھانا تھا | کام یہ مجھ سے پریشاں کو فرمانا تھا
اپنی آنکھوں سے شبِ وصل کو جاتے دیکھا | روز بد ہم کو یہ اے چرخ نہ دکھلانا تھا
نہ پایا گلشنِ دنیا سے گل جُز داغِ محرومی | بجائے لالہ میں لختِ جگر لایا ہوں داماں میں
میری وحشت کا تو عالم ہی نرالا ہے حریفؔ | اتنی شورش تھی کہاں قیس بیابانی میں
آئینہ چھوڑ کے دیکھو کسی حیراں کی طرف | تم کو فرصت ہی کہاں اتنی خود آرائی سے
کیونکہ منزل پہ میں پہنچوں گا کہ پاؤں میں حریفؔ | آبلے پڑ گئے ہیں بادیہ پیمائی سے
تو جونت سرگشتہ پھرتا ہے مثالِ گرد باد | اے دلِ وحشی کوئی یہ زندگی کا ڈھنگ ہے

اُن کی رعنائی کا جس دم سے تصور ہے حریفؔ
میرے ہر اک شعر میں اک اور ہی نیرنگ ہے

(فارسی)

اندریں وادی چہ شور کہ وحشت خیز است | حجۂ مغیلاں کہ کشد گوشۂ داماں مرا
حالِ من از طپشِ دل خبرے نیست ترا | وز پر افشانی بسمل خبرے نیست ترا

قیس بے چارہ پسِ قافلہ دم می شمرد    حیف اے صاحبِ محمل خبرے نیست ترا

آمد بہار و یار بسویم نظر نہ کرد    اے وائے نالہ در دل سختش اثر نہ کرد

شد زخمہائے تیغ جفائش نصیبِ غیر    رو با حریف سینۂ خود را سپر نہ کرد

وفا با بے وفا کردم چہ کردم    غلط کردم خطا کردم چہ کردم

ریاض الفصحا صا۱۰، صبح گلشن صا۱۱۵

---

## شیخ ولایت علی حسام لکھنوی

شیخ زین العابدین لکھنوی کے لڑکے اور شاہ حسام الدین کے پوتے تھے۔ مصحفی کے ریاض الفصحا میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "مہذب الاخلاق جوان ہیں۔ موزونی رطبع سے جو کچھ کہتے ہیں وہ میری نظر سے گزرتا ہے۔" اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ کلام یہ ہے ؎

تجھ بن جو کبھو مجھ کو گلستاں نظر آیا    ہر صحنِ چمن گوشۂ زنداں نظر آیا

جاتا ہے دلِ یار وہاں خیر ہو یا رب    جس کوچے میں رستم بھی ہراساں نظر آیا

کھولے جو کبھی بندِ قبا، باغ میں اس نے    ہر غنچۂ گل سر بگریباں نظر آیا

مت پوچھ حسام جگر افگار کی حالت
تجھ بن وہ نہایت ہی پریشاں نظر آیا

---

مال و زر، جاہ و حشم سب رائگاں ہو جائے گا    کارواں زندگی جس دن رواں ہو جائے گا

ہم کو یہ روشن ہے بزم ہستی موہوم سے    ایک دن اپنا سفر بھی شمع ساں ہو جائے گا

پھر گئی اُن کے لیے ساری خدائی ہم سے    لیکن ہم اس پہ بھی سودائے بتاں رکھتے ہیں

عجب رسمِ خریداری یہ دیکھی ہم نے خوباں میں
کہ جب جنس آچکی قابو میں تب تکرار نکلے ہے

ہجر میں ازبس کہ تن اک بارِ سر پہ ہے مجھے
آبِ حیواں کے برابر، آبِ خنجر ہے مجھے

دیکھیے طے کس طرح سے ہو رہِ ملکِ عدم
راہ دور اور طاقتِ رفتار کم تر ہے مجھے

ریاض الفصحا ص ۸۰ ۔

---

## حسن

نام بھی نہ معلوم ہو سکا اور حالات بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ رسالہ معیار لکھنو جلد ۵ نمبر ۲، ۱۹۱۰ء میں ان کا یہ مطلع "حسن شاگرد مصحفی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا ؎

گرم رکھتے ہیں ملاقات بد و نیک سے ہم
تیرے ملنے کے لیے ملتے ہیں ہر ایک سے ہم

مطلع اچھا ہے جس سے اُن کے رنگِ طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک صاحب میر نجف علی تھے جو نجف تخلص کرتے تھے اُن کے کچھ اشعار مصحفی نے ایک بیاض سے اپنے تذکرۂ اول (ہندی گویاں) میں درج کیے ہیں۔ بہاء الدین بشیر نے ان نجف کے ایک لڑکے کا نام میر غلام عباس اور تخلص حسن لکھا ہے۔ جو اپنے والد کے شاگرد تھے۔ شاید یہی حسن ہوں جو نجف کے بعد مصحفی سے اصلاح لیتے ہوں اور اسیر و کاہش وغیرہ کی طرح اُن کے آخری زمانے کے شاگرد ہوں۔ یہ شعر بھی انھیں کا ہے ؎

گھٹا حسرت کی دل پر چھا رہی ہے
ہماری چشم مینہ برسا رہی ہے

---

رسالہ معیار لکھنؤ ۱۹۱۰ء، حاشیہ سخن شعرا مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

# نواب غلام حسین خاں حسینؔ

نواب شیر داد خاں کے لڑکے اور عمدۃ الملک نواب بہادر خاں بانی شاہجہانپور کے پوتے تھے۔ بسنہ ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بڑے ناز ونعم سے پلے بڑھے۔ ذہن کے تیز اور حافظے کے قوی تھے۔ فارسی پر فاضلانہ قدرت حاصل تھی: بچپن سے شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور طبعی مناسبت کی بنا پر آغاز شاعری میں ہی صاف اور بے تکلف اشعار کہنے لگے تھے۔ صاف ستھرے خیالات کو متین، سادہ اور فصیح الفاظ میں ادا کرتے تھے ان کا یہ شعر کافی مشہور ہے ؎

حسینؔ سادہ دل نے وقتِ پیری وائے نادانی
لگایا دامنِ عصیاں میں دھبا پارسائی کا

تاریخ شاہ جہان پور کے مصنف نے حسینؔ کی شاگردی کے معاملے کو الجھا کر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

وہ ابتدا ہی سے بے تکلف اشعار موزوں کیا کرتے تھے کیوں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ کسی نے خوب کہا ہے

شاعری میں کام کیا استاد کا

حسینؔ کے استاد کی تلاش کرنا ایک فعل عبث ہے۔ ص ۲۴۴

لیکن چاند پر خاک ڈالنے سے اس کی روشنی چھپ نہیں سکتی چند ناقابل تردید دلائل جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ایسے ہیں جن کی موجودگی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حسینؔ کو شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ سے تلمذ تھا۔

(۱) عبداللہ خاں ضیغمؔ نے نثار احمد خاں تاقبؔ شاہ جہان پوری کے

سلسلے میں لکھا ہے۔ حافظ کلام اللہ ہیں آنکھوں سے معذور ہیں لیکن اکثر کتب فارسی حفظ یاد ہیں۔ طلبہ کو پڑھاتے ہیں، عربی بھی جانتے ہیں ذکی الطبع ہیں۔ شاہ جہان پور میں اکثر ان کے شاگرد ہیں۔ ان کو نواب غلام حسین خاں مرحوم تخلص حسین جو نواب عبداللہ خاں شاہ جہان پوری کی اولاد میں تھے۔ شاگرد ہیں۔ ان کو میاں مصحفی ہمدانی مرحوم سے تلمذ تھا۔ فارسی و اردو دونوں کہتے تھے۔ قریب چودہ برس کے ہوا کہ اس جہان سے رحلت کی۔ شاہ جہان پور میں ان کے فیض نے بہت اثر کیا۔ (یادگار ضیغم ص ۳۹۷)

(۲) ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے بڑے بڑوں کو گھروں سے نکالا۔ یہ بھی سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بلگرام پہنچے۔ ڈپٹی مرزا عباس بیگ دہلوی، ہمشیر زادۂ مرزا غالب اور مرزا قادر بخش صابر گورگانی بھی یہیں تھے۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کے یہاں ان تینوں بزرگوں کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک روز قدر نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع یہ تھا ؎

دل شرر تھا سوزشِ غم سے اچھل کر رہ گیا
میں جہاں بیٹھا بہ رنگ شمع جل کر رہ گیا

نواب غلام حسین خاں نے اعتراض کیا کہ شمع کے واسطے بیٹھنا نہیں آیا۔ البتہ اٹھنا مسموع ہے۔ قدر نے ان کے استاد مصحفی کا یہ مطلع برجستہ پڑھ دیا ؎

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آس ملائے
گر ہلاتے ہیں زباں جاتے ہیں گردن مارے

(کلیات قدر ص ۳ و ۴)

(۳) شاہ ممتاز علی آہ کا بیان ہے:

۱۲۷۷ھ میں آپ (امیر مینائی) کو محکمہ رجسٹری کا افسر مقرر کر دیا

اور آپ کی جگہ مولوی طالب حسن کو مفتی کا عہدہ عنایت ہوا۔ اب شعر و سخن کا زیادہ چرچا رہنے لگا۔ اس زمانے میں نواب غلام حسین خاں بریلوی[1] شاگرد مصحفی بڑے جوہر شناس شخص تھے۔ فردوس مکانی (نواب کلب علی خاں) نے ان کو لکھا کہ مصحفی کے بعد لکھنؤ کا ایک قادر الکلام مجھے خوش نصیبی سے ملا ہے۔ آیئے تو اس کا کلام آپ کو سنائیں۔

جب وہ آئے تو حضرت (امیر مینائی) کو ان سے ملوایا۔ رئیس موصوف ایک مہینے تک نواب صاحب کے مہمان رہے اور بار بار حضرت سے ملاقات ہوئی اور ہر قسم کا کلام سُنا۔ اس کے بعد نواب صاحب سے کہا کہ منشی امیر احمد تمام اصناف سخن میں ایسے ہی ہیں جیسے میاں مصحفی تھے۔

عمدۃ الملک نواب بہادر خاں اور نواب دلیر خاں دو حقیقی بھائی قنوج کے جاگیردار تھے۔ یہ لوگ چغتا مغل تھے۔ مرشد قلی خاں ترکمان المخاطب مروت خاں ناظم بریلی جب کٹھیر کے علاقے میں مفسدوں اور باغیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور مفسدوں نے مقامی لٹیروں سے ساز باز کر کے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تو بارگاہ شاہ جہانی سے نواب بہادر خاں کو ان کے استیصال کا حکم ہوا۔ اور انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی نواب دلیر خاں کو فوج کا ایک دستہ دے کر گوجروں اور اہیروں کی تنبیہ کے لیے اس علاقے میں جن کی حکومت تھی روانہ

---

[1] تاریخ شاہ جہان پور میں ہے :۔

نواب صاحب کی شوخ اور چلبلی طبیعت نے ان کو نچلا بیٹھنے نہیں دیا۔ بریلی کی منگیا جان طوائف کو دل دے بیٹھے اب بریلی ان کے لیے بازار مصر سے کم نہیں تھی

تیز تر حسن بریلی کا مگر مصر سے ہے ۔۔۔ واں کٹے ہاتھ یہاں قیمہ ہے دل دنیا کا

منگیا کے عشق نے حسین کو شاہ جہان پور کے بدلے بریلوی بنا دیا تھا۔ (ص ۲۴۸)

کر دیا۔ مفسدوں کی شکست فاش اور دلیر خاں کی فتح یابی کے بعد بہادر خاں نے بارگاہ سلطانی سے یہاں پٹھانوں کی ایک بستی قائم کرنے کی منظوری حاصل کر کے شاہ جہاں پورہ کی بنیاد رکھی، یہ واقعہ ۱۰۴۷ھ کا ہے۔ نواب بہادر خاں نے ۱۰۵۹ھ میں انتقال کیا۔

نواب بہادر خاں بہت کثیر الاولاد تھے۔ ان کی سات بیویوں سے دس بیٹے اور اور چھ بیٹیاں تھیں۔ ان کے بیٹوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ نواب دلاور خاں بانی کٹرہ دلاور۔ متوفی ۱۰۶۸ھ

۲۔ نواب عزت خاں۔ المخاطب دلاور خاں۔ متوفی ۱۱۲۰ھ

۳۔ نواب مظفر خاں۔ بانی مظفر گنج۔

۴۔ نواب اختیار خاں۔

۵۔ نواب بختیار خاں۔ متوفی ۱۱۰۰ھ۔ حسین ان ہی کی اولاد میں تھے۔[۱]

۶۔ نواب فتح خاں۔ بانی محلہ فتح پور۔ صوبیدار

۷۔ نواب حسین خاں۔ بانی محلہ حسین پورہ

۸۔ نواب دلیر ہمت خاں۔ متوفی در عہد عالمگیر

۹۔ نواب رحمت خاں

۱۰۔ نواب عزیز خاں۔ بانی کٹرہ عزیز گنج۔

حسین کی شاگردی کا مسئلہ چونکہ اختلافی تھا۔ میں نے حکیم منیر حسن خاں دلؔ مرحوم سے اس معاملے میں امداد کی درخواست کی۔ مرحوم نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ ان الفاظ میں ہے۔

---

[۱] حسرتا نواب خان بختیار ۔۔۔ بود از بس نیک بخت و نیک رو
کرد رحلت کوفت از دار فنا ۔۔۔ "داغ جان و دل" بود تاریخ او

حسین

۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء۔ از شاہ جہان پور محلہ ہاتھی تھان

مکرمی السلام علیکم

جواب میں تاخیر ہوئی، عذر خواہ ہوں۔ تحقیق سے صحت ہوئی کہ نواب غلام حسین خاں حسینؔ شاگرد مصحفیؔ تھے۔ حسینؔ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

حسینؔ سادہ دل نے وقت پیری رائے نادانی
لگایا دامن عصیاں میں دھبا پارسائی کا

غدر ۱۸۵۷ء میں جب بحیثیت ایک باغی کے جج کے روبرو پیش ہوئے اور جج کو یہ ثابت ہوا کہ آپ ایک شاعر کی حیثیت سے ملکی معاملات میں دل چسپی نہیں رکھتے تو اس نے بری کر دیا۔ اُس وقت نواب صاحب نے برجستہ یہ شعر فرمایا۔ ؎

جنبش لب بھی ہوئی جنبش ابرو ہو کر　　کام عیسےٰ کا کیا تو نے ہلاکو ہو کر

جج سخت مزاج اور انگریز تھا۔ مسکرا دیا۔

حافظ نثار احمد خاں عرف بدھن خاں تابؔ غلام حسین خاں حسینؔ کے شاگرد تھے نہایت قابل عروض داں، فارسی و عربی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔

حکیم منیر حسن خاں دلؔ

یہ خط اب سے ۴۵ سال پہلے لکھا گیا تھا ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

نواب صاحب کو آخری زمانے میں پیرانہ سالی، افلاس اور تنگ دستی نے بہت مجبور کر دیا تھا۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کو ان کی تباہی و بربادی کی خبریں پہنچ گئی تھیں، انھوں نے ان کو خطوطِ اشتیاقِ ملاقات لکھے تاکہ اس بہانے سے بلا کر کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ پہلی مرتبہ حسینؔ نے عدیم الفرصتی کا بہانہ کر دیا مگر مکرر لکھنے پہ انکار کو خلاف اخلاق سمجھ کر چلے گئے۔ نواب صاحب نے بڑے عزت و احترام

کے ساتھ مہمان رکھا اور ساٹھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس وظیفے کو بھی انھوں نے اپنے پوتے کے نام منتقل کرا دیا۔

حسینؔ نے غدر کے بعد جو کچھ کہا اس میں غم و اندوہ اور یاس و حسرت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

خوشی شباب کی غم ہو گئی بڑھاپے میں — سحر سے مجھ کو خمار مئے شبانہ ہوا
خیال و خواب تھا جو کچھ کہ ہم نے دیکھا تھا — جو کچھ سنا تھا وہ اس وقت میں فسانہ ہوا
برس رہی ہے مرے دل پہ بے کسی دن رات — شکستہ حال ہوں اُجڑا ہوا دیار ہوں میں

نواب صاحب بڑے منصف مزاج تھے وہ مصحفیؔ کے ساتھ میرؔ کے بھی معتقد تھے اور اپنے زمانے کے دونوں استادوں ناسخؔ اور آتشؔ کو بھی قابل احترام سمجھتے تھے۔ ایک شعر میں اپنے اس خیال کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

بعد میرؔ و مصحفیؔ اس میں نہیں شک اے حسینؔ — ناسخؔ و آتشؔ یہ دونوں لکھنؤ کی جان تھے

حسینؔ کے سن وفات میں اختلاف ہے سری رام نے لکھا ہے کہ ۱۲۹۶ھ تک زندہ تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے ۱۲۹۳ھ میں لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو بیس سال ہوئے گویا اس حساب سے سن وفات ۱۲۷۳ھ ہوا لیکن یہ دونوں بیان صحیح نہیں دراصل ان کا انتقال ۱۲۸۱ھ میں ہوا جیسا کہ حافظ نثار احمد خاں تائبؔ کے اس قطعہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ؎

عیش و نشاط سے مجھے تائبؔ فراغ ہے — دل محو درد ہے تو جگر داغ داغ ہے
اندھیر ہے جہاں میں وفاتِ حسینؔ سے — ہاتف نے یوں کہا کہ "ہوا گُل چراغ ہے"

۱۲۸۱ھ

حسینؔ آخر میں نماز کے پابند ہو گئے تھے خود کہتے ہیں ؎

عبادت سے مجھے اتنی غرض ہے عہد پیری میں — کہ وقت واپسیں رہ جائے پردہ میرے ایمان کا

خط نہ سمجھو کہ یہ اٹھا ہے غبارِ عارض — لیلیٔ چشم ہوئی ناقہ سوارِ عارض
روز عارض ہے تو خط ہے شبِ تارِ عارض — حسن بھی دیکھ چکا لیل و نہارِ عارض
خط جو نکلا ہے تو زلفوں کو پریشاں نہ کرو — آپ طوطیٔ شکر خا ہے شکارِ عارض
خط نورستہ کی تقویم سے روشن یہ ہوا — کہ حنائی سرِ ناخن ہے بہارِ عارض
زلف کی بھول بھلیاں میں پڑا ہے کیسا — بھول کر پیک نظر راہِ دیارِ عارض
روئے گلگوں سے مرے گل کے ٹپکتا ہے عرق — انجم افشاں ہے یہاں صبح بہارِ عارض
اُس سے تشبیہ کوئی حسن میں دے کس کو حسینؔ — مہر ہے ننگ جبیں ماہ ہے عارِ عارض

---

بُتوں نے مومنوں کے دل میں جا کی — خدا کی عرش پر نوبت بجا کی
سناؤں گا دلِ نالاں کو رو کر — کہانی آہِ حاجت نا روا کی
جہنم میں پڑے گلزار فردوس — مجھے خواہش نہیں کچھ ماسوا کی
مرے اعمال ہیں رونے کے قابل — خدائی سال ہا مجھ پر ہنسا کی
بندھی چوٹی تری اے فتنہ پرداز — پریشاں کر دی جمعیت بلا کی
شبِ خوں لائیں گی اک دن کسی پر — سیاہی سرمہ کی سُرخی حنا کی

خوش آہنگاں فارس جانتے ہیں
نوا سنجی حسینؔ بے نوا کی

---

(فارسی)

اے ظہور تو لوِ نا سخ ادیانے چند — افگند زلزلہ نام تو بہ ایوانے چند
جنس کاسد بکفِ یوسفِ کنعاں اُفتاد — چیدہ حسن تو بہر ناحیہ دوکانے چند
گو بیک جلوہ زجا میرود از خرمن حسینؔ — برق در خرمنش افتاد بجولانے چند

---

بسوزد خرمنِ گل، آتشیں روئے کہ او دارد — فزند سیلی بہ سنبل، عنبریں موئے کہ او دارد
نگاہِ مستِ نازش ہم عنانی با اجل دارد — مسیحائی کند لعل سخن گوئے کہ او دارد

زباں در کام می دزد و سناں پیش نگاہ او  
کند خم گردن شمشیر ابروے کہ او دارد

حسینے از نقد جاں داری تو سودا کن کہ من گفتم  
قیامت می فروشد قد دل جوئے کہ او دارد

نگہش گوشہ نشیں است و جہاں شد برہم  
عالمے گشت و خدنگش بکمان است ہنوز

میں تو تدبیر میں تھا زخم جگر کی مصروف  
دل بھی پہلو میں تپاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

آگے ملنے کی کوئی راہ نکل آئے گی  
بیقراری تو مجھے اس کے تو در تک پہنچا

تشنۂ آب دم خنجر ہیں بسمل اور بھی  
دستِ نازک کو ذرا تکلیف قاتل اور بھی

سراپا سخن ص ۱۲۸، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۴۷، روز روشن ص ۱۷۸، نگارستان سخن ص ۲۴، تاریخ شاہجہاں پور حصہ دوم ص ۲۴۳، کلیات قدر بلگرامی ص ۴، یادگار ضیغم ص ۳۹۷۔ بزم سخن ص ۱۴

## اشرف علی خاں خاںؔ

نواب محمد علی خاں وزیر عہد احمد شاہ ابن روشن الدولہ نواب روشن خاں کے لڑکے تھے۔ ان کا تعلق افغانوں کے خٹک قبیلے سے تھا۔ نواب محمد علی خاں اور مصحفیؔ کے درمیان مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانے سے بہت گہرے تعلقات تھے اس لیے انھوں نے اپنے لڑکے اشرف علی خاں کو مصحفیؔ کی شاگردی کی ہدایت کی۔ خاںؔ نے اپنی فطری ذہانت اور طباعی سے چار پانچ سال کی مدت میں اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ ساتھیوں سے آگے نکل گئے۔

سرورؔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ سے وہ دہلی واپس آ گئے تھے اور یہاں اپنے مکان پر محفل مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۲۲۱ھ سے قبل کا ہے۔ کیونکہ آخر عمر میں وہ لکھنؤ میں موجود تھے اور جراز الدولہ ضیغم الملک نواب ہادی علی خاں آشفتہؔ

آشفتہ قائم جنگ کی سرکار سے وابستہ تھے ان کے دیوان میں یہ شعر موجود ہے ؎

خاںؔ رہے شاد یہ نواب جراز الدولہ
اور فزوں جاہ و حشم اس کا بصد شاں ہو وے

خاںؔ کا ایک قلمی دیوان ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانے میں ہے جس میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ اس کا نام "دفتر گلزار" ہے یہ اُن کا تیسرا دیوان ہے۔ اس پر ایک مضمون ڈاکٹر عندلیب شادانی کا شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں ہے جس کا نام "چار باغ" ہے اور اس کی ابتدائی ابیات سے پتا چلتا ہے کہ خاںؔ نے شادی نہیں کی تھی۔

خاںؔ کے ایک دیوان کا مخطوطہ عندلیب شادانی مرحوم کے ذخیرہ کتب میں ہے یہ دیوان اول ہے۔ جو مصحفی کے انتقال کے بعد کتابت ہوا۔ اس دیوان میں پانچ قصیدے منقبت کے ایک نواب نصیر الدین حیدر کی تعریف میں، ایک مرزا سلیمان شکوہ کی تعریف میں ہے، ایک شہر آشوب ہے جس میں لکھنؤ کے اہل مناصب کی ہجو کی گئی ہے۔ ایک قصیدہ ہجویہ راجہ گنیش پرشاد کے بارے میں ہے اس راجہ کی ہجو میں ایک مخمس بھی ہے جس کی زبان فحش ہے۔ غزلوں کی تعداد (۳۰۲) اور اشعار تقریباً پونے چار ہزار ہیں۔ گیارہ رباعیاں، تین مخمسے، ایک مسدس ترکیب بند۔ دو واسوخت، ایک مثنوی اور دس قطعات تاریخ ہیں جن میں مصحفی کے انتقال کا قطعہ بھی ہے۔ یہ دیوان ۸ صفر ۱۲۵۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک نظم اور بھی ہے جس کا نام "سمرن خاک پاک" رکھا ہے اس میں ۱۳۳ اشعار ہیں جو ایک سیہ پوش حسینہ پر فریفتہ ہونے کے باعث محبوبان سیاہ پوش کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ خاںؔ مشاعرہ کا انعقاد بھی کرتے تھے یہ ہر مہینے کی سات تاریخ کو ہوتا تھا اس مشاعرے کی تعریف اپنے ایک قطعہ میں اس طرح کی ہے ؎

مشہور کیوں نہ ہووے یہاں کا مشاعرہ
دل خوش کرے ہے پیر و جواں کا مشاعرہ

سُننے ہیں اچھے شعر تو جانا ضرور یار
کل ساتویں کو ہووے گا خاںؔ کا مشاعرہ

ناصر نے ان کے بارہ شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن میں جرأت الدولہ آشفتہ اور محمد جان مشفق اچھے لکھنے والے تھے۔

الفت میں جفاکار وہ پُرفن نظر آیا
سمجھے تھے جسے دوست وہ دشمن نظر آیا

آنے کو کہا صبح کو تا شام نہ آیا
وعدہ پہ کبھی وہ بُتِ خودکام نہ آیا
کیا ضد ہے بُتِ شوخ کو مجھ سے کہ پسِ مرگ
ہمراہ جنازے کے بھی دو گام نہ آیا
یاروں سے شکایت یہ قیامت میں کروں گا
تنہائی مرقد میں کوئی کام نہ آیا
شب ناز بہت کرتا تھا مہتاب فلک پر
افسوس کہ وہ ماہ لبِ بام نہ آیا
پامال کیا خاؔق کو جو یوں تو نے ہیرا کر
کچھ ترس تجھے گردشِ ایام نہ آیا

سیہ ہے تیرگیٔ جرم سے سارا بدن میرا
وہ مجرم ہوں، نہیں چھوٹے گی مٹی سے بھی کفن میرا
ختن والوں سے نکہت تیرے گیسو کی یہ کہتی ہے
کرے تو سامنا اگر ذرا شک ختن میرا
چلو پھر فصل گُل آئی ہے گلشن میں تماشا ہے
کہ وہ تازہ ہوا پھر ان دنوں زخمِ کہن میرا

خاؔق نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے دلّی کو بہت یاد کیا ہے ؎

پہنچا دے خاؔق کو دلّی میں پیرِ فلک تو پھر
اس کے مزے کو دل سے بھلایا نہ جائے گا

اگر دلّی کے محبوبوں کی صحبت یاد آتی ہے
عجب عالم نظر آتا ہے اے خاؔق مجھ کو اس دل کا

اُبلی میں اُن کی کُرتیاں اے یہ کیا نرالیاں
دے گئیں میرے دل کو داغ نیل کے کپڑے والیاں

تحقیق کی روشنی میں ص ۱۲۷

ہوئی ہے زردیٔ رُخ کچھ تو چہرے پہ میاں خاؔق جی
جو کوچے کوچے چرچا کرتے ہیں سب مرد و زن میرا

مانندِ شمع تو رہے روشن خدا کرے
کاٹا جو تو نے سر تو سبک سار میں ہوا

اے داغِ سینہ، باعثِ شہرہ ہوا ہے تو
مانند لالہ سب میں نمودار میں ہوا

کھلائیں گے کبھی ہیرا یہ پیارے پیارے دانت
بنائیں گے مجھے فیروزہ اب تمھارے دانت

تری جدائی میں کس دن نہیں کیا افسوس  ہمارے لب کے عوض ہی رہے ہمارے دانت
دہن کے عشق نے خاموش کر دیا مجھ کو  کھُلے نہ صورتِ تصویر، غم کے مارے دانت
نمود صورتِ بسم اللہ ان سے ہے اے خاںؔ  کریں نہ شیخ سے پھر کس طرح اشارے دانت

---

ڈُ ابھی سے تو نہ اُس بُت کی طرف داری کر  مجھ سے ہو جائیو اے دل تو جُدا میرے بعد
جا کے کہہ دیوے کوئی خاںؔ کی زبانی اتنا  اب نہیں آتے ہو! پھر آؤ گے کیا میرے بعد

---

اے خاںؔ غم فراق میں تم زہر کھا مرو  اس کے سوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

---

ہے عجب شکل میری صورت کی  مصحفِ رُخ سے جو محبت کی
یا مروّت کہوں بھلا کیوں کر  آپ نے مجھ سے کب محبّت کی
کیا فسانہ تجھے سُناؤں میں  اک کہانی ہے یار فرقت کی
بس کہ ہیں مبتلا ہم اک گُل کے  بلبلوں نے ہماری عزّت کی
خاںؔ میاں ڈھونڈوں کیا لباسِ خوش  میں نے ہر بات میں قناعت کی

---

بے اختیار یاد تو آیا ہے میری جان  جب اچھی شکل راہ میں کوئی نظر پڑی

---

دے مت اسے سزا تری عصمت گواہ ہے  آنکھیں گناہگار ہیں، دل بے گناہ ہے

---

آنکھوں سے نیند اُڑ گئی یا رب میں کیا کروں  دیوانہ کر دیا مجھے تعبیر خواب نے

---

نام تیرا ہے گو کہ اشرف خاں  سب سے بدتر جہان میں تو ہے

---

میں نکل جاؤں کہاں دستِ دلِ ناشاد سے  مردم ہمسایہ نالاں ہیں مری فریاد سے

---

دیوانگی میں بھی مجھے اتنا تو ہوش ہے  تصویر کی پسند تو تیری پسند کی

---

کبھی کاٹا گلا خنجر سے اگہہ تیغ دو آبی سے  مجھے قاتل نے مارا دیکھنا کس کس خرابی سے

---

(رباعی)

میں نے جو کہا کہ او ستمگر گمراہ  وقت میں ترا کہتا ہے لب پہ آہ آہ
ٹھہرائے وصال کی، تو مُڑ کر بولا  لاحول ولا قوّت الّا باللہ

---

تذکرہ ریاض الفصحا ص۹۰ ، عمدہ منتخبہ ص۲۵ ، سراپا سخن ص۱۴۰
گلشن بے خار ص۶۵ ، گلشن ہمیشہ بہار ص۱۲۶ ، خوش معرکہ اول ص۴۷۲
طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۶۵ ۔

---

## خرّم ۔ امام الدین احمد

خلف الرشید شیخ رضی الدین عرف غلام مرتضیٰ سہروردی خلف حافظ جلال الدین سہروردی کے بزرگوں کا وطن سودہرہ تھا جو گجرات (پنجاب) کے مضافات میں واقع ہے لیکن وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے ۔ فارسی دانی وسلیقۂ نظم میں منفرد اور نظام خاں معجز کے اچھے شاگردوں میں تھے ۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دہلی سے سہسوان آئے جہاں درس و تدریس کا مشغلہ تھا ۔ خرّم کی پیدائش بھی دہلی میں ہوئی تھی ۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا ۔ ان کے والد نے نہ صرف تعلیم و تربیت بہتر طور پر کی بلکہ فارسی کلام کی اصلاح بھی کرتے رہے اور یہ سلسلہ تقریباً بیس سال جاری رہا ۔ اپنے والد کے ساتھ جب لکھنؤ آئے تو اردو میں فکر سخن کا خیال پیدا ہوا ۔ یہاں مصحفی موجود ہی تھے ۔ جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اس لیے انھیں کی طرف رجوع ہوئے ۔ وہ جوان صالح اور مہذب الاخلاق تھے ۔ شاگرد ہو جانے کے بعد مصحفی کے راسخ الاعتقاد تلامذہ اور خیر خواہ شاگردوں میں گنے جانے لگے ۔

مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کے صرف فارسی کلام کا انتخاب دیا ہے ، اردو کا کلام نہیں دیا ۔ البتہ نسخۂ رام پور میں اردو کا ایک شعر درج ہے جسے یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

قیس کی طرح نہ کیوں چاک گریباں کرتے
ہم بھی عاشق تھے نہ کیوں خاطر یاراں کرتے

فارسی کلام کا انداز یہ ہے ؂

بیزار گشت کعبہ و دیر از گناہ من | اکنوں بجز در تو نباشد پناہ من
زاں نیلی است چادر گردوں کہ در ازل | عکسے فتادہ بود ز بخت سیاہ من

تا کجا از دل کشم ایں نالہ ہائے سرد را | یا بمہماناں جاں رساں و یا بدرماں درد را
تا دور ہر جا کہ خواہد در جہاں چوں گرد باد | ما بدست باد بسپردیم مشت گرد را

مرا بہ آں دہن تنگ یک سخن باقیست | جہاں بکام رسید است و کام من باقیست
نہ بے سبب پر پروانہ در لگن ماند است | نشان سوختن شمع انجمن باقیست

ریاض الفصحی ۔ صہ ۸۸ — روز روشن صہ ۱۹۴، ۱۹۵

---

## خلیق ـ میر مستحسن

میر حسن مصنف مثنوی سحرالبیان کے خلف دوم اور میر ببر علی انیس کے والد بزرگوار تھے ۔ خلیق فیض آباد میں پیدا ہوئے کچھ مدت وہیں تعلیم پائی پھر لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے آئے ۔ سولہ برس کی عمر ہو گئی تو شعر کہنے لگے اور غزل گوئی سے ابتدا کی ۔ اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے ۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ میر حسن مثنوی سحرالبیان کی تکمیل میں مصروف تھے ۔ اور ہونہار بیٹے کی غزل درست کرنے کے لیے وقت نہ ملتا تھا ۔ وہ اپنے نوجوان بیٹے کو پہلے میر تقی کے پاس لے گئے اور استدعا کی کہ وہ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں ۔ میر تقی نے کہا " اپنی ہی اولاد کی تربیت نہیں ہوتی غیر کی اصلاح کا کسے دماغ ہے " ۔ یہ جواب سن کر میر حسن نے ان کو مصحفی کے سپرد کر دیا مصحفی لکھتے ہیں ؛

در آں ایام فقیر تازہ وارد ایں شہر بود مشارٌالیہ (میر حسن) بعد ملاقات چند بسیار محظوظ شدہ برائے از دیاد بنائے خلت وداد آں عزیز (خلیق) را فرستادہ آموختہ

کردکہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند اکنوں کہ فرصت وقت است نامے توانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ مومی الیہ (خلیق) انقیاد امر والد ماجد را واجب شمردہ برہنمونی شوق روز افزوں اکثر حاضر می باشد و مشورہ ازمن می گرفت۔

مصحفی نے خلیق کے شاگرد ہوتے وقت ہی اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آگے چل کر اپنے فن میں بے نظیر ہوں گے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

"بندہ طبیعتش مناسب شعر دریافتہ۔ درہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت"۔

ابھی مصحفی کی شاگردی کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ خلیق نے غزل گوئی ترک کر کے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ میر حسن کی وفات کے وقت ان کا قیام فیض آباد میں تھا جب آصف الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں فیض آباد کو خیر باد کہا اور لکھنؤ کو دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہوئی تو ان کا آنا جانا لکھنؤ کا زیادہ رہنے لگا۔ اکثر رؤسا و عمائد یہاں آچکے تھے۔ مرثیہ خوانی کے لیے خلیق لکھنؤ آتے اور جو کچھ ملتا واپس جا کر اہل و عیال کی پرورش میں خرچ کرتے۔ انھیں دنوں کا واقعہ ہے کہ میرزا میر تقی خاں ترقی نے فیض آباد میں ایک مشاعرہ کیا۔ خلیق تو فیض آباد میں تھے ہی لکھنؤ سے خواجہ آتش کو بلایا۔ مشاعرہ میں خلیق کی غزل خوانی کا نمبر پہلے آیا اور جب انھوں نے یہ مطلع پڑھا ؎

مثل آئینہ ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو بقول آزاد آتش نے اپنی غزل چاک کر دی اور کہا کہ جب فیض آباد میں اس پائے کا شاعر موجود تھا تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں آزاد کہتے ہیں۔ میر خلیق مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے وہ مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے اور ہمیشہ محاورہ اور لطف زبان کو خیالات دردانگیز کے ساتھ ترکیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے

اور یہ جوہر اس آئینہ کا کافی اور خاندانی وصف تھا۔ ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ اور واداہ کے نالہ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا۔

آخر ایک وقت ایسا آیا کہ آئے دن کے جھگڑوں سے بچنے کے لیے خلیق اہل و عیال کو لکھنؤ لے آئے اور پیر بخارا میں رہنے لگے۔ اب میر مظفر حسین ضمیر بھی میدان مرثیہ گوئی میں آ چکے تھے ان دونوں بزرگوں نے جو ایک ہی استاد کے شاگرد تھے لکھنؤ میں اپنے کمال کا سکہ بٹھا دیا۔

میر خلیق محاورے کے اتنے پابند تھے کہ بعض اوقات الفاظ کو اس صورت میں ہی نظم کر جاتے تھے جس طرح رواج میں آ چکا تھا اور لغوی حیثیت کی طرف نظر نہ کرتے تھے۔ لیکن اُن کے مخالف اس بات کو اُن کے عدم علم پر محمول کرتے تھے۔ خلیق نے شاہزادہ علی اصغرؑ کی شہادت کے مرثیہ میں ایک جگہ لکھا کہ عالم بے آبی میں پیاس کی شدت سے اُنھیں غش آ گیا۔ کچھ لمحات کے بعد آنکھ کھولی تو مہربان والدہ نے

لیلاف پڑھی اور اُسے دودھ پلایا

نکتہ چیں تو تاک میں رہتے ہی تھے کسی نے یہ مصرع ناسخ کے سامنے جا کر پڑھا۔ ناسخ نے کہا کہ نہیں یوں کہا ہوگا

پڑھ پڑھ کے لایلاف اُسے دودھ پلایا

یہ بیان آزاد کا ہے اور یہاں بھی انھوں نے حسب عادت ڈنڈی ماری ہے۔ کیونکہ ناصر نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

ایک دن وہ شاعر ائمہ ہدا شیخ ناسخ کی صحبت میں گیا اور حسب استدعا۔ ایک بند مرثیہ کا پڑھا کہ اس میں گرہ یہ تھی۔

لیلاف پڑھی اور اُسے دودھ پلایا

شیخ نے کہا آپ نے آیۂ کلام اللہ کو غلط باندھا ہے۔ میر صاحب نے کہا۔ بہ ضرورت شاعری کے وہ نہ آ سکا۔ شیخ نے کہا کیا دشوار ہے۔ یوں کہیے:

پڑھ پڑھ کے لا یلاف اُسے دودھ پلایا

میر خلیق کا طرزِ کلام اور اندازِ تخاطب دیکھنے اور سُننے سے لائق تھا۔ زبان کی خوبی۔ جذبات کی بلندی محاورہ کا استعمال تمام خوبیاں ان کے کلام میں موجود تھیں لکھنؤ میں ان کی اور ان کے گھرانے کی زبان کو مستند سمجھا جاتا تھا۔

میر خلیق وطن سے باہر کم جاتے تھے اُن کے صرف ایک سفر کا پتا چلتا ہے جب وہ فیض آباد سے فرخ آباد گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ۱۲۴۰ھ کا ہے جس کا اظہار نواب سید محمد خاں رندؔ نے کیا ہے۔ جو پہلے شاگرد میر خلیق کے تھے اور فیض آباد سے لکھنؤ آنے کے بعد خواجہ حیدر علی آتشؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔

آخر ۱۲۶۰ھ کو اس نامور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں نے وفات پائی۔ سید علی اوسط رشکؔ لکھنوی کا یہ قطعۂ تاریخ ہے ؎

میر مستحسن خلیق افسوس      بس عطوف و شفیق بود اُستاد
خوش بیاں شاعر زباندانی      خاص در ایں طریق بود استاد
رشکؔ نالید و گفت تارنجش      ہائے اے ہے خلیق بود استاد
۱۲۶۰ھ

اور خواجہ مصاحب علی راوؔی لکھنوی شاگرد مرزا مہدی کوثرؔ نے یہ قطعہ تاریخ تصنیف کیا ؎

میر خلیق نکتہ سنج دارِ فنا کو چھوڑ کر      خلق کے دل پہ کوہ غم اپنے الم کا دھر گئے
راوؔی خستہ حال نے فکر جو نظمِ غم سے کی      ہاتف غیب نے کہا "میر خلیق مر گئے"
۱۲۶۰ھ

یاد رہے کہ راوؔی کے قطعہ تاریخ میں مرگئے کے ہمزہ کے عدد شمار نہیں کیے گئے ہیں اور اس کو بعض اساتذہ نے غلط قرار دیا ہے۔

میر خلیق کے تین لڑکے تھے۔ میر انیسؔ، میر اُنسؔ اور میر مونسؔ۔ میر انیسؔ کے خاندان میں اُن کے لڑکے میر خورشید علی نفیسؔ اور پوتے میر خورشید حسن عروجؔ نے اچھا نام پایا۔ میر اُنسؔ کے

اخلاف میں میر وحید نام و نمود کے شاعر ہوئے۔ میر مونس کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، اُن کی یادگار اُن کے شاگرد ہیں جن میں میر انور حسین آرزو لکھنوی کے والد میرزا کرحسین یاس اور میر بہادر حسین خاں انجم مشہور ہیں۔ یہ دونوں بھی مونس کی وفات کے بعد بالترتیب حکیم ضامن علی جلال اور منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے تھے۔

خلیق صاحب دیوان شاعر تھے مگر مرثیہ گوئی کے بعد کلام عاشقانہ کو ضائع کر دیا۔ مختلف تذکروں سے جو کچھ ملا اُسے یہاں درج کیا جاتا ہے اور یہ سب اُن کی ابتدائی مشق سخن کا نتیجہ ہے۔

کوچۂ جاناں ہمارا اب تو مسکن ہو گیا — خار و خس اس رہگزر کا فرش گلشن ہو گیا
دست لیلیٰ، غم کے ہاتھوں سے ہوا نشتر زدہ — قیس کا وادی میں خوں سے سُرخ دامن ہو گیا
کل تو تھی اس میں محبت اور ملنساری کی بُو — کس نے بہکایا جو ایسا آج دشمن ہو گیا
کس کی گلگشت چمن ہے ان دنوں میں اے خلیق — رشک سے جس کے گلوں کا چاک دامن ہو گیا

ٹیکے کی پھبن یوں ہے جبیں پر تری گلرو — پروین ہو جیسے مہ تاباں کے برابر
اب دستِ حنائی کے تصور میں خلیق آہ — جی ڈوب چلا پنجۂ مرجاں کے برابر

بازیچۂ اطفال ہے جہاں کچھ نہ عجب کر — کیا کیا نہ بگڑ جائے گا کیا کیا نہ بنے گا
نیند اُڑ گئی سُن کر اسے کیا جانتا تھا میں — میرے لیے دشمن مرا افسانہ بنے گا

اشک جو چشم خونفشاں سے گرا — تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا
اس پہ جل بل کے گُل کباب ہوا — مات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو چُور ہو جاتا — کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اُس کو — پھول جو دست باغباں سے گرا
ہنس دیا، یار نے، جو رات خلیق — کھا کے ٹھوکر اُس آستاں سے گرا

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا — دنداں گئے کہ جوہرِ تیغ زباں گیا
گزری بہارِ عمر خلیق اب کہیں گے سب — باغِ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

کہا میں نے جو اے گُل کچھ وفا کر
تو وہیں ہنس پڑا وہ کھلکھلا کر

کس کے خرام ناز کا پامال ہوں خلیق
لگتی ہے چوٹ دل کو مرے ہر قدم کے ساتھ

مسکراتا وہ گل نو جو چمن سے نکلے
منہ ہے کیا بات جو غنچے کے دہن سے نکلے

میں وہ سرگشتۂ صحرائے محبت ہوں خلیق
سالہا سال ہوئے جس کو وطن سے نکلے

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے
جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

دل میں تھا آتے ہی اُس کے، جائیں لگ، آغوش سے
جب وہ آیا سامنے، تب رہ گئے خاموش سے

گر بُرا مانے نہ تو کہہ دوں کہ کیا تجھ میں نہیں
اور سب باتیں ہیں لیکن اک وفا تجھ میں نہیں

بے مروّت ہو تو کیا جانے تو ظالم کیا کرے
اس مروّت پر تو پاس آشنا تجھ میں نہیں

کل جو جا بیٹھا میں اُس کے پاس اُٹھ کر اے خلیق
رُک کے بولا، آدمیت اک ذرا تجھ میں نہیں

نزع میں گر مری بالیں پہ تو آیا ہوتا
اس طرح اشک میں آنکھوں میں نہ لایا ہوتا

میرے خورشید نہ ہوتا یہ مرا روزِ سیاہ
تو نے گر زلف میں مکھڑا نہ چھپایا ہوتا

باغِ جنت میں بھی کیا خوب گزرتی میری
واں بھی سر پہ جو تری زلف کا سایا ہوتا

چوں آئینہ حسرت نے مجھے دنگ بنایا
اللہ نے کیوں دل کو ترے سنگ بنایا

رنت گریہ خونیں سے بھری رہتی ہیں آنکھیں
اس عشق نے آخر یہ مرا رنگ بنایا

غفلت میں فرق اپنی تجھ بن کبھو نہ آیا
ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا

ساقی نے جام مے تو شب پے بہ پے دیا پہ
نیت بھری نہ اپنی جب تک سبو نہ آیا

کوتاہ ہے نہایت دستِ دعا ہمارا
دامن اثر کا جا کر یک بار چھو نہ آیا

پھونکا ہے طور و وادی بارہا اے خلیق لیکن
اپنی شرارتوں سے وہ تند خو نہ آیا

کمر باندھی ہے ہر خندق نے تیری دلربائی پہ
تصدق جان میری اس ترے دستِ حنائی پہ

مزا پایا یہ میں نے جم گیا خوناب ناخن پر / خراشِ زخمِ دل کو چاہیے زہراب ناخن پر
ترا دستِ حنائی پنجۂ مرجاں سے بہتر ہے / نہیں گنتی میں کھاوے رشک گو عناب ناخن پر
نہ سوجھی کوئی انشا قابلِ شان اے خلیقؔ اُس کے / رہا نقطے ہی کرتا میں دمِ القاب ناخن پر

---

مثلِ آئینہ ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو / صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو
جانبِ دل ہے مری آہِ شرر بار کا گھر / روئی کے پہل سے سینکو نہ اِدھر کا پہلو

---

فائدہ کیا ہم اگر زمزمہ پرداز ہوئے / پھنس گئے دام میں جب قابلِ پرواز ہوئے

---

دکھ میں دل دے کے جو روؤں تو سرا طوفاں کے / نوح کو ہووے نہ اپنا ہی سفینا معلوم

---

کب تعلق کا ہمیں آہنگ بے رنگی میں ہے / دلقِ رنگیں بھی یہ اپنا ننگ بے رنگی میں ہے

---

نسخہ نہ لکھ طبیب کہ پینے پہ حرف ہے / تا شام اس مریض کے جینے پہ حرف ہے
دندانِ بخیہ یوں ہیں جراحت سے آشکار / گویا مشدّد اک مرے سینے پہ حرف ہے

---

افعیِ زلف کے کاٹے کی دوا ہو نہ سکی / آگے سر مار گئے سیکڑوں منتر والے
مے کی خواہش ہوئی اُس وقت مجھے اے خلیقؔ / اُٹھ گئے بزم سے جب شیشہ و ساغر والے

تذکرہ ہندی ص ۹۰، عمدہ منتخبہ ص ۲۴۳، مجموعہ نغز ص ۲۳۶، گلشن بیخار ص ۹۶
گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۳۸، خوش معرکہ اول ص ۳۹۶، سراپا سخن ص ۲۴۲، آب حیات ص ۳۷۰

---

## شیخ محمد خلیل خلیلؔ لکھنوی

مصحفی کے پرانے شاگردوں میں ہیں گرمؔ و منتظرؔ کے ساتھ انشاؔ کے معرکے میں شامل رہے اور کیونکہ جو کلام سخن شعرا یا خوش معرکہ زیبا میں درج ہے اس کی زمین وہی ہے جس میں مصحفی، انشاؔ، گرمؔ اور منتظرؔ کا کلام ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ہندی گویاں کی تکمیل کے بعد شاگرد ہوئے

ہوں گے اس لیے اپنے دوسرے استاد بھائیوں کے ساتھ نہ لکھے جاسکے۔ سخن شعرا اور خوش معرکہ کے سوا کسی اور تذکرۂ شعرا میں بھی ان کا نام دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہ

میں وہ سخن آرائے شہنشاہ جہاں ہوں | رعشہ مری ہیبت سے ہے فغفور کی گردن
ٹک گوش خرد رکھ کے مری بات کو سُن لے | روشن میں کہوں جیسے ہو خور، نور کی گردن
جا باغِ زلیخا میں تو اے یوسفِ ثانی | تاباں وہاں پھر دیکھ لے بلّور کی گردن
عرفی نے خموشی کو خموشی کہا ہے | اس سے یہ ہے ماہیِ سقنقور کی گردن
اک بات میں تجھ سے کہوں انصاف تو کیجیو | انسان کو بھی ہوتی ہے کہیں نور کی گردن
جب خوفِ فطانت پہ تری طبع تھی رقاص | تب تجھ سے تماشا بندھی لنگور کی گردن

---

خم کیونکر ہو ایسے بُتِ مغرور کی گردن[۱] | خم کردے جو اک بات میں جمہور کی گردن
جب آگے ترے شمع نے سر اپنا اُٹھایا | گلگیر نے تب اس کی وہیں دور کی گردن
سو تیغ لیے نکلے ہے اک ہاتھ میں خورشید | تا کاٹے جو دیکھے شبِ دیجور کی گردن
ہے تیغ مرے مصرع کی اس طور کی کٹی | اک وار میں سو ٹکڑے کرے سور کی گردن

خوش معرکہ زیبا اول ص۳۶۱ ۔ سخن شعرا ص۵۲

---

# شیخ ذاکر علی ذاکر عثمانی

ذاکر کے دادا کا نام طفیل علی تھا اور یہ خاندان شروع میں لکھنؤ سے آکر بنارس کے قریب قصبہ نارائن پور میں مقیم ہوا تھا۔ جہاں ایک موروثی قبرستان میں ریلوے لائن کے قریب اس

---

[۱] خوش معرکہ میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ "خم کیونکر ہو اُس صاحبِ مقدور کی گردن"

گھرانے کے بہت سے افراد دفن ہیں۔ ان کے والد مولوی فضل علی راج گھاٹ کے قریب محلہ تیلیا نالہ میں سکونت رکھتے تھے۔ ذاکر علی کے علاوہ پناہ علی اور عبداللہ ان کے دو لڑکے اور تھے مولوی پناہ علی فارسی و عربی کے جید عالم تھے۔ ان کے علم و فضل کے پیش نظر مہاراجہ ایسری نارائن سنگھ نے انھیں کنور ادت نارائن سنگھ کا اتالیق مقرر کیا تھا ان کے لڑکے محمد سعید بنارسی شاعر اور ذاکر کے شاگرد تھے۔ مولوی ذاکر علی علم و فضل میں اپنے بھائی پناہ علی سے کم نہ تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں ہوئی تھی۔ "باغ و بہار" سے سن ولادت برآمد ہوتا ہے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں لکھنؤ گئے اور مصحفی کے شاگردوں میں داخل ہو کر فن عروض کی تکمیل کی۔ جعفر حسن خاں فیض، غلام حسین خاں حسین، مظفر علی اسیر اور اولاد علی آتش کی طرح اُن شاگردوں میں ہیں جنھوں نے تذکرہ ریاض الفصحا کی تکمیل (۱۲۳۶ھ) کے بعد تلمذ اختیار کیا تھا۔ اس لیے وہ ان لوگوں کے حالات سے خالی ہے۔ ذاکر کو اُن کے علم و فضل اور شاعرانہ عظمت کی بنا پر دربار بنارس سے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔ بہت سخی آدمی تھے۔ طرز معاشرت بہت سادہ تھا۔ ایک روپیہ بھی اُن کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ شاید ذاکر کی شادی ایک شیعہ گھرانے میں ہوئی تھی یا ان کی بیوی شیعہ ہو گئی تھیں اس لیے ان کے قرابت دار کچھ ناخوش تھے یہی وجہ ہے کہ بیوی کے انتقال کے بعد جس نے ایک لڑکی[1] یادگار چھوڑی تھی۔ ان کی دوسری شادی نہ ہو سکی۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد مرزا رجب علی بیگ سرور مستقل طور پر بنارس چلے گئے تھے اور مرزا سلامت علی دبیر کا آنا جانا بھی اکثر ہوتا رہتا تھا اس لیے ذاکر کے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ بعد میں اس تگڈم میں مرزا قادر بخش صابر کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ عنایت حسین خاں مہجور کہتے ہیں کہ خواجہ محمد عسکری صبا ہمشیرزادہ شیخ مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی اس زمانے میں بنارس میں تھے کچھ دن ذاکر کے مکان پر مقیم رہے تھے پھر ایک ہندو کے بچوں کی تعلیم پر مقرر ہو گئے تھے۔

---

[1] اس لڑکی کی شادی خلیل الدین حسن طاہر بنارسی سے ہوئی تھی یہ شاعر بھی تھے اور ذاکر صاحب سے تلمذ رکھتے تھے

ذاکر نکتہ سنج شاعر، نازک خیال ناظم اور فن سخن کے اچھے ماہر تھے۔ شاعری کے علاوہ طب، موسیقی اور نجوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں وفات پائی اور بنارس کی لاٹ والی عیدگاہ میں دفن کیے گئے۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

دار فانی سے جب گئے ذاکر — کہا رضوان نے ان پہ باغ فدا

کیا ہی تاریخ فوت روشن ہے — گور انور پہ ہے چراغ فدا

۱۲۸۹ھ

ان کے بھتیجے مولوی سعیدالدین سعید بنارسی نے بھی ایک بیت میں سن وفات کا اظہار کیا ہے ؎

گئے باغ جہاں سے خلد کو جب — وہ بارہ سو نواسی ہجری تھا تب

ذاکر اردو کے علاوہ فارسی بھی کہتے تھے، اور بقول مظفر حسین صبا مولوی حیدر قلق بنارسی کے شاگرد تھے لیکن اس تعلق کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہ ہو سکی۔

مرزا الطاف حسین الطاف و ضابط کے علاوہ بنارس میں ذاکر کے شاگردوں کا اچھا خاصا گروہ تھا۔ مغل خاں نگہت بنارسی نے گلزار مسعود میں کچھ شاگردوں کے تخلص گنائے ہیں جنھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ناموں کا اضافہ راقم سطور کا ہے۔

(۱) الٰہی بخش قرین (۲) سیف (۳) عابد (۴) شیدا (۵) تاج (۶) الطاف حسین شمیم (۷) صدیق (۸) رضوان (۹) سراج (۱۰) قاضی تفضل حسین متین (۱۱) خاور (۱۲) جوش (۱۳) اسمٰعیل علی خاں نکہت (۱۴) امیر (۱۵) ہلال (۱۶) عبدالرزاق بیتاب (۱۷) شاعر (۱۸) صغیر۔

ذاکر کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ابھی لکھنؤ میں بس ابھی پٹنے میں کچھ دن بنارس میں رہے۔ طبیعت نہ لگی تو پھر نکل کھڑے ہوئے۔ جوانی کا زمانہ تھا کہ الٰہ آباد پہنچے اور شاہ علی جعفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صاحب خازن الشعرا[1] نے اس ملاقات کا

---

[1] خازن الشعرا شاہ محمد اجمل کے نواسے شاہ علی کبیر عرف میرن جان خلف شاہ محمد جعفر کی تصنیف ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ابھی طبع نہیں ہوا۔

حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

" جوانے است سعادت مند و پسندیدہ خصال بہ ایں سن و سال مثل او صاحب فہم و فراست و عقل و کیاست و متانت و فطانت و تقویٰ بہ نظر فقیر دریں زماں نرسیدہ الحق کہ عدیم النظیر است باوجودیکہ صاحب عیال است لیکن آزادانہ می گزارند واکثر ——— ہنگام ورود الہ آباد درمدح حضرت والدی روح اللہ روحہٗ قطعہ نظم نمودہ بنظر انور گزرانیدہ مورد فراواں تحسین گردید "

اس قطعہ کے چند اشعار یہ ہیں ؎

| | |
|---|---|
| اے بہ ہمت نیست کس ہمتائے تو | آفریں بر ہمت والائے تو |
| چوں تو مہماں دوست دعوت بخش یافت | چوں نگردد میہماں شیدائے تو |
| اے علی جعفر شہ اقلیم خلق | من زخود رفتم ز استغنائے تو |
| میکنم وصفت رقم بے اختیار | کیونکہ در فقر است اعلیٰ جائے تو |
| روح گردد منجلی مثل صفا | از صفاتِ ذات شفقتہائے تو |
| کامہا شیریں کند آفاق را | جرعہا از موجۂ دریائے تو |
| کے بود خفاش طبعاں را خبر | از شعاع آفتاب اندائے تو |
| باد صد میخانہ جوشاں تا ابد | از بقائے ساغر و مینائے تو |
| میرود ذاکر بسے محظوظ و خوش | از نوال میزبانیہائے تو |

اسی تذکرے میں آگے چل کر لکھا ہے :

دراں ایام غزلے بہمیں ردیف و قافیہ (بیان مرا) در مشاعرہ حضرت خال صاحب کمال من شاہ ابوالمعالی المتخلص بہ عالی روح اللہ روحہٗ شدہ بود ایں غزل طرح کردہ۔

| | |
|---|---|
| مبر زخانۂ ما یارِ مہربان مرا | فلک! سیاہ مکن خاک آستانِ مرا |
| بسے شکایت یار است در دلم ترسم | کہ بعد مرگ نہ گویا کند زبانِ مرا |

بشوق لعل لبش ہمچو خونِ خود ریزم کسے بہ لعل اگر بہ کشد دہانِ مرا
جنان بہ عشق تو گرمم کہ خاک خواہد شد گر آفتاب رسد سایۂ مکانِ مرا
کسے کہ داد زبانے کلیم را ذاکر ہمان بجلوہ پنہاں کشد زبانِ مرا

ذاکر بنارس میں آجاتے تھے تو مشاعرہ ضرور کرتے تھے چنانچہ دو مشاعروں کا ذکر عنایت حسنین مہجور بنارسی نے اپنی بیاض میں کیا ہے۔ یہ مشاعرے انھیں کے محلے میں محمد رضا خان کے مکان میں ہوئے تھے۔ طرحیں یہ تھیں ؎

(۱) ہر سرو اس چمن کا اک آہِ بے صدا ہے

(۲) یار ہے گل ہے شب مہتاب ہے گلزار ہے

ذاکر کے فیضِ تربیت سے بنارس اور اُس کے قرب و جوار میں بہت سے کامیاب شاعر نمودار ہوئے جن میں مرزا محمد حسن فائز، مولوی فصیح اللہ خاں نیّر اور حافظ رحمت اللہ بنارسی کے نام خاص طور پہ مشہور ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

ضعف نے زور دکھایا پسِ مردن اپنا اُٹھتے ہی بیٹھ گیا گنبدِ مدفن اپنا

پسیجا سنگِ تربت بس کہ میری آہِ سوزاں سے لحد میں صورتِ زورق ہوا طوفان پانی کا
وہی ہے شعلہ زن چاروں طرف سے دیکھئے جس کو بڑا شہرہ دو عالم میں ہے جس کی لنترانی کا
بڑا خونِ جگر کھانا ہے دل دے کر کسی بُت کو ہمیں سمجھے مزا کچھ اس بلائے ناگہانی کا
زبردستی سے یاروں کی غزل کہنی پڑی ذاکر نہیں موقوف ہو جاتا یہ چرچا شعر خوانی کا

چلتا ہے وہ قیامت اس شوخ نوجواں کا برپا ہے ہر قدم پر اک شور الاماں کا

شب جو نالاں بے کسی سے یہ دلِ صد پارہ تھا آسماں سے خوں فشاں ہر دیدۂ سیّارہ تھا

لیلیٰ کا جب کہ نجد سے محمل نکل گیا آرامِ قیس، لاکھوں ہی منزل نکل گیا

سنتے ہیں جہاں میں نام اُس کا دیکھا نہ کہیں مقام اُس کا
از بسکہ حیا ہے لکنت آمیز پورا نہ سنا کلام اُس کا

کم خندہ و کم سخن کم اشتقاق — ہر کام ہے ناتمام اُس کا
جاں آگئی جان میں ہماری — آیا جو کبھی سلام اُس کا
مل رہے گا ہمیں زمانے میں — جو ہمارے نصیب کا ہوگا

شب جو باتوں میں وہ مہرپیکر بہل کر رہ گیا — رنگ سو سو طرح سے گردوں بدل کر رہ گیا

لالہ صد رنگ پھولا کوہ پہ تو کیا عجب — کوہکن کا خون کیا کیا رنگ ابھی دکھلائے گا

یہی ہے حالِ آہِ سوزاں گریں گے جل کر فلک زمیں پر
یہی ہیں نعرے تو دیکھ لینا کہ حشر ہے حشر تک زمیں پر

یا تو مرہم کر عطا مجھ کشتۂ دیدار کو — یا بدل دے یا الٰہی سینۂ افگار کو
غسل میت اشک سے لیلیٰ نے مجنوں کو دیا — لے گئے آنکھوں پہ آہو لاشِ قیس زار کو

آگ ہوا وہ شمع تجلی غیروں کے بھڑکانے سے — کام ہے اب آغوش میں لینا سیکھیں گے پروانے سے
شیشہ ٹوٹا، یار سدھارا، وحشت ہے پیمانے سے — اے دل کب تک تہا رہیے اُٹھ چلیے میخانے سے
خام خیالی ہے گردوں کی، کیا کیا بن کے بگڑتے ہیں — چشم زدن میں خواب ہوئے کیا کیا لوگ زمانے سے

طولِ شبِ ہجراں سے بھی دو ہاتھ بڑھی ہے — یہ زلفِ مسلسل جو ترے رُخ پہ پڑی ہے

تھا جن کو گراں گردشِ افلاک کا سایہ — لو آج انھیں بھول ہوا خاک کا سایہ
خالِ لبِ شیریں نے نقیہ ایسا بنایا — گولی سا لگا حبۂ تریاک کا سایہ
اس بیع سماوات کی پروا نہیں ذاکر — کافی ہے مجھے پنج تنِ پاک کا سایہ

طوفانِ آتشیں پہ ہے عمرِ رواں مری — شورِ تنور آب زدہ ہے فغاں مری

کہاں گیا مرے زانو سے سر جدا کر کے — ابھی تو سوئے تھے جی ہم خدا خدا کر کے
کمال اگر دش دورِ سپہر کا ہے یہی — رکھا ہے سنگ کو گردش میں آسیا کر کے

فردائے حشر یار سے اقرارِ دید ہے — صبحِ قیامت اپنے لیے روزِ عید ہے

جواہر خانہ زنداں کو کیا ہے چشم پرخوں نے — مری زنجیر پہ نگ جڑ دیے ہیں اشک گلگوں نے

پتلیوں تک خون ہو لختِ جگر آنے لگے ‏ لعل احمر سنگِ موسیٰ میں نظر آنے لگے

---

دل پھر گیا حرم سے اب دیر میں بسا ہے ‏ دل میں صنم صنم ہے لب پر خدا خدا ہے
تو دستِ برہمن سے مارا پڑے گا زاہد ‏ ناقوس اے ستمگر ٹوٹا تو سنکھیا ہے
بیمار تیرے غم میں یوں زرد رو ہوا ہے ‏ اشکوں کا دانہ دانہ تسبیح کہربا ہے

---

فارسی کلام یہ ہے ؎

باد عشق نوجوانِ گلبدن خواہیم کرد ‏ جائے داغ تازہ بر داغ کہن خواہیم کرد
ذاکرا از عذر نزاکت یار اندر خانہ ماند ‏ در رہِ اُو فرش گلہائے سمن خواہیم کرد

---

یارب اثر ہے فغانِ مارا ‏ تا بے دل ناتوانِ مارا
اے جبل اگر کنیم آہنگ ‏ گُل گوش کند فغانِ مارا

---

ایک قصیدہ جو مرزا محمد عالی قدر کی مدح میں لکھا تھا۔

ہوائے کوئے اصفانش بہار روضۂ رضواں ‏ صفائے روئے تابانش نگارِ صفحۂ قرآں
نسیم عنبر آگینش چمن را زینت و رونق ‏ شمیم زلف مشکینش ختن را حجت و برہاں
شجاعت جا کر جاہش، شجاعت ذرۂ راہش ‏ عدالت فرش درگاہش سخاوت بندۂ احساں
لبش لعل بدخشانے، قدش سرو خرامانے ‏ رخش مہرِ درخشانے دہانش چشمۂ حیواں

---

جہاں را گر نباشد حکم عدل او خبر گیراں ‏ معاذ اللہ بہ یک دم خانۂ ہستی شود ویراں
زباندانان فرو شند از برائے مدحِ ذاتِ او ‏ بہندوستان زبان فارسی و ہندی در ایراں

---

زِ فیض او کہ سنگ و سیم بلد و ہمہ گر بیماں ‏ شرر در سنگ و خاکستر میان سیم شد پنہاں
بعہدش نیست نام سنگ غیر از سیم حیرانم ‏ دل سیمیں بر ان سنگیں چرا باشد بدیں عنواں
سحاب مکرمت، بحر حقیقت، معدن ہمت ‏ دماغ دانش و مہر درخشاں مطلع ایماں
وحید العصر یکتائے زماں، فخر بنی آدم ‏ فرید الدہر دارائے جہاں سر دفتر شاہاں
جناب مستطاب اعنی ہمیں سلطان عالی قدر ‏ الٰہی تا قیامت زندہ باد آمیں بگو ایجاں

لہ المنۃ کہ از مہر سکوت مدعی پوشد — یگانہ دعوئ یکتائی من زیور برہاں

مرا در زیر فرماں است، اقلیم سخندانی — فصاحت رامنم سلطان، بلاغت رامنم خاقاں

سروش غیب ہر دم خشانۂ فکرم دہد ذاکر

بسود گر تحفہ بفرستم زہند ستاں سوئے ایراں

روز روشن ص۲۲۷،

سخن شعرا ص۱۶۴، بزم سخن ص۵۱، خمخانہ جاوید سوم ص۲۲۷ نوائے ادب

سخنوران بنارس اول ص۱

---

# میاں بشارت اللہ ذاکر

اصل نام تو میاں بشارت اللہ ہی تھا مگر معروف محمد ذکریا کے نام سے تھے۔ شیخ ہدایت اللہ کے بیٹے لسبود ضلع سیتاپور کے باشندے اور قدوائی قبیلے کے فرد تھے۔ فارسی و عربی کی تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس سے گزر اوقات کرتے تھے۔ قصائد عرفی انھوں نے شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے پڑھے تھے اور اسی زمانے میں شعر و شاعری کی طرف رغبت ہو گئی تھی جس میں مصحفی ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مصحفی نے ان کی خوش اعتقادی اور خلوص کی بڑی تعریف کی ہے لیکن اشعار صرف دو درج کیے ہیں جنھیں یہاں درج کیا جاتا ہے مزید کلام نہ مل سکا:

دیکھی جو اس کے ابروئے خمدار کی شبیہ — آنکھوں میں اپنی پھر گئی تلوار کی شبیہ

تری چشم شوق سے کب بشر کوئی چشم اپنی ملا سکے — جو نگاہ بھر تو نظر کرے تو پری بھی پر نہ ہلا سکے

ریاض الفصحا ص۹۶

---

# مرزا امان علی خاں ذبیح

خلف مرزا ابراہیم علی خاں خلف مرزا یوسف علی خاں ابن علی محمد خاں۔ ان کے آباد اجداد اصفہان کے باشندے تھے۔ مرزا علی محمد خاں مذکور شاہ عباس صفوی شاہ ایران کے عہد میں خوش نویسی پر مامور اور کتب خانہ شاہی کے تحویل دار تھے۔ یہ خاندان اصفہان سے کب آیا اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن ہندوستان وارد ہونے کے بعد ذبیح کے بزرگوں نے آگرہ میں قیام کیا۔ ذبیح کی پیدائش یہیں ہوئی اور یہیں نشو ونما اور تعلیم و تربیت حاصل کی جوان ہونے کے بعد آب و دانہ نے عظیم آباد پہنچایا جہاں وہ محلہ مغل پورہ میں سید راجہ کے پل کے پاس نواب مہدی علی خاں کے مکان کے عقب میں رہتے تھے۔ اہل عظیم آباد سے تعلقات بڑھے تو ایک رئیس کی لڑکی سے شادی کر لی اور سکون و اطمینان سے رہنے لگے۔ آغاز جوانی ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا اسی ذوق نے عظیم آباد میں گوشہ گیر نہ رہنے دیا اور نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے۔ مصحفی کا یہ آخری دور تھا وہ تذکرہ ریاض الفصحا مکمل کر چکے تھے اور شہر میں اُن کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا یہ بھی انھیں کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ کئی سال لکھنؤ میں رہے اور ناسخ و آتش کے مشاعروں میں شرکت کی۔ اس کے بعد بیس پچیس سال پٹنے کی ادبی مجالس کی زینت بنے رہے۔ بیاض مہجور سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح رجب ۱۲۷۲ھ میں اپنے ایک دوست قائم علی خاں ابن میر عبداللہ خاں دیوانہ کی ہمراہی میں نوچندی کے میلے کی سیر کی غرض سے بنارس پہنچے تھے یہیں ان کی ملاقات عنایت حسین خاں مہجور نبیرہ نواب علی ابراہیم خاں سے ہوئی جن سے مساویانہ تعلقات آخر وقت تک قائم رہے۔ ناظر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی ان کے مخلص احباب میں تھے۔ اور برابر سلسلہ خط و کتابت جاری رکھتے تھے۔

اُبتدا اس ذبیح کا مسلک اثنا عشری تھا بعد میں بتوفیق الٰہی اہل سنت و الجماعت میں شامل ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۲۵۳ھ کا ہے مولوی انور علی یاس عظیم آبادی نے اس تبدیلی اعتقاد کی یہ تاریخ

لکھی ہے ؎

سرآمد جملہ مرزایاں کہ نام امان علیست او را
تخلص او ذبیح باشد بظاہر لکن بباطن انطق

بمسلک شیعیان ہمی زد قدم ولے از ہدایت غیب
باختیار طریق اہل تسنن آخر چو شد موفق

ز طبع مسرور خویش جستم چو سال ادراک ایں سعادت
ز روئے ایقان گفت ہاتف "مبارک اقبال مذہب حق"

۱۲۵۳=۱۲۵۴-۱ھ

ذبیح بڑے خوش مزاج اور ظریف تھے اور زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں غزل پڑھنے سے متعذر رہا کرتے تھے۔ اسی رعایت کی وجہ سے انھوں نے ہکلوں کی زبان میں بہت سی غزلیں کہی تھیں۔ جو بہار کے بہت سے علاقوں میں زبان زد عوام و خواص ہیں۔ یہ شعر انھیں کا ہے ؎

ہ ہ ہجر میں تمھارے پھ پھ پھٹ گیا کلیجہ
مُ مُ مدتیں گزر گئیں پہ پہ پاس تم نہ آئے

مزاج میں وارستگی تھی۔ پٹنے کی ایک زن بازاری "لاڈو" کے یہاں آمد و رفت زیادہ رکھتے تھے۔ ذبیح فارسی و اردو دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی اور عظیم آباد میں دفن ہوئے۔ مولوی احمد کبیر حیرت نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے ؎

نکتہ سنج و بذلہ پرداز و سخن ساز و محقق
ہم ز تلمیذ جناب مصحفی با عز و تمکیں

یعنی امان علی شاعر تخلص بہ ذبیحش
اصل قومش میرزائی طبع صافش نور آگیں

بود در تال یعنی ضرب موسیقی مکمل
در فن کشتی و ہم در آشنائی ہمچو پیشیں

بود استاد من اے حیرت بہ نظم خاص اردو
چوں نہ سازد صدمہ ترحیل آں ممدوح غمگیں

گفت صوری معنوی قلب عطارد سال نقلش
از سن ہجری ہزار و دو صد و ہفتاد و نہ ہیں

۱۲۷۹ھ

ذبیح کے ایک شاگرد تو مولوی احمد کبیر حیرت پھلواروی تھے جن کا قطعہ تاریخ وفات اوپر درج کیا گیا ہے ایک اور شاگرد مولوی عبدالکریم خاں تسلیم تھے جو ان کی وفات کے بعد مولوی وحید الدین وحید کرودی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ایک شاعرہ بھی تھیں جن کا نام امیر النساء اور تخلص غریب تھا۔ وہ میر برکت علی عظیم آبادی

کی لڑکی ذبیح کی ہم محلہ تھیں یہ ابتدائے شاعری میں انھیں سے اصلاح لیتی تھیں۔

مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے ایک اور شخص مسمی مرزا امان علی خاں غالب عظیم آبادی کا ذکر کیا ہے۔ جو مرزا قتیل کے شاگرد اور قصہ امیر حمزہ کے مصنف تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

مدت تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر تعینات رہے بہت دنوں سے کلکتے میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ شعر فارسی بھی کہتے ہیں پہلے قوم ہنود سے تھے۔ پھر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور اس کے بعد یہ چار شعر لکھے ہیں ؎

آئینے میں آپ نے دیکھا جو روئے آتشیں ۔۔۔ پڑ گئیں چنگاریاں گویا سراسر آب میں

بن گئے لعل و گہر اشک دل افگاروں کے ۔۔۔ دیدۂ زار خزانے ہوئے فواروں کے

خنجر مژگاں کی دکھلا آج براّنی مجھے ۔۔۔ آئینہ تجھ کو مبارک چشم حیرانی مجھے

سلطنت سے ہے کہیں غالب میسر ہو اگر ۔۔۔ آستان سید عالم کی دربانی مجھے

نساخ ان سے چندر نگر میں ملے تھے۔ ان کا زمانہ وہی ہے جو مرزا امان علی خاں ذبیح کا ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے فارسی میں مرزا قتیل سے اصلاح لی ہو اور غالب کے ان اعتراضات کے بعد جو انھوں نے قتیل اور اُن کے کلام پر کیے تھے۔ اپنا تخلص غالب کر لیا ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ غلطی سے نساخ نے ذبیح کے ترک شیعیت کو ترک ہندویت لکھ دیا ہو۔

ذبیح اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ یہ کلام ہے ؎

درد جگر نے گنبد گردوں بنا دیا ۔۔۔ اشکوں نے آکے جوش میں، جیحوں بنا دیا

اس نقد داغ عشق کی افراط کیا کہوں ۔۔۔ دل کو مرے خزینۂ قاروں بنا دیا

میخواری اس کی یاد جو آئی تو اشک نے ۔۔۔ آنکھوں کو جام بادۂ گلگوں بنا دیا

جدت یہ ہے چمن میں کہ کس خوش نگاہ نے ۔۔۔ نرگس کو آنکھ مار کے مفتوں بنا دیا

مسرور ایک دم نہیں پاتے اسے ذبیح
کیا دل کو اس کے عشق نے محزوں بنا دیا

جی الجھتا ہے جو ہر دم کبھی ایسا تو نہ تھا
یاد آتا ہے مجھے غم کبھی ایسا تو نہ تھا

یاد رخسار کی ہے وجہ دگر نہ دل میں
جلوۂ نور کا عالم کبھی ایسا تو نہ تھا

کل کوئی چرخ کی بگڑی ہے مقرر ورنہ
کارخانہ مرا برہم کبھی ایسا تو نہ تھا

وجہ ہوگی جو ہمیں منہ نہ دکھایا اس نے
ورنہ یاد آتے نہ ہمدم کبھی ایسا تو نہ تھا

لا سکا تاب نہ خورشید کی کس طرح ذبیح
ہیچ یہ قطرۂ شبنم، کبھی ایسا تو نہ تھا

---

اس قدر تو ہو رجوع قلب عاشق سوئے دوست
منہ جو دشمن کا نظر آئے تو سمجھے روئے دوست

یہ وہی سر ہے کہ ہے اب اپنے زانو پہ سدا
یا اسی کو تھا میسر تکیۂ زانوئے دوست

گڑے ہوئے ہیں بہت گلبدن زمیں کے تلے
ہماری سیر کو ہے اک چمن زمیں کے تلے

ہوش میں آنا بس اب مشکل نظر آیا مجھے
اشک کے ہر تار میں اک دل تنظر آیا مجھے

قیس کہتا تھا نہ پوچھو اس گھڑی تم مجھ سے کچھ
ہوش کب رہتا ہے جب محمل نظر آیا مجھے

کب سے گردش کر رہا ہے ہاتھ میں کاسہ لیے
تیرے در کا آسماں، سائل نظر آیا مجھے

چار جانب کیا برستی ہے وہاں تیغوں پہ تیغ
تیرے کوچے میں ہر اک بسمل نظر آیا مجھے

وائے حسرت قدرداں سارے سدھارے اے ذبیح
شعر کا کہنا بھی لا حاصل نظر آیا مجھے

---

(فارسی)

بہ تیغ نازت اے قاتل طپیدن آرزو دارم
بجاں جنس وصالت را خریدن آرزو دارم

من جاں سوختہ تا کے دریں دنیائے دوں باشم
سپند آسا ازیں مجمر جہیدن آرزو دارم

دل خوں گشتہ ام گوید کہ در کوشش بجاکم کن
برنگ لالہ از خاکش دمیدن آرزو دارم

خدارا زندہ در خاکم کنید از جور ایں گردوں
بکنج مرقد اکنوں آرمیدن آرزو دارم

نیابد در دماغم زیں چمن بوئے وفاداری
ذبیحا از گل و بلبل بریدن آرزو دارم

---

معراج الخیال قلمی ۔ عیار الشعرا قلمی ۔ حیات فریاد ص ۲۱۵ ، سخن شعرا ص ۱۶۵
تنبیہ صفیر ص ۴۹ ۔ تواریخ الکملا ۔ مسلم شعرائے بہار جلد دوم ص ۲۹

# شیخ مہدی علی ذکی

گلشن ہمیشہ بہار۔ خوش معرکہ زیبا، سخن شعرا، دیوان غریب، طور کلیم، یادگار ضیغم گلستان سخن اور سخنوران بلند فکر میں ذکی کو زائے معجمہ سے لکھا گیا ہے۔ دوسری مطبوعات میں ذال معجمہ سے ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سرود غیبی میں نام مہدی حسن درج ہے اور انھیں سید لکھا گیا ہے ذکی کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ ذکی کے والد شیخ کرامت علی خلف شیخ فضل علی، شیخ محمد واسع کے پوتے تھے اور اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ محمد نافع شیخ الاسلام بجنوری کا عقد زاہد بی بی بنت نواب عظمت اللہ خاں ولد قاضی امیر عصمت اللہ خاں نبیرۂ عبدالقادر فاروقی لکھنوی سے ہوا تھا۔ اس طرح ان کا ننہالی سلسلہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ نواب عظمت اللہ خاں عہد مغلیہ میں روہیل کھنڈ کے ناظم تھے۔ اس لیے ان کے بہت سے متعلقین نے مرادآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان میں ذکی کا خاندان بھی تھا۔ ذکی کی پیدائش ۱۲۰۵ھ میں ہوئی ابتدائی تعلیم مرادآباد میں پائی۔ جوانی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے اور علمائے فرنگی محل سے استفادہ کیا یہ نواب سعادت علی خاں کا آخری زمانہ تھا۔ شاعری کا شوق تو وطن ہی میں پیدا ہو چکا تھا اور اُس وقت جو کچھ کہتے تھے اس میں اپنے نام کا پہلا جز "مہدی" بطور تخلص نظم کرتے تھے۔ لکھنؤ جانے کے بعد اس میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ مرزا قتیل و مصحفی فارسی و اردو کے دونوں استاد لکھنؤ کی بزم سخن کی رونق تھے۔ ذکی نے انھیں کی طرف رجوع کیا۔ فارسی کلام اصلاح کے لیے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا۔ مصحفی کو پہلی ملاقات میں کچھ اشعار سُنائے اور چلے آئے لیکن دوسری ملاقات میں ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ استاد نے مہدی کی جگہ ذکی تخلص عنایت کیا۔

ذکی کے تلمذ کے بارے میں منشی امیر احمد امیر مینائی کی ایک تحریر سے غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے انھوں نے ذکی کے انتقال کے بعد مرتب کیے ہوئے تذکرہ انتخاب یادگار میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

ذکی شیخ مہدی علی ابن شیخ کرامت علی مرادآبادی حضرت جنت آرام گاہ طاب ثراہ (۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۱ھ) کے عہد میں برسوں اس سرکار فیض آثار کے نمک خوار رہے چندے لکھنؤ چلے گئے پھر حضرت فردوس آرام گاہ (۱۲۷۱ھ تا ۱۲۸۱ھ) انار اللہ برہانہ، کے عہد میں نوکر ہو کر مورد افتخار رہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں نامور تھے۔

معلوم نہیں حضرت امیر کے سامنے کون سا حوالہ تھا؟ ذکی کے عہد میں جس قدر تذکرے لکھے گئے ان میں کسی میں بھی ذکی کو ناسخ کا شاگرد نہیں لکھا گیا۔ دوسروں سے قطع نظر کیجیے۔ ناسخ کے سلسلے کے جن شعرانے ایسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں انھیں بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ذکی کو ناسخ کا شاگرد بتادیتے۔ سید محسن علی محسن نے جو ناسخ کے سلسلے کے ایسے مصنف ہیں جنھوں نے تلمذ ظاہر کرنے میں کہیں کمی نہیں کی اور ناسخ کے بالواسطہ اور براہ راست تلامذہ کے نام کے ساتھ ان کے استاد کا نام ضرور لکھا ہے۔ اس کے بارے میں خاموش ہیں اور صرف یہ الفاظ لکھتے ہیں:

"شیخ مہدی ذکی ولد شیخ کرامت علی بزرگ ان کے شیخ زادے لکھنؤ کے۔ ان کا مسکن مرادآباد۔ عہد دولت سلطانِ عالم میں بواسطہ قطب الدولہ مخاطب بہ ملک الشعرا ہوئے۔"

سراپا سخن صہ ۱۵۸

یہی ایک صفحہ نہیں ہے پانچ دوسرے صفحات (۱۰۰، ۱۸۸، ۲۰۱، ۲۵۲، ۲۷۶) میں بھی ذکی کا کلام نقل کیا ہے مگر کسی جگہ بھی ذکی کو شاگرد ناسخ نہیں لکھا گیا۔ سراپا سخن کے بعد تذکرہ نادر کو لیجیے۔ یہ ناسخ کے شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا جامع تذکرہ ہے۔ جس میں شعرائے اردو کی غزلوں کی تخمیس کی گئی ہے۔ یہ بھی ذکی کے شاگرد ناسخ ہونے کے اظہار سے خالی ہے۔ ایک تیسری دستاویز سعادت خاں ناصر کا تذکرہ ہے جو ۱۲۶۱ھ میں ناسخ کے انتقال کے سات سال بعد لکھا گیا اور جس کے مصنف کو شیخ ناسخ کی حضوری و مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ذکی کا ذکر کیا گیا ہے وہاں انھیں کسی کا شاگرد نہیں لکھا گیا۔ یہ تذکرے تو اہلِ لکھنؤ یا متوسلان لکھنؤ کے تھے ان کے

سو اگلشن بے خار، گلشن ہمیشہ بہار، گلستان سخن، طور کلیم اور سخن شعرا متعدد تذکرے اور بھی ہیں جن کے لکھنے والوں کو ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ ذکی کو ناسخ سے تلمذ تھا آخر حضرت اثر کو کس طرح اس کی اطلاع ملی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ذکی کے برادر خورد زین العابدین کی اُس تحریر سے دھوکا ہوا۔ جو دیوان ذکی مطبوعہ کے آخر میں ہے اور جس میں زین العابدین نے شاگرد ناسخ ہونے کا اظہار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرحوم نے اس عبارت کو تو پڑھ لیا ہو اور یہ نہ دیکھا ہو کہ اس کا لکھنے والا کون ہے اور اسے ذکی کی تحریر تصور کر کے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں۔ ہم یہاں خاتمۃ الطبع کی عبارت من و عن درج کرتے ہیں:

میرے استاد کہ فخر شعرائے سابقین و حال جناب شیخ ناسخ علیہ الرحمۃ تھے وہ اُن (ذکی) کے فضل و کمال کی کیفیت سے خوب آگاہ تھے اور رابطہ و اتحاد بھی شعراؤں (کذا) میں نہیں دیکھا جیسا ان دونوں صاحبوں میں تھا جناب شیخ صاحب اپنی زبان فیض ترجمان سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولوی مہدی علی خاں ذکی فن شاعری میں بے مثل ہیں بالخصوص تاریخ گوئی میں از سابق تا حال ایسے صنائع بدائع کسی شاعر کی تصنیفات سے نہیں دیکھے اور نہیں سُنے۔

اب رہی مرزا قتیل اور مصحفی کی شاگردی تو مرزا قتیل کی شاگردی کے اثبات کے لیے تو خیراتی لال بیجگر کی یہ عبارت موجود ہے جو ذکی کے ایک شاگرد لالہ ہرگوپال لال دریا آبادی نے جو مراد آباد میں سررشتہ دار تھے، ان کے پاس روانہ کی تھی۔

"در عنفوان ظہور سن شعور چندے در وطن و بنائے تحصیل علم بر بالائے توجہ راست نمودہ محو سیر بلدۂ لکھنؤ گردید و بہ فیض گل چینی صحبت باغ و بہار جناب مخدومی مرزا قتیل صاحب قدس اللہ سرہ العزیز حدیقۂ طبیعت در مشق سخن گوئی رنگین ساخت۔"

اور مصحفی کے تلمذ کے ثبوت میں میر اصغر حسین امروہوی کی یہ تحریر ملاحظہ کیجیے۔ میر صاحب امروہے کے محلہ کالی پگڑی کے بیان میں جہاں مصحفی کے بزرگ رہتے تھے لکھتے ہیں:

"شیخ ولی محمد بھی یہاں سکونت رکھتے تھے جن کے بیٹے شیخ غلام ہمدانی شعرگوئی
میں استاد لاثانی مصحفی تخلص شاگرد رمانی کے تھے۔ ناسخ۔ آتش۔ ذکی۔ اسیر وغیرہ
ایسے شاعروں کو اُن سے تلمذ تھا۔ لکھنؤ میں جاکر مقیم ہوئے وہیں قضا کی"

اگرچہ ذکی و مصحفی کی شاگردی و استادی کے لیے یہی تاریخی ثبوت کافی وشافی ہے تاہم ایک اور
حوالہ بھی دیکھتے چلیے۔ تراب علی خاں باز حیدرآبادی، منشی امداد حسین اخگر مراد آبادی تلمیذ
نواب شبیر علی خاں تنہا مراد آبادی شاگرد ذکی کی رباعیات کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"شاعری آپ (منشی امداد حسین اخگر) کی فطری خصوصیت ہے۔ تلمذ نواب شبیر علی خاں
صاحب تنہا مرحوم سے حاصل ہے یہ ذکی کے شاگرد تھے جو ایک واسطے سے یا بلاواسطہ
مصحفی مرحوم کے شاگرد ہیں"

مزید برآں مصحفی و ذکی کی یگانگت اور خصوصی تعلقات کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے
کہ ذکی کے کلیات میں صرف مصحفی کی ایک اردو غزل کی تخمیس شامل ہے جو بہ بنائے احترام
استادی ہوسکتی ہے اردو کے کسی اور شاعر کی غزل کو ذکی نے خمسہ نہیں کیا۔

آمدم بر سر مطلب۔ ذکی لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہوکر واپس ہوئے تو دہلی چلے گئے یہاں نواب
مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان پر محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ ذکی بھی اس میں شامل ہوئے
اور دہلی کے اکابر شعرا سے ملاقاتیں رہیں جن میں مرزا قادر بخش صابر گورگانی بھی ہیں، دہلی سے
سہارن پور گئے اور سرکار برطانیہ کی جانب سے کچھ دن یہاں تحصیلدار رہے۔ انھیں ایام
میں پنجاب کے بعض شہروں کی بھی سیر کی ایک شعر میں پنجاب کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ملک پنجاب نظر آتا ہے فردوس ذکی | جب کہ پڑتی ہے نظر سایۂ طوبیٰ کی طرف

جھنگ پنجاب کا ایک ضلع ہے جسے جھنگ سیال بھی کہتے ہیں ذکی نے اس کا ذکر ایک خاص
انداز میں کیا ہے جس میں کسی واقعہ عشق و محبت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ؎

چاہ نے جھنگ سیالی کے جھکائے ہیں کنوئیں | ہم کہاں ورنہ ذکی اور یہ پنجاب کہاں

ملازمت کا یہ سلسلہ بھی جلد ترک کر دیا گیا اور یہاں سے حیدر آباد دکن کا رُخ کیا۔ ناصر الدولہ نظام الملک بہادر آصفجاہ پنجم (۱۲۴۴ھ تا ۱۲۷۲ھ) کا دور دورہ تھا ان کی مدح میں معرکۃ الآرا قصائد لکھے جو کلیات میں موجود ہیں اور والی ریاست سے خلعت و انعام اور عمائد شہر سے عزت و احترام پایا۔

ایک لطیفہ۔ مولوی منور خاں گوہر ایک مصنف ہیں جن کا تذکرہ سخنوران بلند نگر مطبوعہ موجود ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۳۵۴ھ ہے جو اس کے نام سے برآمد ہوتا ہے۔ یہ ذکی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ذکی کی وفات کا حال معلوم نہیں ہو سکا چوں کہ وہ نواب آصف جاہ کے عہد میں موجود تھے اور نواب موصوف کی خدمت میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا تھا اور نواب کی وفات ۱۱۶۱ھ میں ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۱۶۱ھ تک زندہ تھے۔"

مولوی گوہر صاحب نے آصف جاہ کو آصف جاہ پنجم کے بدلے آصف جاہ اول سمجھ لیا۔ اور اس بنا پر ذکی کے ۱۱۶۱ھ تک بقید حیات رہنے کی سند عطا کر دی، حالاں کہ اس وقت غریب ذکی کا وجود نہیں تھا۔ اس کے تقریباً نصف صدی کے بعد ان کی ولادت ہوئی تھی۔

حیدر آباد کے ہنگامہ پرور قیام کے دوران بھی وطن کی محبت اُن کے دل سے نہ نکلی، اور کچھ مدت قیام کرنے کے بعد مراد آباد پلٹے اور چند روز گزار کر لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت جان عالم نواب واجد علی شاہ سریر آرائے حکومت ہو چکے تھے۔ ان کے مصاحبوں میں ایک نواب قطب الدولہ تھے۔

قطب الدولہ نے ان کو دربار شاہی میں پیش کیا اور ملازمت مل گئی۔ واجد علی شاہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا جو اُن کے نام کے ساتھ مہر میں اس طرح کندہ تھا :

"ملک الشعرا شیخ مہدی علی خاں ۱۲۶۵ھ"

۱۲۷۱ھ میں سلطنت اودھ کا شیرازہ بکھر گیا تو ذکی وطن واپس آکر گوشہ نشین ہو گئے اور ڈیڑھ دو سال کہیں نہیں گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کی شورش ختم ہوئی اور امن و سلامتی کے دن دوبارہ آئے تو نواب یوسف علی خاں والئی رام پور نے ان کے کلام کی شہرت سن کر رام پور طلب کر لیا اور جب تک نواب زندہ رہے رام پور سے نہیں نکلے نواب کی وفات کے بعد اپنی غدر میں ضبط کی ہوئی جائیداد کے واگزار کرانے کی فکر ہوئی اور ۱۲۸۱ھ میں رام پور سے روانہ ہو کر انبالے پہنچے یہاں گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ دو سال کے قریب قیام کرنا پڑا، آخر ۱۲۸۳ھ کے ماہ ذی قعدہ میں وفات پا گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جو نوکر ساتھ تھا اُس نے نمک حرامی کی اور کھانے میں زہر دے دیا۔ سید محمد علی جوؔیا مراد آبادی نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے

میر زمانہ سید مہدی علی ذکی ۔۔۔ پہنچے بقا کو، دار فنا پر نظر نہ کی
تاریخ فوت اُن کی جو میں ڈھونڈنے لگا ۔۔۔ آئی ندائے غیب کہ جنّت میں ہے ذکی

سرود غیبی و سخن شعرا میں چوتھا مصرع اسی طرح لکھا ہوا ہے اور اس کے اعداد ۱۲۸۳ھ نہیں ہوتے ۱۲۹۸ھ ہوتے ہیں۔ دراں حالیکہ اول الذکر میں مصرع کے نیچے ۱۲۸۳ھ تحریر ہے۔

<u>دوسرا لطیفہ</u>۔ حضرت امیر مینائی کی تحریر سے بھی ذکی کے سنہ وفات میں اختلاف رونما ہونے کا امکان ہے لکھتے ہیں:

"۲۷ برس کی عمر پائی بارہ سو اکیاسی ہجری میں انبالے گئے ذی قعدہ کے مہینے میں قضا کی وہیں دفن ہوئے"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۸۱ھ ہی میں وفات پائی کیونکہ وہاں کے دو سال کے قیام کا ذکر نہیں ہے۔

ذکی کے لڑکے شیخ مہدی حسن بھی شاعر تھے ان کا ایک قطعہ تاریخ جو گوپی طوائف کے انتقال پر لکھا تھا، منشی انوار حسین تسلیم نے ملخص تسلیم میں درج کیا ہے۔

ذکی کے شاگردوں کا سلسلہ رام پور، مراد آباد، بجنور، سہارن پور اور انبالے میں کافی پھیلا ہوا ہے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ نواب شبیر علی خاں تنہاؔ، مولوی کفایت علی کافیؔ نعت گو اور مرزا ثاقب لکھنوی کے استاد میر مومن حسین صفیؔ امروہوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اردو، فارسی کے دونوں دیوان مکمل کیے تھے۔ ان میں سے اردو کا کلیات تو مطبع منشی نول کشور سے شائع ہو چکا ہے، فارسی کا مطبوعہ دیوان ابھی تک نظر سے نہیں گزرا۔ ایک رسالہ عروض و قوافی میں یادگیر کے نام سے ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ نثر میں پانچ کتابیں۔ (۱) طلسم جام جم مصنفہ ۱۸۴۲ء (۲) طلسم بالا باختر مصنفہ ۱۸۶۶ء (۳) طلسم آصفی مصنفہ ۱۸۴۵ء (۴) طلسم حکیم قسطاس مصنفہ ۱۲۶۱ھ (۵) اور طلسم سبع سباغ مصنفہ ۱۸۵۴ء رام پور میں بیٹھ کر لکھی تھیں۔ ان کے مخطوطات رام پور کی سرکاری لائبریری میں موجود ہیں۔

ذکی بڑے کامیاب شاعر تھے جنھوں نے اپنے استاد مصحفیؔ کے رنگ کو چلا دی اور ناسخ کے خشک، بے مزہ، تصنع آمیز طرز سخن کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اگرچہ کئی تذکرہ نویسوں نے جن میں مولوی عبدالحی بھی شامل ہیں ان کا ذکر نہیں کیا لیکن اس سے ان کے کمال فن کی نفی نہیں ہوتی۔ اس تعارف کے بعد کلام سے لطف اٹھایئے ؎

کھولوں ہوا پہ طرّہ جو طبع سلیم کا — بس جائے بوئے مشک سے دامن نسیم کا

اک پھری دشت پہ دل ان روزوں جو ہے آیا ہوا — ہر طرف پھرتا ہوں دیوانہ سا گھبرایا ہوا

بند قبا سے نیل ہے اس کے بدن میں آج — سوسن کا گل کھلا چمن یاسمن میں آج

چنگاریاں سی اڑتی ہیں اپنے سخن میں آج — گویا ستارہ ریز زباں ہے دہن میں آج

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی خصال کے — انسان بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ریختے میں بوئے معنی ہم نے پیدا کی ذکی — سرزمین ہند میں کیا عطر کھینچا خاک کا

سُن کر غزل ذکی کی اے سست نظم شاعر — خاموش کیوں ہوا تو گر دل میں حوصلہ تھا

زہر کھایا سبزہ رنگوں کی محبت میں ذکی — صندلی رنگوں کے غم میں دردِ سر پیدا کیا

عالم میں فیضِ لطفِ طبیعت سے اے ذکی — جوں بوئے گُل عزیز رہا میں جہاں رہا

ذکی مسافرِ ملکِ فنا کو ہے لازم — کہ بار دوش پہ باندھے تو مختصر باندھے

اعتبارات جہاں رنگ بدلتے ہیں ذکی — آنے والے یہی ہو جاتے ہیں جانے والے

ہیں روحِ سخن، ذکی کے اشعار — ثابت ہے کہ ذہن منتقل ہے

دل ہم سے رہا جدا ہمیشہ — گویا وہ ضمیر منفصل ہے

ماہتابی پر جو وہ خورشید رو ہے بے حجاب — اپنے جامے سے ہوئی جاتی ہے باہر چاندنی

شرما کے، طیش کھا کے، خفا ہو کے ہنس پڑے — پاؤں پہ میں گرا جو بدن کو لگا کے ہاتھ

آفتیں اتنی اُٹھائیں عبث اے جانِ حزیں — ہجر کا نام ہی سُن کر تجھے مر جانا تھا

شعلۂ حسن کبھی برقِ جہاں سوز نہ ہو — آفتِ جانِ ذکی دل ہی کا آ جانا تھا

حسرت ہے اے تازہ اسیرانِ قفس آتی ہے — دھوم سے فصلِ بہار اب کے برس آتی ہے

بھولا جہاں کو فکرِ سخن میں تو اے ذکی — کچھ بات اور بھی ہے تجھے یاد بے خبر

آسماں کو دیکھ کر سمجھے ذکی ہم تیرہ روز — سو گیا ہے بخت منہ پہ نیلی چادر تان کر

اک ذرا تیغِ نگہ کا جو اشارا ہو جائے — آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے

جلوۂ نورِ معانی کا اثر ہو تو ذکی — حرفِ خامہ سے نکلتے ہی ستارا ہو جائے

صرفہ اب پردہ دری میں دلِ ناداں کس کا — دامنِ یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا

شمع گُل ہونے لگی، یارانِ محفل اُٹھ چلے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

---

۱؎ مصحفی ؎ دل جس نے اُٹھایا ہے گلستانِ جہاں سے
اُٹھتے ہوئے یاں سے وہ سبک بار اُٹھا ہے

ہمارے حال پہ لازم ہے رحم اے صیاد — کہ پر شکستہ ہیں اور شوق ہے رہائی کا

اس پتے سے پوچھنا قاصد مکانِ یار کو — چاندنی کہتے ہیں کس کے سایۂ دیوار کو

(فارسی)

دیگرے نیست سوائے دل خود کام ذکی

کہ میان من و معشوق دراندازے ہست

ریاض الفصحا صہ ۲۰۳ ، گلشن بے خار صہ ۹۲ ، گلشن ہمیشہ بہار صہ ۱۶۷

خوش معرکہ اول صہ ۳۹ ، سراپا سخن صہ ۱۵ تا ۱۸۸ ، سخن شعرا صہ ۲۰۱

انتخاب یادگار حصہ دوم صہ ۱۴۰ ، دیوان غریب صہ ۱۹ ، طور کلیم صہ ۴۸

یادگار ضیغم صہ ۸۲ ، سخنوران بلند فکر صہ ۵۵ ، خمخانہ جاوید دوم صہ ۲۵۴

رسالہ سب رس مئی جون ۱۹۵۱ء صہ ۳۷ ، طبقات الشعرا کریم الدین صہ ۲۶۰

گلستان سخن صہ ۲۵۹ ، تاریخ اصغری ۱۲۹۱ھ صہ

ملحض تسلیم صہ ۴۲ ، سرود غیبی صہ ۵۲ ،

---

## شیو پرشاد ذوق

ذوق کے باپ کا نام نہ ریاض الفصحا میں ہے اور نہ خوش معرکۂ زیبا میں اس کا تعارف "چودھری وزن کشاں" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جب شعر و سخن میں کسی قدر ترقی حاصل ہونے لگی تو مولوی مظہر علی کے ہمراہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی خدمت میں حاضر ہو کر شاگردی اختیار کی اور ضروریات شعری سے باخبر ہوئے۔ مزاج میں شورش کا مادہ تھا اس لیے بعض لوگ ان سے ناخوش

تھے اور بُرے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ فارسی بھی لکھتے تھے اور اُردو بھی۔ ان کا فارسی قلمی دیوان لیاقت نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ اپنے استاد کی تعریف میں کہتے ہیں ؂

اے ذوقؔ بجز مصحفیؔ افصح آفاق ——— دیدیم نہ صدر انجمن شعر و سخن را

صحبت مصحفیؔ اے ذوقؔ چہ کردت تاثیر ——— کہ بہ ہندی شعرا، ثانی سودا شدۂ

ایک مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصحفیؔ کے انتقال کے بعد دبیر الدولہ منشی الملک منشی جوالا پرشاد وقارؔ[1] محکم جنگ سے اصلاح لینے لگے تھے ؂

کنوں وقارؔ ازیں پیش مصحفیؔ کرد است ——— درست ذوقؔ غزل ہائے عاشقانۂ ما

مصحفیؔ کی طرح ذوقؔ نے اپنے دوسرے استاد وقارؔ کی بھی تعریف کی ہے ؂

بکن شکرِ وقارؔ اے ذوقؔ بہر حق گزاری ہا ——— کہ شد از فیض اصلاحش تُرا ہم ختم دیوانے

بسکہ حاضر ماندہ ام اے ذوقؔ اندر خدمتش ——— ہم چنیں پر فکر از فیض وقارؔ افتادہ ام

داد جانش بر بزم شعر وقارؔ ——— کردے عمرے چو ذوقؔ خدمتِ اُو

بعض جگہ مصحفیؔ و وقارؔ دونوں استادوں کا ذکر کیا ہے ؂

ز لطفِ جز وقارؔ و مصحفیؔ اے ذوقؔ در عالم ——— پئے اصلاح کے در خدمت اہل زباں رفتم

مصحفیؔ نے ۱۲۳۶ھ میں ذوقؔ کی عمر تخمیناً پچیس سال بتائی ہے اور لکھا ہے کہ دیوان اُردو مکمل کر چکا ہے۔

ذوقؔ نے ۱۲۳۶ھ کے بعد اسلام اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کا اسلامی نام شیخ عبداللہ رکھا گیا تھا۔ سعادت خاں ناصرؔ نے اسی نام کے ساتھ خوش معرکہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] وقارؔ لکھنوی چھوٹے لال کے لڑکے، گوپال رائے کے پوتے اور ٹیکارام تسلیؔ کے سگے بھتیجے تھے امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ والیان اودھ کے عہد میں امیر الانشا کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا دیوان ۱۲۶۸ھ میں کانپور سے شائع ہو چکا ہے۔

اب کلام ملاحظہ کیجیے ؎

خاک سے میری بنا کر وہ بتِ پُرفن چراغ — گھر میں جائے شمع کرتا ہے وہی روشن چراغ

کھینچنے پایا نہ وہ میان سے صمصام تمام — ہو گیا جنبشِ ابرو ہی میں مرا کام تمام

سیر ہو سیرِ چمن کرنے نہ پایا میں جلد — موسمِ گل کے صبا ہو گئے ایام تمام

دشمنی دیکھیو تک اُس بتِ سفاک کی ذوقؔ — قتل اُس نے تو ہمارے کیے ہم نام تمام

گور پہ جس کی وہ ذرا ہو گئے — سیکڑوں واں فتنے بپا ہو گئے

عشق میں تیرے صنم جوں ہلال — خلق میں انگشت نما ہو گئے

چلنے سے پاؤں جب رہِ الفت میں تھک گئے — ہمراہی سارے چھوڑ کے ہم کو سرک گئے

بیداری کا کریں شبِ ہجراں کی کیا بیان — آگے ہمارے دیدۂ انجم جھپک گئے

اُس رشکِ گل کی آن و ادا دیکھ باغ میں — مرغِ اسیر، کنجِ قفس میں پھڑک گئے

ہوں اس کے یہاں کا طفلِ دبستاں میں ایک ذوقؔ — اس فن میں جس سے شیرِ نیستاں دبک گئے

فارسی کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مانندِ غمِ ہجرِ یار تا کے — سوزِ دلِ بے قرار تا کے

باشی بفراقِ یار گریاں — اے دیدۂ اشکبار تا کے

اے آئینہ رو، ز جانبِ من — در خاطرِ تو غبار تا کے

باشم بخیالِ وصل در خواب — با یادِ تو، ہم کنار تا کے

باشم قربانِ تیرِ مژگاں — چوں ذوقؔ جگر فگار تا کے

---

ریاض الفصحا ص ۹۴ ، خوش معرکہ زیبا اول ص ۴۸۹ ، سرو چراغاں قلمی
دیوان ذوقؔ فارسی قلمی ۔ مخزونہ پاکستان نیشنل میوزیم، کراچی

# شاہ رؤف احمد رافتؔ مجددی

خلف شاہ شعور احمد۔ سرہند کے اصل باشندے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان سے تھے۔ موصوف اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں جو ۱۲۴۲ھ میں بمقام بھوپال تصنیف کی اور ۱۲۶۵ھ میں چھپی لکھتے ہیں ۔

وطن میرے آبا کا سرہند ہے — وہ سرہند کیا باکہ دل بند ہے
برس گیارہ سو اور ستتر ہوئے — بہ ہجر پیمبر تو بے گھر ہوئے
پڑا حادثہ یعنی سرہند پر — کہ کفار سکھ نے کیا واں گزر
نکل آئے سب اقربا واں سے پھر — ہوئے ملک اسلام میں منتشر
کیا میرے جدین نے پھر عبور — میانِ کشمیر آکے در رام پور
صدی تیرویں کا جو یک سن گیا — اسی شہر میں تو میں پیدا ہوا
بمیدان تاریخ دوڑا کے رخش — رکھا نام دادا نے رحمان بخش (۱۲۰۱ھ)
یا لہام باکشف پھر یوں کہا — کہ درویش ہوگا یہ بیٹا مرا
امام زماں شاہِ درگاہی نام — کہ تھے فیض بخش ہمہ خاص و عام
انھیں کی میں خدمت میں حاضر ہوا — سمجھ کر کہ ہیں درد کی یہ دوا
برس بارہ یا تیرہ کی عمر تھی — کہ ان کی یہ مجھ پر عنایت ہوئی
یہاں تک تو ان کی عنایت ہوئی — کہ قبل از بلوغت اجازت ہوئی
رہا پندرہ یا کہ بس چودہ سال — توجہ میں ان کی میں بیہودہ حال
گئے بارہ سو پہ جو چھبیس سال — ہوا شاہ مسطور کا پھر وصال
غرض روح کی ان کی پا کر رضا — روانہ میں پھر سوئے دہلی ہوا
خلیفہ اسی خاندان کے تھے ایک — کہ مشہور تھا ان کا بس نام نیک

تھا اسم مبارک غلام علی
ہدایت کے اک نور تھے منجلی

کری عرض میں نے کہ ادنیٰ غلام
تمہارا ہوں میں تم ہو میرے امام

مجھے بھی غلامی میں داخل کرد
مریدانِ مخلص میں شامل کرو

اسی نہج بیٹھا رہا ایک سال
میں حجرے میں واں چھوڑ کر سب خیال

یونہی یک برس واں تو یک سال گھر
میں رہنے لگا کچھ ادھر کچھ اُدھر

بالقائے حق دل میں کچھ آ گیا
تو اک روز مجھ کو بلا کر کہا

کہ بھوپال کی سمت ہو تو رواں
کر اچھی طرح استقامت وہاں

غرض آن پہنچا میں بھوپال میں
نہ بھوپال بل دار الاقبال میں۔

الٰہی تو بھوپال کو رکھ مدام
بحفظ و اماں دشمنوں سے تمام

پسر میرے دونوں خطیب و منیب
معمر ہوں، صالح ہوں اور خوش نصیب

ان چھبیس[۲۶] اشعار میں رافت صاحب کے ابتدائی حالات نظم ہوگئے ہیں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ کم وبیش بارہ سال شاہ درگاہی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بطور جنیدؒ بغدادی ریاضت و مجاہدہ کیا اور نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، صابریہ، نظامیہ، سہروردیہ، کبرویہ اور مداریہ طریقوں میں اجازت پائی۔ سند مصافحہ اپنے خالو حضرت سراج احمد مجددی سے حاصل کی۔ سند حدیث بھی انھیں سے ملی۔ سند حرز یمانی حضرت احمد سے اجازت قصیدہ غوثیہ مولانا محمد ارشد سے، ختم خواجگان کی اجازت حضرت شاہ درگاہی صاحب و شاہ غلام علی سے، قصیدۂ بردہ، بانت سعاد و حصن حصین اور دیگر اعمال کی اجازت حضرت سراج احمد سے حاصل کی۔ حضرت شاہ درگاہی کے انتقال کے بعد نسبت مجددیہ حاصل کرنے کا شوق ہوا تو حضرت شاہ غلام علی کی خدمت میں دہلی پہنچے اور سلوک کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد اجازت و خلافت سے مشرف

ہوئے۔ آخر میں بھوپال جا کر مقیم ہوئے وہاں سے بہ ارادۂ حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے لیکن مکہ معظمہ تک نہ پہنچ سکے۔

تذکرۂ کاملان رام پور کے مصنف نے وفات کے بارے میں لکھا ہے:

"جہاز میں پینسٹھ برس کی عمر میں ذی قعدہ کی پچیسویں تاریخ بارہ سو چالیس ہجری (۱۲۴۰ھ) کو یکایک انتقال آپ کا یلملم کے مقابل ہوا اور بیر علی میں دفن ہوئے جسے ببر علی بھی کہتے ہیں" (ص ۱۴۵)

اسی عبارت سے مربوط یہ عبارت لکھی ہے۔

"تفسیر رؤفی بزبان اُردو بارہ سو انتالیس ہجری (۱۲۳۹ھ) میں لکھنا شروع کی اور بارہ سو اڑتالیس ہجری (۱۲۴۸ھ) میں ختم کی"۔ (ص ۱۴۵)

یہ عجیب قسم کی تاریخ نویسی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں کسی تصنیف کرنے والے کا ۱۲۴۰ھ میں وفات پا جانا لکھا جائے اور وہ بھی ہندسوں کی جگہ عبارت میں جس سے کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ بھی غلط ہے کہ ۶۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اور اسے مصنف کاملان رام پور نے بھی ص ۱۴۵ میں تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ان کے دیے ہوئے سن وفات کے وقت شاہ رافت کی عمر صرف ۳۹ سال کی ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ کسی غور و فکر کے بغیر خمخانۂ جاوید کے مصنف نے یہی عمر اور یہی سن وفات نقل کر دیا ہے۔ اور سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ رافت کا انتقال ۴۸ سال کی عمر میں ۱۲۴۹ھ میں ہوا جس کے ثبوت میں مولوی عبدالغفور خاں کا یہ قطعہ تاریخ پیش کیا جاتا ہے ؎

رافتؔ آں قبلۂ ارباب کمال ازجہاں رفت بسوئے جنت
بہر تاریخ رحیلش نساخ شد رقم "قدوۂ جنت رافت"

۱۲۴۹ھ

رافت میں موزونیت طبع کا جوہر فطری تھا۔ تصوّف کی چاشنی نے اس میں اضافہ کیا اور عنفوان شباب میں شعر گوئی کرنے لگے اسی دوران لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا مصحفی لکھتے ہیں :

"از رام پور بہ لکھنؤ گذر افگندہ بملاقات فقیر آمدہ بود ارادۂ تلمذ در دل داشت دراں رواردی سفر کر وقفہ ماندن در شہر چندان شورش کلام شکستہ و بستہ خود را بپائے خامۂ اصلاح من در آورد و بعد چند روز شاگرد جرأت شدہ پیش عاصی برائے رخصت باز آمدہ"

اس طرح رافت اپنے ایک ہم وطن اختر سرہندی کی طرح کچھ کلام پر مصحفی سے اصلاح لینے کے بعد جرأت کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔

رافت بڑے جیّد عالم اور کثیر الکلام شاعر تھے۔ قلم برداشتہ شعر لکھتے تھے صنائع و بدائع نظم کرنے کا شوق بھی تھا۔

ان کی تصانیف یہ ہیں :-

(۱) کلیات رافت۔ جس میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں۔

(۲) دیوان رافت۔ اس میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔

(۳) مثنوی یوسفؑ زلیخا۔

(۴) مثنوی قصہ یہودی۔

(۵) رسالہ مولود شریف

یہ تصنیفات مخطوطات کی صورت میں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ فارسی تصنیفات بھی ہیں۔ مدت ہوئی رافت کا ایک مختصر سا اردو دیوان جس میں ردیف وار غزلیات تھیں راقم الحروف کو دستیاب ہوا تھا۔ یہ بمبئی سے طبع ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا حسرت موہانی کو حج بیت اللہ جاتے ہوئے دن بھر کے لیے جہاز رک جانے کی وجہ سے کراچی میں

رُکنا پڑ گیا مرحوم نے سابقہ تعارف کی بنا پر غریب خانہ کو عزّت بخشی۔ مَیں نے وہ دیوان ان کی نذر کر دیا تاکہ ان کے بے مثال کتب خانہ منظومات اُردو میں شامل ہو جائے۔ اب رافتؔ کے کلام کا نمونہ دیکھیے۔ پہلے دو شعر مصحفی کی اصلاح کردہ غزلوں سے لیے گئے ہیں ؎

جرّاح مرے زخم کو سینے کے تو سی مت — یہ جھانکنے کو دل کے جھروکا ہے غنیمت
دمِ وداع یہ کہنا ہے کیا غضب اُس کا — کہ ہم تو جاتے ہیں رافتؔ ترا خدا حافظ

کچھ اور کلام ؎

گوریں بھرتا ہے نعرہ تیرا بسمل آہ کا — پڑھ کے بخش اُس کو ثواب اے جان بسم اللہ کا
رقیبوں سے مل مل کے وہ نازنیں — مجھے خاک و خوں میں رلانے لگا
جگنو گلے میں زلفِ سیہ فام دوش پر — ہے صبح اُس کی چھاتی پہ اور شام دوش پر
اس مرغِ دل کا آج نشاں ہی نہیں ہے کچھ — نوچے تھے تو نے جس کے تہِ دام دوش پر

ہوئے جو چاہت کے اپنی چرچے تو اشک بھر آئے چشمِ تر میں
کنارہ کش ہو سبھوں سے بیٹھا وہ اپنے گھر میں، میں اپنے گھر میں
یہ کس کی مژگاں کے آہ یارب بھرے ہیں برمے ہمارے بر میں
کہ شکلِ غربال ہو گئے ہیں ہزاروں رخنے دل و جگر میں
ادا و انداز و ناز و غمزہ جو کچھ ہے اُس شوخ فتنہ گر میں
نہ وہ پری میں نہ حور میں ہے نہ ہے وہ غلماں میں نے بشر میں
لگا نہ جرّاح اس پہ مرہم کہ داغ جاوے تو جائیں مر ہم
یہ رکھتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اُجڑے ہوئے نگر میں

گرمیِ رخساروں کی دیکھے ہے یار آئینے میں — جوہرِ آئینہ ہو جاوے شرار آئینہ میں
رافتؔ اچپل وہ بھلا کب مرے گھر ٹھہرے کہ آہ — عکس کو جس کے نہ آتا ہو قرار آئینہ میں

جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہے　　اس پہ آئی ہے بلا ہم نے بسا دیکھا ہے
آپ بیٹھے ہوئے کرسی پہ جو کرتے ہیں گھمنڈ　　میرا نالہ یہ نہیں عرش رسا دیکھا ہے

ترا مجنوں ہوں اے پیارے اگر تو رشکِ لیلےٰ ہے
گیا جنگل کو تھا دہ میں نے، ابھی صحرا کی لے لی ہے

عمدۂ منتخبہ صـ ۲۹۷، مجموعۂ نغز صـ ۲۶۶، ریاض الفصحا صـ ۱۰۶
گلشن بے خار صـ ۸۴، گلشن ہمیشہ بہار صـ ۱۵۴، نسخۂ دل کشا صـ
طبقات الشعرا کریم الدین صـ ۲۹۲، خمخانۂ جاوید سوم صـ ۳۵ .
تذکرہ کاملان رام پور صـ ۱۴۳ ۔

## شیخ عبد الرحیم، رعناؔ

شیخ عبد الکریم کے بیٹے اصلاً دہلی کے باشندے تھے لیکن ان کے بزرگ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ جوان صلاحیت شعار اور موزوں طبع ہے، اور جو کچھ تصنیف کرتا ہے مجھ سے اصلاح لے لیتا ہے۔ کلام میں کسی قسم کی ندرت نہیں ہے۔ صاف اور سیدھی سادی شاعری ہے ؎

زبس بحرِ غم رات تھا شعلہ ور پہ　　رہی آستیں صبح تک چشمِ تر پر
یہ اکسیرِ حسن اس کی ہے پرتوِ افگن　　کہ ہے رنگِ شنجرف عقدِ گہر پر
اسی بحر میں کہہ غزل اور رعناؔ　　کہ ہو آفریں جس کے ہر شعرِ تر پر

ہوا آہ بھر بھر کوئی تیرے در پر　　نہ آیا تجھے رحم اس نوحہ گر پر
گئے بانکپن بھول دلی کے بانکے　　نظر کی جو کافر کی ترچھی نظر پر

ہے برائے کشتن پروانہ کیا پر فن چراغ | دل جلے عاشق کو دکھلاتا ہے کیا جوبن چراغ
زلف کے آگے فروغ روئے روشن کیونکہ ہو | سامنے کالے کے ہوتا ہی نہیں روشن چراغ
مشتعل رہتی ہے آہ آتشیں مثل گیاس | سینۂ عشاق میں جلتا ہے بے روغن چراغ
جلوہ گاہ شمع رو میں حاجت مشعل نہیں | کب ہوا ہے بزم کوہ طور میں روشن چراغ
مثل پروانہ جلایا شمع رؤوں نے مجھے | چاہیے تُربت پہ بھی میری پس مرگن چراغ
پاک دامانی پہ مرتے ہیں یہ پروانے عبث | بزم عالم میں رہا کرتا ہے تر دامن چراغ
ڈالتے ہیں شمع رو کیوں روئے روشن پر نقاب | چھپ نہیں سکتا کسی صورت پس چلمن چراغ
ہے بجا زلف سیہ پہلوئے روئے شمع رو | ہے مثل نیچے اندھیرا ہو جو ہو روشن چراغ

ہے چراغ صبح رعنا آمد پیری میں زیست
واقعی رہتا نہیں ہے صبح دم روشن چراغ

---

لاتا ہوں نقد جاں کو تو یہ واں نہیں قبول | نذر گدا بحضرت سلطاں نہیں قبول
اللہ رے تیرے دست حنا بستہ کا خیال | جس کو سلام پنجۂ مرجاں نہیں قبول

---

کیوں خال سیہ جاناں! عارض پہ بناتے ہو | اس چاند سے مُکھڑے کو کیوں داغ لگاتے ہو
تم وقت کے اپنے بھی کیا کم ہو مسیحا سے | انداز تبسّم میں مردوں کو جلاتے ہو
سُنتے ہو میاں رعنا کچھ ہوش گیا ہے کیا | وہ فتنۂ عالم ہے دل کس سے لگاتے ہو

---

نور مہ، اُس کے روبرو کم ہے
چشم بد دُور کیا ہی عالم ہے

---

ریاض الفصحا۔ صـ ۹۶۔ طلسم ہفت پیکر، جلد اول صـ ۳۶۲

# مرزا سعادت یار خاں رنگیںؔ

رنگیںؔ کے والد مرزا طہماسپ بیگ خاں اصلاً تورانی تھے وہ اپنے وطن سے نکل کر لاہور آئے اور یہاں اعتماد الدولہ کے لڑکے نواب میر معین الملک عرف میر منّو کے ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بالترتیب نواب ضابطہ خاں اور ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں کی ملازمت میں زندگی بسر کی انھیں ایّام میں حکومت دہلی کی طرف سے اُنھیں محکم الدولہ بہادر اعتضاد جنگ کا خطاب ملا۔

رنگیںؔ ۱۱۷۰ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے تھے لیکن نشوونما دہلی میں ہائی۔ تعلیم و تربیت کے بعد فنونِ سپاہ گری میں اچھی دستگاہ حاصل کی اور اپنے زمانے کے اکثر اُمرا کے یہاں ملازم رہے جن میں مرزا سلیمان شکوہ بھی شامل ہیں۔ سیاحت کا بہت شوق رکھتے تھے، اور گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ چونکہ وہ گھوڑوں کے حالات ان کے اقسام اور بیماریوں کے علاج سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے اس لیے نواب باندہ نے ان کو اپنے ہاں چابک سواروں میں ملازم رکھ لیا تھا۔ شعر و شاعری کا شوق آغاز شباب سے تھا اور جب تک دہلی میں رہے شاہ ظہور الدین حاتمؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ اُن کا ۱۱۹۷ھ میں انتقال ہو گیا تو محمد پناہ خاں نثارؔ سے مشورہ کیا لیکن دیوان مکمل کرنے کے بعد نظرِ ثانی کے لیے مصحفیؔ کے پاس چھوڑ گئے۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:

"درحالا کہ بفضلِ الٰہی در نظمِ کلام ترقی و امتیاز تمام پیدا کردہ از راہِ انصاف دیوانِ خود را از اول تا آخر بہ نظرِ مولف در آوردہ۔ کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ"

خود رنگیںؔ نے بھی مثنوی دل پذیر میں اس کا اشارہ کیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| ہیں میاں مصحفیؔ بڑے استاد | شعر ہوتے ہیں ان کے سب بے داد |
| سُن چکے جب وہ مثنوی ساری | نظم اس کی اُنھیں لگی پیاری |

مصحفی نے اس بات کا اشارہ اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں بھی کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں

وہی ہوں میں کہ جسے فیضیِ زمان انشا سمجھ کے دل میں نہ لاتا تھا کچھ خیال غرور
وہی ہوں میں کہ جسے سُن کے میر سلمہٗ کہے ہے ہاں اگر آجائے ہے کبھی مذکور
وہی ہوں میں جسے رنگین نے باب دیوان
دکھا کے باتمامی کیا ہے رنج خطور

علمی استعداد تو کچھ زیادہ نہ تھی البتہ خیالات کی بلندی اور طبیعت کی ذہانت کی بنا پر اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ قدرت سے ایجاد و اختراع کا مادہ پایا تھا جس نے ریختے سے ریختی نکالنے میں مدد کی۔ انشا، نعیم بیگ جواں، سبحان علی بیگ، راغب وغیرہ سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ مزاج عاشقانہ پایا تھا۔ جس کا اقتضا یہ تھا کہ اچھے اچھے قطعات لکھے اور عمدہ عمدہ غزلیات تصنیف کیں۔ اسی سال کی عمر پا کر ۱۲۵۱ھ میں وفات پائی۔ کچھ شاگرد بھی تھے جن میں سید علی غمگیں، اور بسنت سنگھ نشاط صاحب دیوان ہوئے۔

کریم الدین نے ان کی وفات کے بارے میں یہ عجیب روایت لکھی ہے کہتے ہیں: "یہ بات نادرات سے ہے کہ جس سال وہ مرا اُس سال میں اُس نے سب لوگوں سے بیان کیا کہ اس سال میں مروں گا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟ کہا مدت ہوئی تاریخ میری وفات کی میری زبان پر آپ ہی نکل آئی تھی اور وہ سال یہی ہے۔

کلیات رنگین جس میں ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ۔ چار اردو کے دواوین ہیں اور پانچ دوسری تصانیف شامل ہیں۔ مثنوی ایجاد رنگیں، فرس نامہ، مجالس رنگین اور مثنوی دل پذیر ان کی یادگار کے طور پر موجود ہیں۔ ان سب کے مجموعے کو "نورتن" کہا جاتا ہے۔ رنگین کی شاعری اردو زبان کے اس دور کی بہترین مثال ہے کہ جب سادہ بیانی ہی فکر سخن کی معراج سمجھی جاتی تھی اور اردو شعر و سخن کا سرمایہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے ذیل میں نہیں آیا تھا۔ "یہ اُن کے کلام کا انتخاب ہے"۔

کیا کرتے ہو ناصح، تم نصیحت رات دن مجھ کو — اُسے بھی ایک دن تم جاکے سمجھاتے تو کیا ہوتا

تھی شعلہ یا کہ برق کہ جی میرا جل گیا — ایسی کی اک نگاہ کہ بس دم نکل گیا

تا حشر رہے یہ داغ دل کا — یارب نہ بجھے چراغ دل کا

رہروانِ عدم ذرا ٹھہرو — ہم بھی چلتے ہیں ساتھ، دم لے کر

دیکھتے ہی اُن کو ہو جاتے ہیں شادیِ مرگ ہم — اُن کو پاتے ہیں تو پھر ہم آپ کو پاتے نہیں

میں نے پوچھا کہ چاہتے ہو مجھے — سُن کے وہ بولے یوں، اِدھر دیکھو
مجھ کو تم چاہتے ہو کتنا کچھ — اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو

حوروں کے عوض مجھے الٰہی — دنیا میں تو ایک نازنین دے
کب مجھ کو بہشت کی ہے خواہش — جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے

رونے نے جسم پر گرانی کی — اب یہ حالت ہے ناتوانی کی

یہی رونا جو ہے تو تم رنگین — اُس کے کوچے سے آج کل نکلے

وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگین — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

اپنی ہر اک مژہ سے اشک جھڑتے ہیں اس تماش سے
لوگ چھڑکتے ہیں گلاب جیسے گلاب پاش سے

نشۂ حسن سے جس وقت وہ مخمور ہوئے — ہاتھ سے اُن کے کئی شیشۂ دل چور ہوئے

قیامت پہ رہا موقوف پھر تو دیکھنا اُس کا — اگر اک دم کے دم آنے میں وہ تاخیر کرتا ہے

---

تذکرہ ہندی - صـ۱۰۱ ، مجموعہ نغز - جـ۲ صـ۲۷ ، عمدہ منتخبہ صـ۲۸۶ ، تذکرہ بیجگر قلمی
تذکرہ گلشن بیخار صـ۸۳ ، ہمیشہ بہار صـ۱۶۰ ، خمخانہ جاوید سوم صـ۶۲۹
تذکرہ ابن طوفان ، طبقات الشعرا کریم الدین صـ۳۲۳

# میر دوست علی زلالؔ

میر پناہ (علی) کے بیٹے تھے ان کی سکونت میں اختلاف ہے مصحفی باشندہ اٹاوہ بتاتے ہیں لیکن اعظم الدولہ نے از سکنائے فرخ آباد لکھا ہے۔ یہ پہلے شیخ محمد عیسےٰ تنہاؔ کے شاگرد ہوئے اس وقت دوستؔ تخلص کرتے تھے۔ تنہاؔ کے انتقال کے بعد مصحفی کی شاگردی میں آئے اور انہوں نے تخلص زلالؔ قرار دیا۔ فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ خوش نویسی سے بھی بخوبی واقف تھے یہ صفت انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائی تھی۔

لکھنؤ کے قیام میں تعلیم اطفال مشغلہ تھا ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ۱۲۶۱ھ تک بعالم پیرانہ سالی موجود تھے۔ شاعری اس وقت بھی جاری تھی۔ مگر پہلی سی بات نہ رہی تھی۔ ناصرؔ کہتے ہیں

اب بسبب پیر سالی زلالؔ دُرد ہو گیا ہے

ان کے صرف ایک شاگرد ہلالؔ کا ذکر ملتا ہے جو بعد میں مصحفی کے شاگرد ہو گئے تھے اور ان کا ذکر تلامذۂ مصحفی میں حسب موقع درج ہے۔

کس صبح کو خورشید لیے تار شعاعی
جاروب کشِ کوچۂ جاناں نہیں ہوتا

ہمارے قتل پہ شمشیر، جنگجو نہ اُٹھا
نگاہِ ناز کفایت ہے، بوجھ تو نہ اُٹھا

نہ کھو تو ہاتھ سے کیفیتِ شبِ مہتاب
نقاب چہرۂ زیبا سے ماہرو! نہ اُٹھا

اک چشم کی گردش سے دو عالم کو کیا مست
کس بادہ سے تھی وہ نگہ ہوش ربا مست

غم کا نہ انھیں غم ہے، نہ شادی کی ہے شادی
رہتے ہیں سبھی یاد میں مردانِ خدا مست

وارفتہ ہوں کس چشم خماریں کا کہ مجھ کو
کرتی ہے چمن میں گل نرگس کی ادا مست

رکاوٹ کج ادائی ہو چکی بس
ملو بھی اب جُدائی ہو چکی بس

چمک یہ حسن کی گرمی سے اُس کے منہ پر ہے
کہ جیسے شیشے میں ہو دے شراب کا عالم

کوئی زلف کی لٹ ہیں کوئی گیسوؤں میں چھپا ہے — اک قافلۂ دل ترے ہر مو میں چھپا ہے
چہرہ مرا دیتا ہے جو اس میں سے دکھائی — کیا آئینہ، آئینۂ زانو میں چھپا ہے

آئینہ خانہ میں جو گزر ہو کبھی زلال — ہر عکس اُس کو دیکھ کے آغوش کھول دے

اگر شبیہ کشی آتی مجھ کو جوں بہزاد — تو اپنی آنکھیں بناتا ترے قدم کے تلے

جو دب گئے وہ خواب اُس کے بال رُخ کے تلے — نظر پڑے رگِ گل سے نشاں لکیروں کے

نہیں کسی میں یہ طاقت کہ اس کو روک سکے — ہوا کے گھوڑے پہ عہدِ شباب جاتا ہے

فارسی

شوخے کہ روے بپائے نگاریں حنا بہ بست — امشب بچشم آمد و چشم از حیا بہ بست
نازم بزلفِ یار کہ در یک نظارۂ — زنّار کفر در کمر پارسا بہ بست
فریاد ازیں ستم کہ بہ عہدِ جہالِ خویش — دستِ جفا کشادہ و دستِ دعا بہ بست

ریاض الفصحا صـ ۱۱۱ ، خوش معرکۂ زیبا اول صـ ۴۳۶ ، عمدۂ منتخبہ صـ ۲۶۱

## خواجہ عبدالرحیم زیبا

خواجہ محمد سخی کے لڑکے تھے۔ ان کے بزرگ کشمیر کے باشندے تھے۔ زیبا کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ دوم میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ اگرچہ بزرگوں کا ذریعہ معاش پشمینہ کی تجارت تھا، زیبا نے ملازمت شروع کی۔ مہذب اخلاق، مسکین طبیعت اور با صلاحیت ہونے کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ یہاں رہتے ہوئے ۷ - ۸

سال گزرے تھے کہ لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں نے طبیعت میں جولانی پیدا کی۔ احباب کی دیکھا دیکھی غزل کہنے لگے۔ تحصیل علم تو زیادہ نہیں کی تھی لیکن ذہن رسا و فکر سلیم کی مدد اور شیخ مصحفی کی گراں قدر اصلاح سے کامیاب شاعر بن گئے آخر عمر میں کان پور چلے گئے تھے وہیں ۱۲۶۹ھ سے کچھ قبل وفات پائی۔

محسن لکھنوی نے ان کا ذکر رعنا تخلص کے تحت کیا ہے اور دو شعر نقل کیے ہیں جس غزل سے یہ دو شعر لیے گئے ہیں وہ مکمل غزل مصحفی نے اپنے تذکرے میں زیبا کے نام سے درج کی ہے۔ اس غلطی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ رعنا کا نام بھی عبدالرحیم تھا اور وہ بھی زیبا کی طرح شیخ مصحفی ہی کے شاگردوں میں شامل تھے۔ ان کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔

کلام بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے ؎

صانعِ قدرت نے تن تیرا بنایا نور کا
لگ نہیں سکتا ترے تلووں کو چہرہ حور کا

داں سے آتی ہے انا الحق کی صدا ہر روز و شب
خون سولی سے گرا تھا جس جگہ منصور کا

بات بھی کوئی کسی کی پوچھتا زیبا نہیں
اس زمانے میں خدا حافظ ہے بے مقدور کا

---

دامن سے ہاتھ اُس کے گو دور ہے ہمارا
پر چاکِ جیب پہ تو مقدور ہے ہمارا

---

رنگین نشانی تمھیں بتلاؤں میں یارو
چھینٹیں ہیں لہو کی مرے جلاد کے منہ پر

ہے مصحفی استاد ترا، شوق سے زیبا
پڑھ اپنی غزل جا کے ہر استاد کے منہ پر

---

کرتا ہے قتل پیارے مجھ کو گھڑی گھڑی کا
یہ دیکھنا تمھارا چلمن اُٹھا اُٹھا کر

اُن کے بھی دیکھنے کو وہ بام پہ نہ آیا
پہنچے جو اس گلی میں جانیں کھپا کھپا کر

کہتے تھے ہم نہ دے دل اُس شعلہ رو کو زیبا
آخر نہ اُس نے مارا تجکو جلا جلا کر

---

آنکھیں مری بھر آئیں تو ساقی خجل ہوا
ہاتھوں سے میرے ساغرِ سرشار چھین کر

ہے جائے رشک اُن پہ جو کوچے میں یار کے
بیٹھے ہیں ہم سے سایۂ دیوار چھین کر

دل نذر کیا اُس کے جو ہم نے تو کہا بس — دینے کو ہمارے یہی سوغات نکالی
قائل ہوا میں زیبا تری خوشگوئی کا، تو نے — ہر بات میں دیکھا تو نئی بات نکالی

وہ زلفِ گرہ گیر ہے زنجیر ہماری — وابستۂ افسوں نہیں تسخیر ہماری
تلوار تو قاتل نے لگائی تھی ولیکن — کیا کیجے اُلٹ جائے جو تقدیر ہماری

مردمانِ چشم سے بھی چشم تر خالی ہوئے — اب تو آ ظالم کہیں یہ دونوں گھر خالی ہوئے

ریاض الفصحا ص ۱۰۶، خوش معرکہ اول ص ۴۳۵، سراپا سخن ص ۱۵۹

## شاہ غلام مینا ساحر

شیخ فضل امام ابن شیخ محمد عیوض ابن مولوی محب الرحمٰن ابن شیخ عبدالرحمٰن ابن مخدوم زادہ حافظ غلام محمد علوی کاکوروی کے لڑکے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت محمد حنفیہؒ تک پہنچتا ہے۔

صاحب مشاہیر کاکوروی کا بیان ہے:

ابتداءً تحصیل علم سے قطعاً متنفر تھے، ان کے والد کا قیام دہلی میں رہتا تھا یہ بھی وہیں ان کے ساتھ تھے۔ والد کے خوف سے بادل ناخواستہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تھوڑی دیر تک کتاب سامنے رکھ کر واپس آتے۔

ایک روز ان کے والد نے اپنے پیر و مرشد شاہ غلام علی دہلوی خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ دہلوی سے ان کی بدشوقی کا حال بیان کر کے خاص دعا اور توجہ چاہی۔ ان کے پیر و مرشد نے پانی آبخورے میں منگا کر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ان کو پلا دیا۔ اس تاریخ سے طبیعت تحصیل علم کی طرف متوجہ ہو گئی روز بروز علمی مذاق بڑھتا گیا اور چند ہی روز کے بعد

آسمان ہندوستان میں آفتاب ہو کر چمکے حضرت شاہ غلام علی صاحب نے غلام مینا نام
اور ساحر تخلص ان کو عطا کیا۔

ساحر چند سال اپنے والد کے ساتھ دہلی میں رہے اور شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ غلام علی
مجددی کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے اس کے بعد وطن واپس آکر فارسی نثر نگاری
کی طرف توجہ کی۔ مصحفی کہتے ہیں:

پیش ازیں خود را معروف نثر نویسی می داشت و از عہد آں بطور استادان سلف خوب می
برآمد باایمائے فقیر خیال موزوں کردن شعر فارسی در دلش گذشت و آنچہ موزوں کرده
مشاعرہ ہا خواند و آں را از نظر فقیر گزراند بطور شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ دریں بیاباں دشوار
گزار پائی گزارد و مورد تحسین و آفرین می شود۔

ساحر کے سن ولادت کا تعین مشکل ہے کسی تذکرہ نویس نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا البتہ
مصحفی نے ریاض الفصحا میں جو ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ ان
کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے۔ چونکہ وہ شاہ حسین بخش شہید کے ہم درس وہم سن تھے جن کی ولادت
۱۲۰۳ھ بیان کی گئی ہے۔ اس لیے ساحر کی ولادت بھی کم وبیش اسی زمانے میں ہونی چاہیے
اور اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ترجمہ مصحفی نے ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان
درج کیا ہوگا۔

تمام تذکرہ نویس ساحر کے شاعرانہ کارناموں کے معترف ہیں۔
شاہ تراب علی تراب کاکوروی لکھتے ہیں :-

نہایت قابل و نثار شاعر بود در علم فارسی دریں جا کسے بمقابلۂ او نبود در قابلیت و
جولانی طبع و نوبت و سعادت مندی ہمسر خود نداشت (کشف المتواری)

مولوی حسین بخش شہید لکھتے ہیں :-

سخن سنج بے نظیر نکتہ زائے دلپذیر، صاحب سحر حلال اشعار شیریں مقال در

ہر فن ماہر غلام مینا ساحر۔ (ریاض شہید)

نواب نور الحسن خاں کی رائے ہے:

در جدّت طبیعت و رسائی فکر از اقران گوئے سبقت ربودہ۔ طبع معنی آفریں و ذہنے دقّت گزیں داشت، شاعریش مسلّم ارباب کمال است و کمال موزونیش ہمہ سحر حلال۔

مظفر حسین صبا کہتے ہیں:

الحق در نظم و نثر نظیر خود نداشت

منشی احمد حسین سحر کا بیان ہے۔

کلامش نمکین شور قیامت بدلہا انداختہ و سخن آفرینش تصور جادوئے سامری از خاطرہا بردا شتہ۔ طرز کلام نظم دل کش او بوضع گفتگوئے شیخ علی حزیں است

اور کیوں نہ ہوتا ان کے استاد روشن طبع نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ

اگر زمانہ فرصت داد دریں کوچۂ تنگ و تار کہ ہر نا اہل را قدم گذاشتن بسیار دشوار است یکے از بے نظیران روزگار خواہد شد

ساحر کے بارے میں مصحفی کی پیش گوئی اس صورت میں پوری ہوئی کہ اُن کے کلام نے وہ شہرت حاصل کر لی جس کا وہ مستحق تھا اور یہ شہرت قرب و جوار لکھنؤ کی حدود سے نکل کر بہار تک پہنچ گئی۔ ان کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بہ تیغ ادائے تو سر می فروشم | بزخم سنانت جگر می فروشم
اسیری ز پرواز گلزار بہتر | بکنج قفس بال و پر می فروشم
چنانم خریدارِ سوزِ محبت | کہ خرمن بمشتِ شرر می فروشم
ثمردار نخلم دریں باغ لیکن | بسنگِ فلاخن ثمر می فروشم
من از گل فروشانِ بازارِ عشقم | گل تر ز لختِ جگر می فروشم

بدل می تپلد نوک مژگان شوخت ۔۔۔ رگ جاں بہ این ہمیشتر می فروشم
ندارد سخن زور بازار ساحر ۔۔۔ بیک جو متاعِ ہنر می فروشم

لیکن ساحر کی یہ غزل نہ معلوم کیوں کاہش تخلص کے ایک شاعر کی بتائی گئی ہے۔ درخشاں ابدالی عظیم آبادی اپنے مضمون "حضرت عطا بہاری" مندرجہ قومی زبان ۹ جولائی ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں۔

کاہش کی مشہور فارسی غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

بہ تیغ ادائے تو سر می فروشم ۔۔۔ بہ زخم سنانت جگر می فروشم

اس مطلع کی بطور مسدس تضمین کی ہے اور پوری غزل پہ خمسہ لکھا ہے۔ نموتاً کاہش کی غزل کے ایک شعر کی تضمین پیش کرتا ہوں[۱]۔

رکھے پھول صیاد نے جب قفس پر ۔۔۔ یہ کہنے لگی عندلیب نواگر
صبا کہہ دے میری زبانی یہ جاکر ۔۔۔ اسیری زپرواز گلزار بہتر
بہ کنجِ قفس بال و پر می فروشم

ساحر کے کلام کی خصوصیات میں دو باتیں نمایاں ہیں ایک یہ کہ وہ اظہار خیال کے لیے ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے دوسرے یہ کہ صحیح فارسی محاورات کے ساتھ اپنے مضمون کو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ سُننے والا اور پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس باکمال استاد سخن نے ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ کو وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان "تکیہ شریف کاظمیہ" میں دفن ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں منشی احمد حسین سحر اور منشی مومن علی خاں مفتون نے قطعات تاریخ لکھے ہیں جن کو بالترتیب یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

ساحر جادو بیاں شیریں مقال ۔۔۔ شاعر نازک خیالِ عہد بود
طبعِ پاکش مطلعِ خورشید فکر ۔۔۔ خامہ اش عقد ثریا می کشود

---

از پئے تاریخ سال فوت او نو عروس فکر من ماتم نمود
موئے پریشاں کردہ تاریخش بگو ساحر روح حزیں رحلت نمود
۱۲۹۶ - ۴۶ = ۱۲۵۰ھ

---

فریاد کہ از تفرقہ پردازیٔ گردوں امروز جواں عمر جہانے زجہاں رفت
زد برق بلائے بہ سیہ خانۂ گردوں ہر نالہ کہ در ماتمش از نوک زباں رفت
ایں درد چساں خون دل از دیدہ بجوشید ناوک بجگر آمد و در سینہ نہاں رفت
نیرنگ جہاں رنگ ثباتے نہ پدید خوش رفت ہر آں کو زجہاں گوراں رفت
آمد بزباں مصرع تاریخ وفاتش داماں زجہاں چید سوئے دار جناں رفت
۱۲۵۰ھ

---

یہ قطعہ تاریخ حافظ علی مشتاق ملیح آبادی کا ہے جسے ہم نے گلدستۂ مشتاق سے نقل کیا ہے ؎

ناگہ خبر وفات ساحر چو شنید مشتاق شکستہ دل بسے رنج کشید
تاریخ وفاتش بصد اندوہ و الم گفتا کہ دلا غلام مینا کو چید
۱۲۵۰ھ

---

منشی عبدالمجید سحرؔ اپنے والد کے سچے جانشین تھے اور انھیں مولوی محمد محسن محسنؔ کاکوروی سے تلمذ حاصل تھا۔ سحرؔ کے لڑکے منشی عبدالوحید نیرنگؔ ریاست جھالرا پاٹن میں ملازم تھے وہاں ان کے متعدد تلامذہ بھی موجود ہیں۔

ساحرؔ کے تلامذہ کچھ زیادہ نہیں مگر جو کچھ ہیں وہ قابلیت و شہرت کے آسمان پر ستارہ بن کر چمک رہے ہیں۔ مثلاً نواب امیر حسن خاں بسملؔ کاکوروی، مومن علی خاں مفتونؔ کاکوروی، مولوی محی الدین خاں ذوقؔ کاکوروی، مولوی احمد حسین سحرؔ اور مولوی غلام امام شہیدؔ موخر الذکر ساحرؔ سے قبل جناب مصحفیؔ سے اصلاح لیتے رہے تھے۔

ساحرؔ نے مندرجہ ذیل تصانیف یادگار چھوڑیں۔

(۱) نثر ساحر (۲) مثنوی ساحر جس کا مضمون مصحفی کی مثنوی بحر المحبت کے مشابہ ہے اور (۳) دیوان ساحر۔ اس کا ایک مخطوطہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ہے یہ منشی مومن علی خاں مفتوں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اور اس میں چند مکتوبات کے سوا جو منشی دین دیال، قاضی محمد صادق اختر اور مولوی محمد مہدی ملتمس کے نام ہیں۔ ساحر کا تمام و کمال فارسی کلام جمع کر دیا گیا ہے۔

اب ان کے کلام سے لطف اُٹھائیے ؎

جدا از کویت، بخاکِ ہر جا، فلک سپارد منِ حزیں را
ز اشک و آہِ شرار افشاں در آب و آتش کشم زمیں را

نوشتہ کلکِ قضا بنامم براتِ سوز و گداز عشقت
چگونہ اکنوں تواں ستردن بسعی کو لک، خطِ جبیں را

ایں است در ایّامِ اسیری ہوسِ ما — صیّاد گزارد بگلستاں قفسِ ما
اُمید بوئے تو از نوبہار بود مرا — وگرنہ با گل و گلشن چہ کار بود مرا
سحر کہ گلبدنے بود زیبِ آغوشم — گل مراد، نصیب کنار، بود مرا
ازیں سبب دلِ بیمار می شمرد نفس — کہ روزِ ہجرِ تو روز شمار بود مرا
جز آں کہ حسرت و غم بُردم از جہاں ساحر — بایں دیار ندانم چہ کار بود مرا

بہر زمیں کہ مزار نخودہ بختاں بود — ہمیشہ سبزۂ خوابیدہ از زمیں برخاست
نشست یار، دمِ نزع، بر سرِ بالیں — قیامتے عجبے روز و اپسیں برخاست
مگر شکستہ پری یادِ آشیاں می کرد — سحر ز کنجِ قفس نالۂ حزیں برخاست

نشانِ تیرِ تو باشم اگر کماں ایں است — جگر بہ خم فروشم اگر سناں ایں است
ز بوستاں گل تو چیدو آشیانم سوخت — یکے ز ننگ دلی ہائے باغباں ایں است
بہر زمیں کہ رسیدم سپہر بر سر بود — بکام دل نہ نشینم گر آسماں ایں است

ہر رگِ ابرِ ز مژگانِ ترم ساختہ اند ۔۔۔ برقِ رخشندہ ز آہِ جگرم ساختہ اند

گلِ مزار مرا ہر کسے کہ بو می کرد ۔۔۔ ز بس فسردہ دلی مردن آرزو می کرد
بسوئے قبلۂ کویت دمے کہ رو می کرد ۔۔۔ بہ آبِ دیدۂ تر، مردمک، وضو می کرد
ز بیمِ دشنۂ تیز تو، کلکِ صورت گر ۔۔۔ شبیہ را دمِ تصویر بے گلو می کرد
ز خوش گوارئ آبے کہ خنجرت می داشت ۔۔۔ بہ یک دگر، لبِ ہر زخم گفتگو می کرد

بے حجابانہ بروئے تو نگاہے می کرد ۔۔۔ میتواں گفت کہ آئینہ گناہے می کرد

دیشب سرم ز بالشِ آرام دور بود ۔۔۔ اے خوابِ مرگ، چارۂ دردم ضرور بود

حزیںؔ کی زمین میں کہی ہوئی غزل کے چند شعر ؎

شب آرائشِ محفل رُخِ زیبائے تو بود ۔۔۔ شمع تا وقتِ سحر محوِ تماشائے تو بود
وقتِ جولانِ تو آشوبِ قیامت برخاست ۔۔۔ فتنۂ روزِ جزا، قامتِ رعنائے تو بود
روشن از شمعِ رُخت محفلِ غیر است اکنوں ۔۔۔ یاد آں روز کہ در کلبۂ من جائے تو بود

لختِ دل بر یکدگر در دیدۂ تر یافتم ۔۔۔ من دریں دریائے خوں کبریتِ احمر یافتم
بر سر افشاندم غبارِ دشت و افسر یافتم ۔۔۔ من بہ اقبالِ جنوں تاجِ سکندر یافتم
تیغ بر فرقم زدی، خنجر شکستی در جگر ۔۔۔ راحتِ دل، کامِ جاں، آسایشِ سر یافتم
از لب و رخسار و زلفِ عنبر افشانِ کسے ۔۔۔ آبِ دیگر رنگِ دیگر، بوئے دیگر یافتم
چند پُرسی ماجرائے ساحرِؔ بیمار دل ۔۔۔ ناتوانی را دبال روئے بستر یافتم

ز باغ رفتی و افسردہ شد چمن بے تو ۔۔۔ قبائے گل شدہ بر دوشِ گل کفن بے تو
مرا است کنجِ قفس خوشتر از چمن بے تو ۔۔۔ چراغِ گور بہ از شمعِ انجمن بے تو
بجستجوئے نشانِ تو گم شدم از خویش ۔۔۔ بیا بہ بیں کہ گذشتم ز خویشتن بے تو
بدشت و بادیہ مجنوں، بہ بے ستوں فرہاد ۔۔۔ بخاک و خوں نہ تپید آں قدر کہ من بے تو
ز بزم گاہِ سخن رفتہ کجا ساحرؔ ۔۔۔ نماند گرمئ ہنگامۂ سخن بے تو

چشم شوخے کہ بماداشت نگاہے گاہے | آں ہم از بیم رقیباں سرِراہے گاہے
درد ہجراں نگذارد کہ نشینم خاموش | ضعفِ قوت ندہد رخصت کہ آہے گاہے
بجہ تقریب شبے بزم ط ب افروزم | من کہ در خواب ندیدم رُخ ماہے گاہے
در دیارے کہ ضعیفاں محبت باشند | کہربائے نربایدپر کاہے گاہے
بس کہ افسردہ دل از دہر گزشتی ساحر | بر مزار تو نہ شد سبز گیاہے گاہے

باآں کہ صد خدنگِ تو در پہلویم نشست | دارم بدل ہنوز مقام سناں تہی
دل تاجگر پُر است ز داغِ جفاوے | دارم ز داستانِ شکایت زباں تہی

ریاض الفصحا ص ۱۳۲ ،
روز روشن ص ۲۷۸ ، طور معنی قلمی ، گلدستہ مشتاق قلمی ۔
مشاہیر کاکوری ص ۳۰۸

## خواجہ محمد حسین ساماںؔ

خواجہ نرس دہلوی کے بیٹے لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق ہوا ۔ مصحفی کہتے ہیں کہ "ایک روز اپنا کلام اصلاح کے لیے میرے پاس لایا میں نے اس کی طبیعت میں لطافت دیکھی تو مستقل فکر سخن کا مشورہ دیا ۔ اب دو سال ہو چکے ہیں جو کچھ لکھتا ہے وہ مجھ سے درست کراتا ہے "۔

ساماںؔ کی نغمہ سنجی دل پہ اثر کرتی ہے ۔ اس کے کلام میں اگرچہ کہیں کہیں زبان قدیم کا تتبع پایا جاتا ہے پھر بھی جو کچھ کہا ہے وہ غنیمت ہے ۔

الٰہی تشنہ لب تھی روح کس رندِ شرابی کی ۔۔۔ مئے گلگوں کا ساغر دستِ ساقی میں چھلکتا تھا
ہمارے نالۂ شبگیر کی شہرت تھی جب ساماںؔ ۔۔۔ تو پھر مرغِ سحر بھی باغ میں چلّا نہ سکتا تھا

---

منہ نمک سے بھر دو میرے زخم کے ناسور کا ۔۔۔ کون احساں سر پہ لیوے مرہم کافور کا
بسترِ خارِ مغیلاں، فرشِ مخمل ہے مجھے ۔۔۔ خاکِ صحرا کو سمجھتا ہوں میں دامن حور کا

---

تیغِ ابرو کے تلے سجدہ کرے تو جانوں ۔۔۔ اے برہمن بہت آساں ہے مسلماں ہونا
آستیں اُس نے چڑھائی تو ہوا قتلِ جہاں ۔۔۔ تیغِ خوں ریز کا اچھا نہیں عریاں ہونا
اے شبِ ہجر دکھانا نہ سیاہی اپنی ۔۔۔ گور میں نورِ سحر بن کے نمایاں ہونا
یہ بہت دور ہے ہمت سے تری اے ساماںؔ ۔۔۔ چھوڑنا مرگ کو اور زیست کا خواہاں ہونا

---

نوکِ مژگاں تک مرا زخمِ جگر گر آئے گا ۔۔۔ رشک سے ابرِ بہاری خوں ہی برسائے گا
مت اُٹھا اے دستِ رشکی روئے جاناں سے نقاب ۔۔۔ میں بہت کم حوصلہ ہوں مجھکو غش آجائے گا
یاد جب آجائے گی اُس گُل کے چہرے کی بہار ۔۔۔ ہے یقیں ساماںؔ چمن میں جی مرا گھبرائے گا

---

اس قدر ایذا نہ دے اے دردِ رنجوری مجھے ۔۔۔ گور تو نزدیک ہے گر اس سے ہے دوری مجھے
خواب مرقد میں جو آزادی سے ہیں راحت طلب ۔۔۔ جانتے ہیں قیدیٔ زندانِ مہجوری مجھے

---

صحنِ گلشن میں گھٹا دیکھ کے کالی کالی ۔۔۔ چہچہے مرغِ چمن کرتے ہیں ڈالی ڈالی

---

عالم نظر آتا اگر اُس شعلۂ رُخ کا ۔۔۔ جاتے نہ پتنگے سرِ شمع پہ جلنے
شبنم نہیں پڑتی ہے تو، ہن، افعی، صحرا ۔۔۔ آتے ہیں مرے سبزۂ تربت پہ اُگلنے
رنگتِ گُلِ رخسارۂ خوباں میں بھری ہے ۔۔۔ کیا کیا قلمِ صنعتِ نقاشِ ازل نے
وا چشم نہ ہوگی طرفِ چہرۂ قاتل ۔۔۔ شرمندہ کیا ہے مجھے تاخیرِ اجل نے
ساماںؔ ہے اسیرِ سرِ ہر موئے دلِ غمگیں ۔۔۔ پاتا ہے کوئی حلقۂ گیسو سے نکلنے

---

# مرزا لطیف علی بیگ پسند

ولد مرزا دائم بیگ، خلف منعم بیگ رسالہ دار۔ لکھنؤ کے باشندے۔ وطن ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ مہذب الاخلاق اور عقیدت کیش جوان تھے مقتضائے طبیعت نے فکر سخن کی طرف راغب کیا لیکن اوّل اوّل زیادہ شغوبیت نہ تھی۔ رفتہ رفتہ جب کسی قدر مشق نے ترقی کی تو استاد کی تلاش ہوئی اتفاق سے ان کی ملاقات محمد صابر شمیم سے ہو گئی۔ شمیم نے ساتھ لے جا کر انھیں اپنے استاد شیخ مصحفی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہاں جلد ہی غزل گوئی میں قدرت تامہ حاصل کر لی۔ منتخب کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

میں اسیر غم کہاں اور کوچۂ قاتل کہاں — یہ نہیں معلوم جا کر دل ہوا گھائل کہاں
بیٹھ کر مجھ سے اٹھا جاتا نہیں اے ہمرہاں — مجھ نحیف و زار سے طے ہو سکے منزل کہاں
کشتیٔ صد پارہ کے تختے پہ ہوں میں جاں بلب — دیکھئے لے جائے یہ دریائے بے ساحل کہاں

---

جانتے تھے ترے ہاتھوں سے ہیں نالاں کتنے — دل دیا ہم نے تجھے ہم بھی تھے ناداں کتنے
بن چکی زلف، کہیں ہاتھ سے رکھو شانہ — ورنہ ہو جائیں گے دل اور پریشاں کتنے
گھر سے میرے ترا جانے کو نہیں جی کرتا — پاؤں پھیلائے ہیں تو نے شب ہجراں کتنے

---

ملا کرے ہے وہ ہاتھوں میں خون دل میرا — نہ اس قدر بھی کوئی مائل حنا ہووے
پسند اب تو دیا ہم نے اپنا دل اس کو — ہمارے حق میں برا ہووے یا بھلا ہووے

---

جاں لبوں پہ ہے دم شماری ہے — آج کی رات ہم پہ بھاری ہے
چین دل کو نہیں کسی کروٹ — بے قراری سی بے قراری ہے
نہیں بچنے کا میں کسی عنوان — زخم تیغ فراق کاری ہے
حرف شکوہ کا لب پہ لانہ پسند — کام عاشق کا جاں نثاری ہے

---

ریاض الفصحا ص ۱۳۷ ، خوش معرکہ اول ص ۴۳۲

## مولوی احمد علی سخنور

سخنور لکھنؤ کے باشندے مصحفی کے ان شاگردوں میں تھے جو منشی مظفر علی اسیر لکھنوی، مولوی فدا کرعلی ذاکر بنارسی اور مولوی اولاد علی کاہش جون پوری کی طرح ۱۲۳۶ھ کے بعد ان کی خدمت میں پہنچے تھے اور صرف چند سال استفادہ کر سکے تھے۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کا بیان ہے کہ آخر میں مرشد آباد چلے گئے تھے۔ سخن شعرا میں ان کے صرف تین شعر درج ہیں لیکن یہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ سخنور کی علمی استعداد بہت معقول تھی۔ کلام سنجیدہ اور صاف ستھرا ہوتا تھا اور اس میں مضمون آفرینی اور تخیل کی بلندی بھی ہوتی تھی۔ مطالعہ کیجیے ؎

آب گو ہے سخن غیر میں لیکن صاحب — کان میں گرتے ہی کر دیتا ہے بہرا پانی

لب شکر شکن اُس غیرتِ گل کا دکھانا ہے — چمن میں طوطی و بلبل کو آپس میں لڑانا ہے

اثباتِ جزوِ لا یتجزّٰی میں تھا کلام — ساکت رہا وہ غنچہ دہن انفصال ہے

---

سخن شعرا صـ ۲۱۲

---

## مرزا زین العابدین خاں سرسبز

نواب سالار جنگ کے لڑکے تھے اور عرف عام میں مرزا مینڈھو کہلاتے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ ان کا سلسلہ نسب مالک اشتر پہ منتہی ہوتا ہے اور ان کے بزرگ فرخ سیر کے زمانے میں اپنے وطن سے دہلی آئے تھے۔ معتمد الدولہ نواب محمد اسحاق خاں دہلی سے لکھنؤ آئے یہاں اُن کی لڑکی اُمۃ الزہرا بیگم نواب شجاع الدولہ سے منسوب ہوئیں جن سے نواب آصف الدولہ

پیدا ہوئے، لیکن طبوطارام کہتے ہیں :

نواب سالار جنگ اور مرزا علی خاں ابن نجم الدولہ نواب اسحاق خاں پسر مؤتمن الدولہ اسحاق خاں کلاں ابن غلام علی خاں ابن مرزا حسن شوستری کہ نسبت ان کی حلیمہ خاتون رضعہ جناب رسالت مآب علیہ السلام سے منسلک ہے۔

مرزا حسن عہد خلد مکاں اورنگ زیب میں آ کر بواسطہ اعظم شاہ عہدہ باورچی خانہ پاکر ملازم ہوئے تھے اور غلام علی خاں بھی نوکر رہے تھے۔ اسحاق خاں کلاں کچھ دن رفاقت امین الدولہ انصاری میں رہ کر محمد تقی وزیر شہزادہ اکبر ابتر کے پاس رہے

آگے چل کر شایاں لکھتے ہیں :

سالار جنگ اور مرزا علی خاں دونوں بھائی صفدر جنگ[1] کے ساتھ جنھوں نے انتظام الدولہ کی مخالفت کے باعث دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کی سکونت اختیار کی تھی لکھنؤ آئے یہاں چھ لاکھ روپے کی جاگیر اجاگیر زوجہ شجاع الدولہ کے ساتھ کہ ہمشیرہ ان کی تھیں سرکار بادشاہی سے مقرر ہوئی۔

نواب سالار جنگ کمال شگفتہ رو، خندہ پیشانی اور خوش بیان تھے۔ عمر بھر پچاس ہزار روپیہ ماہانہ ان کے صرف میں آیا۔ نغمہ و سرود کی طرف زیادہ رغبت رکھتے تھے اور اس فن میں اپنے استاد انچھارس کلاونت سے بھی بازی لے گئے تھے۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد بھی ان کے رفیق اور غلام تا زندگی گھر بیٹھے تنخواہ پاتے رہے۔

سرسبز کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی اپنے زمانے کے عام رئیسوں کے روئیے کے خلاف ابتدا ہی سے دینی کتابوں کا زیادہ شوق رہا۔ خلقی طور پر مذہب کی طرف خاص رجحان تھا فسق و فجور اور مواقع و نواہی سے دلی نفرت رکھتے تھے، خوش خلقی اور سلیم الطبعی میں

---

[1] یہ نواب فخر الدین خاں کا دوسرا لڑکا تھا، ۱۱۶۱ھ میں بخشی کا عہدہ پایا صفدر جنگ کے بعد وزارت پر فائز ہوا۔ ۱۱۷۵ھ میں عماد الملک غازی الدین خاں نے اسے قتل کرا دیا (قاموس المشاہیر اول ص ۱۱۰)

ضرب المثل تھے تعلیم کے زمانے سے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہو گئی جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی عمر ١٦۔١٧ سال کی تھی کہ مصحفی دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔ سرسبز کو نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آئی ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور چار سال تک انھیں اپنے یہاں رکھ کر فن شعر اور علم عروض سے واقفیت حاصل کی۔ انھیں دنوں کا واقعہ ہے کہ مرزا مینڈھو بیمار ہو گئے۔ علاج معالجہ ہوا اور چند روز کے بعد جب انھوں نے غسل صحت کیا تو مصحفی نے یہ قطعہ مبارک باد پیش کیا ؎

صد شکر کیا آپ نے غسل صحت — دھوئی گئی دل سے سب کے گرد کلفت
ہو غسل مبارک تمھیں مرزا مینڈھو — جب تک ہے جہاں یہ رسم رنج و راحت

سرسبز کی زبان پیاری، ادائے بیان سادہ اور کلام جذبات حسن و عشق سے بریز ہے معاملہ نگاری میں میٹھی میٹھی زبان کی آمیزش دل پر بڑا اثر کرتی ہے۔

تذکرہ نویسوں نے ان کے فضل و کمال کی کافی تعریف کی ہے۔ قائم کہتے ہیں :

" جوانے است از عمدہ زادہائے عالی مقدار نہایت با حلم و وقار عقل سلیم دارد و فہم مستقیم"۔

سرور کا بیان ہے :

" شخصے است با حلم و وقار و بہ صفت علم و قابلیت و فہم و فراست موصوف، کلامش بسیار پاکیزہ است"۔

سنہ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ بقول مولوی کریم الدین ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔

بہم رسیدہ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

جہاں کہ ہم صفیروں کو پڑی ہے خانہ ویرانی — اسی گلشن میں چھوڑ آئے تھے ہم بھی آشیاں اپنا

---

کیا حال گریہ پوچھے ہے ہمدم ہر گھڑی — اب تو نچوڑ ہے مژۂ اشکبار پر

---

ہماری آہ پہ ہنستا ہے کیا تو — دکھا دیں گے تجھے اس کا اثر ہم

---

کب خوش آتی ہے ہمیں سیرِ گلستاں تجھ بن
باغ آتا ہے نظر خانۂ ویراں[1] تجھ بن

اپنے عاشق کی نہ بالیں پہ تو آیا صد حیف
جان دی اُس نے بصد حسرت و حرماں تجھ بن

چل تو سرسبز! گلستاں میں غزل خوانی کر
بولتے واں نہیں اب مرغِ خوش الحاں تجھ بن

یہ جو کانوں میں بُتاں عقدِ گہر رکھتے ہیں
میرے آنسو ہیں کہ یکجا انھیں کر رکھتے ہیں

آپ کیجیے اُدھر علَم شمشیر
ہم ادھر اپنا سر جھکاتے ہیں

بے تکلف تھے دل کے لینے تک
ہم سے اب آپ منہ چھپاتے ہیں

کرتے ہیں جو خاکِ قدمِ یار پہ جادو
اُلٹے وہ الٰہی کہیں اغیار پہ جادو

جو دوست مرا اُس کو پیغام سناتا ہے
وہ صاف مجھے یارو دشنام سناتا ہے

شمع[2] جب چہرۂ پُر نور دکھاتی ہے مجھے
یادِ عارض میں ترے اور جلاتی ہے مجھے

خندۂ گل میں نکلتا ہے کہاں یہ عالم
ہائے کیا وضع ترے ہنسنے کی بھاتی ہے مجھے

اُس کے کوچے کی طرف میں تو نہ جاؤں سرسبز
کششِ دل ہے کہ کھینچے لیے جاتی ہے مجھے

عبیر لائی بادِ بہاری کسی کی
دوچنداں ہوئی بے قراری کسی کی

ترے ہاتھ سے بوئے مشک آئی شانہ!
مگر تو نے کاکل سنواری کسی کی

زلیخا کو یوسفؑ کا ہی دھیان گزرا
جو اس رہ سے آئی سواری کسی کی

میں سرسبز زرد ہوں آتی ہے جب یاد
وہ صورت مجھے پیاری پیاری کسی کی

شبِ انتظار گزری ہمیں انتظار کرتے
کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے

ترا یار اُس جگہ تھا نہ ہوا تو ہائے سرسبز
اگر اس گھڑی تو ہوتا تجھے ہم دوچار کرتے

منہ موڑ لیا تم نے اگر مہر و وفا سے
ہم ہاتھ اُٹھانے کے نہیں دستِ دعا سے

میں نے یہ کہا اُس سے کہ باقی ہے مری جاں
منہ پھیر کے یوں کہنے لگا میری بلا سے

۱ طبقات الشعرا میں 'زنداں' ہے۔
۲ 'مجموعۂ نغز' میں 'صبح' ہے۔

مجموعۂ نغز ص ۲۹۲ ، عمدۂ منتخب ص ۲۳۲ ، گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۷۱ ، تذکرۂ ہندی گویان ص ۱۱۸
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۱۸۵ ، سخن شعرا ص ۲۱۳ ، طلسم ہند ص ۳۰۰ ، ص ۲۰

# شیخ مراد علی سرور لکھنوی

ہدایت اللہ خاں عرف شیخ گھاسی کے لڑکے ایک صاحب علم بزرگ اور شعر و سخن کے دلدادہ شخص تھے     ایلچی خاں کی طرف سے لکھنؤ کی کوتوالی میں اخبار نویسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ نواب نور الحسن خاں نے سرور کو شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا شاگرد لکھا ہے لیکن مظفر حسین صبا کہتے ہیں کہ برہان علی خاں رہن سے تلمذ رکھتے تھے۔ سنہ ۱۲۱۰ھ میں فوت ہوئے۔ دونوں تذکروں سے صرف سات اشعار دستیاب ہوئے انھیں کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

سرور ایں راز اگر پرسی بپرس از بیدلاں ورنہ — چہ آگاہیست از راز محبت فخر رازی را

می کشد بر کشتگاں شمشیر کیں قاتل چرا — ہر کہ خود بسمل بود می سازدش بسمل چرا

اے نور دیدہ چوں ز دل و دیدہ دور رفت — از دل سرور رفت و ہم از دیدہ نور رفت

از دیدنت چگونہ تواں کرد صبر آہ — چوں آمدی تو صبر ز جانِ صبور رفت

ایں خط کافر کہ چوں حجاج ظالم پیشہ ہست — مصحفِ روئے ترا زیر و زبر خواہد نمود

آشیاں در چمنِ دہر نہ بندیم سرور — شاہبازیم و دریں بشکار آمدہ ایم

یار پرسید غمم نالہ و افغاں مددے — رفت از کار زباں، دیدۂ گریاں مددے

نگارستان سخن ص ۴۰ ، روز روشن ص ۲۹۰

# اللہ یار بیگ شاد

کیانی نسل کے ایک شاعر مصحفی کے ان شاگردوں میں ہیں جو ۱۲۳۶ھ کے بعد ان کے حلقۂ ارادت میں آئے اس لیے تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ جتنے تذکروں میں ان کا تذکرہ ہے صرف نام اور تخلص درج ہے حتیٰ کہ وطن کی صراحت بھی کسی نے نہیں کی۔ البتہ ان کے اخلاقِ حسنہ اور اشعارِ شاعرانہ کے سب معترف ہیں۔ قاسم کہتے ہیں:

"گویند کہ مرد اہل، ستودہ اطوار، قابل دوست حمیدہ کردار واقع شدہ"

سرور کا بیان ہے: "از کلامش جودت طبیعت آشکار است"

مولوی عبدالحلیم نصر اللہ خاں کی رائے ہے کہ "شاعر بے نظیر و خوش کلام"

افسوس ہے کہ ان کے صرف چھ شعر مختلف تذکروں سے دستیاب ہوئے جن کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

اگر چاک سینے کا ہم وا کریں — تو ہنگامۂ حشر برپا کریں[1]
گلعذاروں کی بے وفائی کا[2] — داغ دل پر ہے نشانی ہے[3]

خواب میں بھی لگ ہے دامن یار جو آجائے ہے — کیا ہم آغوشی کر اس کی دل للچائے ہے
نشۂ صہبائے عشق ہوش ستاں جس دل کو ہو — کیا نصیحت سے تری اے ناصحا باز آئے ہے
اپنی محفل میں وہ ہرگز بیٹھنے دیتا نہیں — بیقراری کھینچ کر پر وہاں مجھے لے جائے ہے
جز کہ اپنے یار اور غم خوار تھے وہ چل بسے — دیکھیو درماندگی کیا شاد کو دکھلائے ہے

مجموعۂ نغز ص ۲۳۶ ج ۲، عمدۂ منتخبہ ص ۲۷۳، گلشن بے خار ص ۱۰۷، گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۸۹، طبقات الشعرا ص ۳۹۵، دیوان جہاں، سخن شعرا ص ۲۳۵

---

۱؎ وا کریں کی جگہ وا کریں گے اور برپا کریں کی جگہ برپا کریں گے۔ مجموعۂ نغز

۲؎ مجموعۂ نغز میں "کے"۔ ۳؎ مجموعۂ نغز میں "ہیں"۔

# شیخ فضل علی شاد لکھنوی

غلام مصطفیٰ عرف میاں ٹینٹو کے لڑکے اور راجے خاں دہلوی کے پوتے تھے منشی امیر احمد مینائی کا بیان ہے کہ

"اجداد ان کے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے سکھیا کار تھے۔ شیخ شیر محمد اور ان کا بیٹا کبیر اور معین الدین جو عہد حضرت محمد شاہ انار اللہ برہانہ میں فن موسیقی میں کامل تھے، جن کا حال تاریخ مرآت آفتاب نما میں درج ہے وہ انھیں کی شاگردی سے مستثنائے روزگار تھے"۔

راجے خاں دہلی کے برباد ہو جانے کے بعد بہ عہد نواب شجاع الدولہ (متوفی ۱۱۸۸ھ) میں لکھنؤ وارد ہوئے۔ شاد کی ولادت یہیں ہوئی اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد شاعری شروع کی جس میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے اصلاح لی۔ بڑے ظریف الطبع خلیق اور نیک خو تھے۔ خیال گانے میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آواز بھی بڑی مترنم اور لوچ دار تھی مجلوہ ہدایت کہ یہ نواب معتمد الدولہ یا ان کے کسی مصاحب سے توسل رکھتے تھے۔ اور ان کے ساتھ کان پور چلے گئے تھے۔

ناصر نے ۱۲۶۱ھ میں ان کا قیام کان پور کا بتایا ہے مگر یہ وہاں زیادہ نہ رہ سکے تھے اور لکھنؤ واپس آ گئے تھے یہیں سے نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور نے رام پور طلب کیا۔ کافی مدت وہاں مقیم رہے۔ مرثیہ گوئی میں میاں دلگیر سے تلمذ رکھتے تھے۔ چوراسی سال کی

لہ نواب غلام محمد خاں والیٔ رام پور کے لڑکے تھے نواب احمد علی کی وفات کے بعد ۱۲۵۶ھ میں تخت نشین ہوئے ان کے عہد میں ریاست نے خوب ترقی پائی، آپ بڑے شجیع و مدبر تھے۔ عربی و فارسی کے علاوہ طب میں بھی کافی دخل رکھتے تھے اور اس فن میں حکیم مرزا محمد علی لکھنوی سے تلمذ تھا، فارسی نثر بہت عمدہ لکھتے تھے اور اس میں مرزا قتیل سے فیض پایا۔ ۱۴ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو مسلول ہو کر وفات پائی۔

عمر پائی۔ ۱۹ر شوال ۱۲۷۲ھ کو مسلول ہو کر فوت ہوئے۔ ان کے پس ماندگان رام پور میں رہے۔ شاد انگریزی، فارسی اور ناگری میں بھی مداخلت رکھتے تھے اور مختلف زبانوں کی موسیقی میں کامل تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے انھیں صاحب دیوان لکھا ہے۔ کلام کا انداز یہ ہے:

سینے سے مرے اُنسِ دلی رکھتا ہے اے شاد
ہر تار کس دل دوز مری سخت کماں کا

---

دلیلِ دشتِ محبت ہے ولولہ دل کا
پھرے خراب نہ بھٹکے کیونکہ قافلہ دل کا

فلک کو بھی وہیں چڑھ آئے تپ دلرزہ
نمود زیرِ زمیں ہو جو زلزلہ دل کا

رکھے ہے آٹھ پہر نالہ و فغاں سے کام
ہوا ہے اب تو ہمارا یہ مشغلہ دل کا

یہ خود بخود نہیں سوزش ہے اپنے سینے میں
جلے ہے عشق کی آتش سے آبلہ دل کا

کبھی میں اُس کے نہ لگ دیکھ ایک دن اے شاد
خراب تجھ کو کرے گا یہ ولولہ دل کا

---

مفت اس تیز نگہ کا ہوا بسمل ٹھنڈا
نہ ہوا قاتلِ خوں خوار کا پر دل ٹھنڈا

قیس کرتا تھا دعا حق سے یہ لیلیٰ کے لیے
سایۂ ابر سے ہر دم رہے محمل ٹھنڈا

سرد دل ہو گیا اس خال کے بوسے سے مرا
گرچہ تل گرم ہے پر یار کا ہے تل ٹھنڈا

تیغ کھینچے ہوئے آتا ہے بہت گرم وہ شوخ
یا خدا ہو وے کہیں غصۂ قاتل ٹھنڈا

جا کے دریا پہ لگا شاد سے کہنے وہ شوخ
فرش وہاں کرنا جہاں خوب ہو ساحل ٹھنڈا

---

اب تو بیڈھب ہے کشش میرے دلِ بیتاب کی
تو سہی گھر پہ مرے وہ آئے بے تابانہ آج

---

جب قرن رخ میں قائم خورشید رخ ہوا
سہرے کے تار منہ پہ پڑے تھے کرن کی طرح

---

بنا ہے برق وش دونوں کا کیا حال
مرا بے چین تیرا چلبلا دل

نہیں سُنتا کبھی وہ دردِ دل کا
عجب بے درد کے پالے پڑا دل

عجب کمبخت وہ ساعت تھی اے شاد
لگا تھا جس گھڑی اس سے مرا دل

---

عدو سے یار نے کی جب سے ترکِ یاریٔ دل
خرابی کون سی لائی نہ مجھ پہ خواریٔ دل

بات کرتے ہو رقیبوں سے جو دانائی سے      چپکے بیٹھے ہوئے ناداں سے ہم دیکھتے ہیں

---

سراپا سخن ص۲۶۶، خوش معرکہ زیبا اول ص۳۷۲، انتخاب یادگار ص۱۵۱، سخن شعرا ص۲۳۹

---

# منشی خوشوقت رائے دانگی شاداب

چاندپور نگینہ کے ساکن تھے۔ سرور نے انہیں کائستھ لکھا ہے لیکن حافظ غلام محمد آزاد کھتری بتاتے ہیں۔ ابتدائے عمر سے تحصیل علم و ہنر کی طرف راغب ہوئے اور سرعت کے ساتھ ضرورت کے مطابق قابلیت حاصل کر لی۔ خوش خلق اور نیک سیرتی کی بنا پر حلقۂ احباب میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ خوش نویسی میں ید طولیٰ حاصل تھا خط نستعلیق شاہ اعزالدین سے سیکھا تھا اور خط شکستہ میر علی تقی سے یہ دونوں باکمال اُن کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اس فن سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے آقا عبدالرشید اور کفایت خاں کی لکھی ہوئی وصلیاں خرید کی تھیں۔

نثر نویس بھی بہت اچھے تھے اور شاعر بھی خوب تھے۔ شاعری کا آغاز شیخ محمد قائم کے ایماء سے کیا تھا اور ابتدا میں انھیں سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ ۱۱۷۰ھ میں قائم دہلی سے وطن چلے آئے۔ تو شاداب دہلی میں استاد کے بغیر رہ گئے۔ انھیں دنوں میں مصحفی لکھنؤ سے دہلی آئے تو شاداب کو قائم کا نعم البدل مل گیا اُن سے مشورہ کرنے لگے۔ سخن شعرا میں اسی بنیاد پہ شاداب کو قائم و مصحفی دونوں کا شاگرد لکھا گیا ہے منتخب کلام یہ ہے ؎

سہتے ہیں جو یہ جور تیرے ہیں نہ ہمیں سخت      لے وائے کریں کیا کہ فلک دور زمیں سخت

دیکھ اس کے رُخ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں ‌ ‌ کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

بس ہو چکی شفا تو دلِ زار کے تئیں ‌ ‌ اے کاش موت ہو ترے بیمار کے تئیں

کہتا ہمیں نہ شیخ کہ پڑھ قبلہ رو نماز ‌ ‌ گر دیکھتا اُس ابروئے خمدار کے تئیں

جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا ‌ ‌ تیر کے ہوتے بھی کھینچے ہے کوئی تلوار کو[1]

---

سخن شعرا ص۲۳۶، گلشن ہند مبتلا ص۱۶۵، دو تذکرے جلد دوم ص۲۸،
تذکرہ خوش گویاں ص۱۲۱، عمدہ منتخبہ ص۳۷۱، مخزن نکات ص۱۸۷

---

## شیخ امیر الدین آشاغل

شیخ عبد القادر کے لڑکے تھے اور بقول مولوی عبد الغفور خاں نساخ عام طور پہ امیر اللہ مشہور تھے۔ ان کا خاندان، مولویوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ کڑہ مانک پور کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا۔ مزاج میں سخاوت کا مادّہ بہت تھا۔ کبھی کسی سائل کو اپنے در سے مایوس نہیں بھیجا۔ الہ آباد کے نامی گرامی وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ شعر و سخن سے طبعی مناسبت ضرور تھی لیکن مستقلاً اس کی طرف متوجہ نہ رہے۔

ان کی شاعری کے بارے میں کلب حسین خاں نادر کا یہ مقولہ سند کی حیثیت رکھتا ہے

"گاہ گاہ فکر سخن میکند، در حقیقت طبعش بہ ایں فن نہایت رسا واقع شدہ است" (شوکتِ نادری قلمی)

آشاغل کے تین لڑکے تھے۔

---

[1] تیر کے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو، (سخن شعرا)

۱۔ مولوی زین العابدین عابدؔ الہ آباد میں طالب علمی کر رہے تھے اور اعلم العلما، افضل الفضلا جناب مولوی سید زین العابدین صاحب کی خدمت میں شرح جامی کا درس جاری تھا۔ یہ زمانہ شوکت ناردی کی تصنیف کا تھا۔ انکا ایک شعر یہ ہے ؎

"در ہجر تو لاغر شدم چوں رشتۂ گوہر شدم    از موئے تو کمتر شدم اے نازنیں اے مہ جبیں"

مولوی زین العابدین عابدؔ ضلع غازی پور میں منصفی کے عہدے پر ممتاز رہے جب حکیم سید عبدالقادر مکّی کے دست حق پرست پر بیعت کی تو منصفی سے مستعفی ہو کر بقیہ عمر یاد حق میں گزار دی۔ حافظ کڑوی نے اس واقعہ پر یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے ؎

بھائی مولانا وحید الدین کے زین العابدین    تھے جو غازی پور میں منصف بڑے حامئ دیں
قادر مکّی سے بیعت کر کے مستعفی ہوئے    یاد حق سے ہو کے واصل ہوئے جنت چل بسے

انھوں نے ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی۔ مولوی محمد علیم علیمؔ الہ آبادی نے یہ تاریخ لکھی ؎

اوّلیں روز از ربیع نخست    چوں علیم از قضا رسیدش پیک
مولوی زین العابدین در دم    گفت یا داعئ اجل لبّیک
رحمتِ انس و ملک چرند و پرند    گفت ہر یک بسانش سلامٌ علیک

سلام علیک کے اعداد ۲۶۱ ہوتے ہیں ان کو پانچ (رحمتِ انس وچرند وپرند وملک) سے ضرب دی جائے تو سن مطلوب ۱۳۰۵ھ برآمد ہوتا ہے

۲۔ دوسرے لڑکے مولوی محمد یوسف تھے۔ یہ ابتدا میں امینِ عدالتِ دیوانی رہے۔ پھر امانت چھوڑ کر ریاست جے پور چلے گئے اور کچھ مدت وکالت کرنے کے بعد وہیں انتقال کیا۔

تیسرے لڑکے مولوی وحید الدین محمد وحیدؔ تھے۔ یہ وہی وحیدؔ ہیں جن کے تلامذہ میں خان بہادر سید اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی اور شاہ محمد اکبر اکبرؔ داناپوری جیسے نامور شعرا گزرے ہیں۔ وحیدؔ پر ہمارا ایک مفصل مضمون رسالہ قومی زبان کراچی میں شائع ہو چکا ہے

مولوی امیر الدین شاغل کے دو بھائی بھی تھے۔ ایک مولوی عطاء اللہ عاقل دوسرے مولوی فصیح اللہ قائل۔ ان میں صرف قائل مصحفی کے شاگرد تھے اور ان کا تذکرہ موقع پر کیا گیا ہے اور عاقل کے استاد کا پتہ نہیں چل سکا۔

شاغل کے سن وفات کی تحقیق نہ ہو سکی۔ ایک دیوان مکمل تھا لیکن اب اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔

| | |
|---|---|
| بے قراری سے مری آہ وہ آگاہ نہیں | جس کا میں چاہنے والا ہوں اُسے چاہ نہیں |
| یونہی ایام جدائی جو رہیں گے شاغل | ہے یقیں میں نہیں یا نالۂ جانکاہ نہیں |

---

شوکت نادری قلمی ص۱۰۱، سخن شعرا ص۲۳۸، عمدۂ منتخبہ ص۳۸۸
مسلم شعرائے بہار جلد سوم ص۲۱، تذکرۃ المعاصرین ص۱۹۵

---

## لالہ سیوا رام شائق

لکھنؤ کے باشندے ایک شوریدہ مزاج آدمی تھے۔ اوّل اوّل جو کچھ نظم کرتے تھے اس میں مرزا علی نقی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ جب اس فن میں کسی قدر استعداد بہم پہنچ گئی تو مصحفی کی خدمت میں آ گئے۔ اس وقت لکھنؤ میں معنی بند شاعری کا بازار گرم تھا جسے مصحفی ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے شائق نے اس دروازے کو چھوڑ کر خواجہ حیدر علی آتش کی طرف رجوع کیا بعد میں استاد کی طرف داری میں ناسخ سے اُلجھ پڑے۔ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ :-

" خواجہ صاحب کی حمایت سے شیخ ناسخ کے منسوخ کرنے کا ارادہ باندھا اور

جواب اُس کی ہر غزل کا لکھا۔ شدہ شدہ یہ خبر شیخ ناسخ تک پہنچی۔ یہ غزل کہ نتیجہ اس قضیے کا ہے شیخ ناسخ نے لکھی ؎

کہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیوان کا جواب
بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

کب کلیم اللہ سے نسبت ہے اُس ناپاک کو
چاہیے فرعون کو دے اپنے ہاماں کا جواب

چونکہ لفظ ہاماں خواجہ صاحب کی طرف عائد ہوتا تھا آتش نے یہ مطلع کسی شاگرد کو کہہ دیا ؎

چاہیے مومن کو دے اس نامسلماناں کا جواب
جو کہے دیواں کو اپنے ہے یہ قرآں کا جواب

جب نوبت یہاں تک پہنچی لالہ سیوارام تخلص شائق بہ سبب خوف شاگردان شیخ ناسخ صاحب کے لکھنؤ سے کان پور چلا گیا اور وہاں مقیم رہا اور شیخ صاحب کی فضیحتی پر کمر چست باندھی

سیوارام شائق کا ایک شاگرد بھی تھا جس کا نام بانکے بہاری تھا۔ یہ برہمن زادہ لکھنؤ کا رہنے والا شجاعت تخلص کرتا تھا. اور کان پور میں اپنے استاد کے ساتھ رہتا تھا لیکن بعد میں کسی بات پر ناراض ہو کر لکھنؤ چلا گیا تھا.

شائق کے رنگ سخن کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

حسینوں پہ ازل سے دل ہے مجھ دیوانے کا جھڑکا
کھلونے تھے مرے مٹی کے بریں جب میں تھا لڑکا

لگا جاتا ہے برچھی آتے جاتے گور پہ میری
ملا یہ پھل مجھے اس جنگجو سے دل لگانے کا

وقار انساں کا کھو دیتا ہے آخر خندۂ بے جا
دہن ہوتا کشادہ عیب ہے موتی کے دانے کا

گور میں ہوگا خیالِ یار سے روشن چراغ
روشنی دکھلائے گا مجھ کو پس مُردن چراغ

یوں مرے لخت جگر ہیں دیدۂ پُر آب میں
جیسے لہراتی ہیں گلگوں مچھلیاں تالاب میں

دیکھ وہ آئینہ ہنستا ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
پھلجھڑی کو جس طرح سے چھوڑتے ہیں آب میں

بخت خفتہ نے نہ پل بھر آنکھ لگنے دی مری
یار نے جس شب کیا آنے کا وعدہ خواب میں

ہر حباب بحر بن جاتا ہے نافہ مشک کا
کھول کر زلفیں نہاتا ہے وہ جس دم آب میں

ابلہی ہے ڈھونڈتا زیر فلک آسودگی
گاؤ کو فربہ نہ دیکھا خانۂ قصاب میں

اُس کی نورانی جبیں پر داغ چیچک کے نہیں — موتیا کے پھول پھولے ہیں شب مہتاب میں

---

عالمِ وحشت میں یاد آیا جو سروِ قدِ یار — خوب رویا میں لپٹ کر نخلِ صحرائی کے ساتھ

وہ فراغت سے رہا، ہم زندگانی سے ہے تنگ — خضر کو نسبت نہیں کچھ اپنی تنہائی کے ساتھ

تخمِ الفت ہو کے پامالِ حسیناں ہو گئے — مل گئے مٹی میں شائقؔ اپنی دانائی کے ساتھ

---

سیریٔ عالم مرے اشکوں کی طغیانی سے ہے — زندگانی جملہ مخلوقات کی پانی سے ہے

چار دن بھی رنگِ گل ہرگز وفا کرتا نہیں — اس لیے مجھ کو گریز اس گلشنِ فانی سے ہے

میری دھونی پر پریزادوں کا رہتا ہے ہجوم — بوریا بہتر مرا تختِ سلیمانی سے ہے

گو ہزاروں ہیں یہاں مرغِ خوش الحاں نغمہ سنج — رونقِ گلشن تری شائقؔ غزل خوانی سے ہے

---

قیدِ ہستی میں نہایت تنگ دل کا حال ہے — مرغِ جاں کو، سلسلہ تارِ نفس کا، جال ہے

پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے واں کی زمیں — میرے نالوں سے یہ کوئے یار میں بھونچال ہے

سلسلہ مجنوں سے جاملتا ہے مجھ آزاد کا — جرم آہو، بید کی ٹہنی، چھڑی رومال ہے

کیوں نہ ہو اس پہ بھلا مجھکو ہزارے کا یقیں — دیدۂ گریاں مشبک صورتِ غربال ہے

---

ریاض الفصحا ص ۱۳۶، خوش معرکہ دوم ص ۵۶، سرو چراغاں قلمی

---

## شیخ عبد الرؤف شعور بلگرامی

شیخ حسن رضا عرف بستی میاں ابن شیخ وحید الدین کے لڑکے اور اصلاً بلگرام کے ساکن تھے۔ اپنی ایک مثنوی میں بلگرام کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

ممتازِ جوار بالیقیں وہ — ہے مردم خیز سرزمیں وہ

والد بھی یہیں ہوئے تھے پیدا — دو پشت سے وہ دیار چھوٹا
وہ شیخ حسن رضا ہیں مشہور — ہیں واصل حق جناب مغفور
جس روز سے بے پدر ہوا ہوں — میں دُرِّ یتیم ہو گیا ہوں

شعورؔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے یہیں نشو و نما پائی اور یہیں تعلیم حاصل کی مصحفی کے بیان کے مطابق اپنے برادر بزرگ منشی محمد ظہور ظہورؔ کے بعد جو ۱۲۳۱ھ میں اُن کے شاگرد ہوئے تھے یہ حلقۂ شاگردان مصحفیؔ میں داخل ہوئے اس حساب سے ۱۲۳۶ھ میں تکمیل ریاض الفصحا کے وقت تک اُنھیں زیادہ سے زیادہ تین چار سال اُستاد سے فیض اصلاح حاصل کرنے کا موقع ملا ہوگا اور چونکہ مصحفیؔ نے ۱۲۳۶ھ میں ان کی عمر ۲۱ سال ظاہر کی ہے اس لیے آغاز شاعری و شاگردی کے وقت وہ ۱۷ سال کے ہوں گے مصحفیؔ کہتے ہیں ؎

"بمقتضائے موزونیٔ طبع خیال گفتن شعر بندی را در سر جا دادہ ...
... ذہنے رسا و طبع ممیزہ دارد۔"

اور اسی کے ساتھ یہ پیش گوئی بھی کی ہے۔

"اگر چندے مشق نمود دریں فن از بے نظیراں روزگار خواہد شد"

استاد کی یہ پیش بینی اور پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور شعورؔ نے اپنی مشق و مزاولت سے لکھنؤ کی دنیائے شاعری میں اچھا خاصہ اثر قائم کیا اگرچہ وہ تلامذہ آتشؔ و ناسخؔ کے مقابلے میں نمایاں نہ ہو سکے لیکن اس سے اُن کے کامل فن ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ شعورؔ اوّل اوّل اُردو ہی کہتے تھے لیکن آگے چل کر وہ فارسی میں بھی فکر کرنے لگے۔ اپنے معاصرین کے ساتھ اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مظفر حسین صبا نے لکھا ہے کہ میرے والد ماجد مولوی یوسف علی کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے۔

شعورؔ کے سال وفات کی تحقیق نہیں ہو سکی یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا کوئی مکمل

دیوان فارسی یا اردو، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کہیں موجود ہے یا نہیں، البتہ ان کی ایک مثنوی کا پتا ضرور ملتا ہے جو حافظ محمود شیرانی کے کتب خانے میں تھی اور اب دانش گاہ پنجاب میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی ایک عاشقانہ داستان محبت ہے جسے ۱۲۵۳ھ میں شعور نے گلزار نسیم کی بحر اور تقریباً اسی انداز میں تصنیف کیا تھا۔

شعور کے شاگرد تو کافی تھے مگر ان میں مولوی احمد علی کامل، محمد رضا صبر، عبدالرحیم نسیم، اور ظہور الدین احمد ظہور و لئیق کاکوروی اچھا کہنے والوں میں تھے۔ اور ان میں سے اکثر صاحب تلامذہ ہوئے۔ اب کلام کا مطالعہ کیجیے ؎

حق تعالیٰ نے تجھے رشکِ قمر پیدا کیا　　کم تر اس انداز کا کوئی بشر پیدا کیا
شور سر میں، درد دل میں، آبلے پاؤں میں ہیں　　ہم نے یہ نخلِ محبت کا ثمر پیدا کیا

---

تا مرے خون سے دمِ قتل نہ ہو تر دامن　　باندھ لیتا ہے کمر سے وہ ستمگر دامن

---

جو دشتِ نجد کو لیلیٰ کبھی سوار ہوئی　　تو روحِ قیس رواں پیچھے جوں غبار ہوئی
شعور ہو گئے صحرا میں خار تک بھی ہرے　　جو مثلِ ابر مری چشم اشک بار ہوئی

---

سیاہ بخت ازل ہوں کہاں یہ میرے نصیب　　کہ قتل کر کے مجھے آپ سرخرو کرتے
شعور یاد جو آئی وہ بادہ پیمائی　　تو ہوش جاتے رہے بس سبو سبو کرتے

---

گلشن میں تیری زلف جو اے سیمبر کھُلی　　ہر غنچہ مشتری ہوا اور مشتِ زر کھُلی
نکلا نہ کام ناخن تدبیر سے ذرا　　دل کی گرہ نہ میری کبھی عمر بھر کھُلی
پرواز کر ہی جائے گا صیاد مرغِ روح　　کھڑکی نہ فصلِ گُل میں قفس کی اگر کھُلی
اتنا شعور خوابِ فراغت نہ چاہیے　　تیری نہ آنکھ اب تلک اے بے خبر کھُلی

---

جنبش لب کا گماں ہوتا تھا عاشق کو ترے　　اس قدر لطفِ خموشی تری تصویر میں تھا

---

خاک بر سر ہم پھریں صحرا میں رسوائی کے ساتھ　　یار ہو آئینہ اس خود آرائی کے ساتھ
عشق میں اس شوخ کے پہنچے قریبِ مرگ ہم　　ناتوانی بھی گئی اپنی توانائی کے ساتھ

---

عارض سے کس کے ہے یہ مشابہ جو ہر سحر — کرتا ہے آسماں، درِ شبنم نثارِ گُل
اُس کے زوالِ حُسن کے دن آئے جب قریب — بادِ صبا بھی ہو نہ سکی غم گسارِ گُل
اے عندلیب اشیفتۂ رنگ و بُو نہ ہو — نادان! اس چمن میں نہیں اعتبارِ گُل

---

شعورؔ اس بلاغ سے جانا تھا مثلِ بُوئے گُل ہم کو — ٹھہر کر راہ میں کیوں ہم نے کھوٹی اپنی منزل کی

آخر میں اس رنگ کی شاعری کرنے لگے تھے

اے کاش! دل کو عشقِ حقیقی سے راہ ہو — دریائے معرفت میں یہ کشتی تباہ ہو
ہوں شکلِ خار مستحقِ خلعتِ بہار — گُل کی قبا ہو غنچۂ گُل کی کلاہ ہو
نقطہ بڑھایا چہرے پہ سہرے کے خال نے — تا حُسن سے نباہ جو چاہے تباہ ہو
یا سر فراز کیجیے یا قتل کیجیے — وارفتۂ جمال کی کوئی تو راہ ہو
بخشش کی وجہ کثرتِ عصیاں ہے اے شعورؔ — تعزیر کی بھی حد ہو جو حصرِ گناہ ہو

---

خونِ بسمل سے کرے جو مشق خطِ شمشیر پہ — کیوں نہ ہو وہ معترض حدّاد کی تحریر پہ
شدّتِ تپ کا بُرا ہو بھاڑ میں جائے جنوں — گندمِ بریاں کا شک ہے دانۂ زنجیر پر
جو لکھا قسمت کا ہے وہ مٹ نہیں سکتا شعورؔ — کون دے اصلاح خطِّ کاتبِ تقدیر کو

---

صورتِ خوانِ تہی ہے آسماں بالائے سر — جا نہ اے دستِ تہی تو بہرِ ناں بالائے سر
عیب بیں کو کیا ہو اپنے عیبِ مخفی پہ نظر — دیکھ سکتی ہیں بھلا آنکھیں کہاں بالائے سر
آسماں سے کون لے احسانِ تاجِ خسروی — اُٹھ سکے گا کس سے یہ بارِ گراں بالائے سر
بحرِ اُلفت کا شناور ہوں مجھے کیا باک ہے — ہو جو آبِ تیغ کا دریا رواں بالائے سر
یہ نظر آتا ہے ضبطِ اشک میں مجھ کو شعورؔ — چشمِ گریاں ہوں عیاں فوّارہ ساں بالائے سر

---

بے پیر بتوں سے دوستی کی — دل نے ہم سے یہ دشمنی کی
چھوٹا بیمار تیرا غم سے — عاشق کی قضا نے مخلصی کی
ہمت جو خدا کرے عنایت — منت نہ اُٹھائیے کسی کی

ساقی نے جو دردِ مے پلائی　　شیخ و زاہد کی کرکری کی
مصحف ہے شعورؔ جس کا ایماں　　سمجھے گا وہ قدر مصحفیؔ کی

---

رونق پذیر کب ہو سہارے کی شاعری　　بوچھوں اُڑے نہ کاٹھ کا گھوڑا کسی طرح

عبدالرؤف شعورؔ۔ نور ا　　حصہ اول ص۵۶۳

---

فروغ زاہد مکار و تر دامن ہے لا یعنی
سمجھیے چاندنی برسات کی زہد زیائی کو　　ص۵۶۶

---

## فارسی

نے صیاد نے نسیمِ سحر است　　طائرِ رنگِ زخم نامہ بر است
ظلم کردی چہ قیامت کردی　　بر سرِ نیزہ ہا سرِ نامہ بر است

---

اے غنچۂ باغِ دلم، سروِ روان کیستی　　بیمارِ ہجراں توام، آرامِ جانِ کیستی
در دیدہ و دل جائے تو، خلق خدا شیدائے تو　　من اے صنم جویائے تو، تو میہمان کیستی
ممنون احسانت شوم، مجروح پیکانت شوم　　قربان ترکانت شوم، ابرو کمانِ کیستی
چوں شمع مارا سوختی[1] آتش بجاں افروختی　　خوش وضع جور آموختی، از دودمانِ کیستی

---

ریاض الفصحا ص۱۶۱، عمدہ منتخبہ ص۳۶۷، خوش معرکۂ زیبا اول ص۵۰۵
روز روشن ص۳۴۸، خمخانۂ جاوید پنجم ص۴، دیوان غریب ص۲۵۶

---

[1] روز روشن میں یہاں بھی سوختی ہی لکھا گیا ہے۔

# بندہ علی شفق

لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ناصر نے ان کا ذکر دو مقاموں پر کیا ہے ایک جگہ ان کا نام میاں بندہ علی لکھا ہے، دوسرے مقام پر مرزا بندہ علی۔ مصحفی کہتے ہیں کہ

"جوان مہذب الاخلاق ہے۔ چند سال پیشتر جب میں نے از سرِ نو بنیاد مشاعرہ رکھی تھی تو یہ شامل مشاعرہ ہوتا تھا اسی وقت میرے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہوا تھا اور چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔

مصحفی نے یہ واقعہ ان کی عمر کے تیسویں سال کا بتایا ہے اس کے بعد شعر و شاعری کا مشغلہ چھوٹ گیا یا اور کوئی امر مانع ہوا کہ بتیس سال تک شفق بحیثیت شاعر نظر نہیں آئے جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو پیر بخش مسرور کی شاگردی اختیار کی۔ دین داری اور حق پرستی کے اوصاف رکھتے تھے۔ سال وفات کا علم نہ ہو سکا۔ کلام یہ ہے۔ جس میں دونوں دور کے اشعار شامل ہیں ؎

اس لاغری پہ رنج دہ دو جہاں ہوں میں
ہر چند ہوں سبک پہ دلوں پہ گراں ہوں میں

اے اضطرابِ دل نہ تصور چمن کا کر
رہنے دے مجھ کو باغ میں بے آشیاں ہوں میں

بیخود کیا ہے عشق نے ایسا کیا کہ ان دنوں
معلوم کچھ نہیں مجھے یارو کہاں ہوں میں

رہتا ہے دھیان اس کا شب و روز اے شفق
جاتا ہوں جس مکان میں، رہتا جہاں ہوں میں

---

یہی لکھا تھا خدا نے مری تقدیر کے بیچ
دل پھنسے جا کے تری زلفِ گرہ گیر کے بیچ

تیری چاہت میں شفق کا ہے میاں حال تباہ
نہ وہ تحریر میں آتا ہے نہ تقریر کے بیچ

---

آتی ہے گور میں جو صدا تیشے کی مجھے
شاید مرے مزار سے ہے کوہکن قریب

---

سودا رہے گا یہ مرے دستِ جنوں سے
ناصح نے گریباں جو سلایا تو ہوا کیا

---

ریاض الفصحا ص۱۵۲۔ خوش معرکۂ اول ص۱۵۴ و ص۵۰۱

# نواب اصغر علی خاں شکیب

خلف معین الدولہ نواب عنایت علی خاں خلف نواب شجاع الدولہ والی لکھنؤ۔ مصحفی کا بیان ہے کہ بمقتضائے موزونی طبع کچھ مدت سے شعر و سخن کی طرف مائل ہیں مدت تک کسی سے مشورہ نہیں کیا آخر کار "چوں عرایس افکار خود را بمشاطگی خامہ اصلاح فقیر رسانید و ابتدائے کار انتہا کرد۔"

کلام یہ ہے ؂

رو چکا جان کو میری دل نالاں میرا
ہو چکا آہ مسیحا سے بھی درماں میرا

نہیں ممکن کہ خبر دل کی نہ دل کو ہووے
آشکارا ہے جہاں پر غم پنہاں میرا

جب سے میں دیکھا ہے اُس شوخ کی مژگاں کو شکیب
ہے سدا پنجۂ وحشت میں گریباں میرا

تاب لاوے اس کی کیا، دل کس قدر نخچیر کا
توڑ جاتا ہے تو بے پیکاں تمہارے تیر کا

کیوں ملاتا ہے مجھے تو خاک میں چرخ کہن
میں ورق ہوں عاشق دلدادہ کی تصویر کا

قیس کب دور سے دیکھ اس کو پکارا نہ کیا
ساربان نے طرف نجد گزارا نہ کیا

قد پہ کر تیرے نظر سرو کو بھولی قمری
دیکھ بلبل نے تجھے اگُل کا نظارا نہ کیا

در پردہ ستم ہوتے ہیں سو جانِ حزیں پہ
عاشق ہوئے جس دن سے ہم اک پردہ نشیں پہ

کیا تیغ ملاحت نے تری کاٹ کیا کم
آتی ہے ہنسی، خندۂ زخم نمکیں پہ

دیکھا ہے شکیب جگر افگار نے کس کو
شادی سے جو رکھتا ہی نہیں پاؤں زمیں پہ

نہ پاس بیٹھے نہ بولے چلے گئے منہ پھیر
کھڑے کھڑے جو کبھی آئے بھی مہینوں میں

دام الفت میں پھنسے ہیں اب تو اے صیاد ہم
دیکھیے اس دام سے ہوتے ہیں کب آزاد ہم

ہر بُن مو پہ ہمارے زخم اک تیشے کا ہے
یہ تماشا تجکو دکھلائیں گے اے فرہاد ہم

ہم سے حیرانوں کا نقشہ کھینچنا ہے کیا ضرور؟
خود بہ رنگِ صورتِ تصویر ہیں بہزاد ہم

کارواں نے حال زار اپنا نہ پوچھا یا نصیب
جوں جرس کرتے رہے گو نالۂ و فریاد ہم

بزمِ عشرت ہم نے جانا قید زنداں کو شکیب
نالۂ زنجیر کو سمجھے مبارک باد ہم

ریاض الفصحا ص ۱۵۸ ۔ خوش معرکہ زیبا جلد اول ص ۴۲۰

---

# مرزا سیف علی خاں بہادر شگفتہ لکھنوی

نواب شجاع الدولہ بہادر والیٔ سلطنت اودھ (وفات ۱۱۸۸ھ) کے اخلاف میں نام و نمود کے آدمی تھے۔ وہ آغاز شباب ہی سے شعر و سخن میں مشغول ہوگئے تھے۔ شہر کے بہت سے شعرا کو ان کے دربار میں رسائی حاصل تھی۔ جن میں مرزا کاظم علی جوآن، نور الاسلام منتظر، شاہ شرف الدین ملول و الہام کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں شعر و سخن کی اس مسلسل مجلس آرائی کے باعث رفتہ رفتہ سخن گوئی میں اس قدر ترقی کر لی تھی کہ ایک پورا دیوان تیار ہوگیا تھا۔ قضائے کار مکان میں آگ لگ گئی جس میں گھر کے سامان کے ساتھ یہ دیوان بھی نذر آتش ہوگیا۔ اس واقعہ نے اس قدر ملول کیا کہ چند سال تک کچھ کہنے کا اتفاق نہ ہوا لیکن وہ جو کہا ہے کہ ؏

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آخر پھر غزل گوئی کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور کچھ مدت میں دوسرا دیوان مکمل کر لیا۔

ابتدائے شاعری میں مرزا کاظم علی جوآن سے اصلاح لیتے تھے اُس وقت تخلص بیآں تھا۔ جب جوآن لکھنؤ سے کلکتے چلے گئے تو مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ اور تخلص شگفتہ کر لیا۔ مصحفی نے اپنے دونوں تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے۔

تمام تذکرہ نویس ان کی ذکاوت و ذہانت اور رفق و مدارا کے معترف ہیں ۔

اعظم الدولہ کہتے ہیں: "بسیار ذہین و ذکی۔ اکثر قصائد و غزلیات خوب خوب از طبع رسائے اُو موزوں شدہ و با ہر کس بہ محبت و مدارا پیش می آمد"۔

حکیم قاسم کہتے ہیں۔ "وے جوانیست ذکی الطبع، ذہین، خوش فکر خجستہ آئین، بہر کس بمدارا پیش می آید و اکثر انواع سخن بامزہ موزوں می نماید۔

ناصر کہتے ہیں "شخص جامع کمالات، علم موسیقی اور تیر اندازی اور مصوری میں بے نظیر اور شاعری اور سخنوری اس کی دل پذیر یہ"۔

مصحفی کہتے ہیں "فکر سخن بجمعگی و صفائی تمام می کند و قصیدہ ہائے آب دار در سلک نظم کشیدہ اند"۔ دوسرے موقع پہ لکھتے ہیں "در کثیر الکلامی جناب را صائب ریختہ گفتن موزوں است۔ در فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی و امثال زمانہ و مردانہ نظیر خود ندارند"۔

مصحفی نے ۱۲۳۶ھ میں ان کی عمر ساٹھ سال سے زائد بتائی ہے۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۱۷۶ھ کے قریب قرار پاتا ہے۔

شگفتہ کے ایک لڑکے کا نام مرزا خاں تھا جو گُل تخلص کرتے تھے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔

شگفتہ کے قدیم و جدید دونوں زمانوں کا انتخاب کلام یہ ہے ؎

سوز ہجراں سے ساز کرتا ہوں — تو نے جانا کہ اس کو صبر آیا

خرام ناز ترا بس مری نظر میں رہا — تمام عمر ہی بیٹھا میں وہ گزر میں رہا

آنکھیں چرا کے شب وہ بہانے سے اُٹھ گیا — حرفِ مروت آہ زمانے سے اُٹھ گیا

دل کے دینے میں اضطراب کیا — دیر کے کام کو شتاب کیا

چشم میگوں دکھا کے غیروں کو — دل مرا نرگسی کباب کیا

بسان نقش قدم جو کہ خاکسار ہوا — اُسی سے دل میں تمہارے بھی اک غبار ہوا

بگولا گور سے اُٹھا جو خاکساروں کی — وہی بلند ہو اک گنبد مزار ہوا
نہ رویا عاشق بے کس کی گور پہ کوئی — مگر سحاب کرم گستر اشک بار ہوا

بارہا آندھی اُٹھی، ابر برستا گزرا — سر پہ انساں کے جو پوچھو تو نہ کیا کیا گزرا

بس کہ کھایا ہے زخم سر گہرا — خوں کا دریا ہے تا کمر گہرا

غم میں کرتے ہیں ترے یاریٔ غمخواریٔ دل — آہِ دل نالۂ دل گریۂ دل زاریٔ دل
مے کے پینے ہی سے جاتا ہے خمار مئے ناب — ہیں لب لعل ترے دارو ئے بیماریٔ دل
جستجو کرتی ہے گلگشت میں بیہودہ صبا — کسی غنچے میں نہیں بوئے وفاداریٔ دل
دوست داری میں سدا غنچۂ گل کے ہے نسیم — آہ ہر دم ہے شگفتہ بہ دفاداریٔ دل

بوسہ لیتے ہوئے ہم دیکھو ادب کرتے ہیں — گالیاں دیتے ہیں یہ آپ غضب کرتے ہیں

منہ کو پھیرے ہے وہ اِدھر کو دیکھ — میرے نالے کے ٹک اثر کو دیکھ

ایک ہے عالم اسباب میں زندہ مردہ — جب تو آتا ہے نظر خواب میں زندہ مردہ

دل و جگر نہیں سینے کے داغ کے نیچے — جلے پڑے ہیں پتنگے چراغ کے نیچے

غم نہ کھا اے دل اگر شب زلف کی تاریک ہے — پاس ہے رُخ اس کا یعنی صبح بھی نزدیک ہے

دنبالہ ہے سرمہ کا اور چشم وہ کالی ہے — اس بچۂ آہو نے کیا شاخ نکالی ہے

---

عمدۂ منتخبہ ص ۳۶۸ - مجموعہ نغز ص ۳۴۹ - تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۳۵
تذکرہ ریاض الفصحا ص ۱۵۵ - طبقات الشعرا کریم الدین ص ۲۵۰

---

## شیخ محمد صابر شمیم لکھنوی

ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ تھا۔ ۱۲۰۶ھ کے قریب لکھنؤ میں پیدا ہوئے

اور تکمیل تعلیم کے بعد شعر وسخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ:

"تین سال سے اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا ہے جو کچھ کہتے ہیں اُسے اصلاح کے لیے میرے پاس لاتے ہیں"

مصحفی کے علاوہ "نسخۂ دل کشا" کے مصنف نے "نام نامعلوم باشندہ لکھنؤ" کے الفاظ کے ساتھ شمیم کے تین شعر درج کیے ہیں وہ شعر یہ ہیں ؎

تیرے بیمار کو کیا جانیے کیا ہے مرغوب
نہ فلاطوں نہ مسیحا کی دوا ہے مرغوب

وہ دکھیوں ہوں تقدیر جو دکھلاتی ہے مجھ کو
تدبیر نہیں کوئی نظر آتی ہے مجھ کو[1]

اب آہ طمانچۂ قضا ہے
یہ ضعف سے حال ہو گیا ہے

مصحفی کے منتخب کلام سے چند اشعار اور پیش کیے جاتے ہیں ؎

ڈر سے قاتل کے اُٹھایا نہ کسی نے ہرگز
لاشہ اُفتادہ مرا بر سر بازار رہا

راز دل کس سے کہوں جاکے بتا تو ہی شمیم
نہ شفیق اپنا کوئی اور نہ غم خوار رہا

باغ جہاں میں آہ نہ روزی ہوا ہمیں
نخل اُمید کا کبھی بالیدہ دیکھنا

بعد مرنے کے کیا قسمت نے اتنا تو سلوک
کاسۂ سر اپنا پامال سم توسن ہوا

تیرہ بختی کے سبب اس چہرۂ پُرنور سے
کلبۂ حرماں نہ اپنا ایک شب روشن ہوا

دم نکل جائے کہیں یا مجھ نحیف و زار کا
یا کہیں جلدی میسّر وصل ہو دلدار کا

بلبل گلشن تصویر ہوں میں ہم نفساں
قابل نالہ کشیدن مری منقار ہے کب

گلشن خزاں ہے اس میں کبھی موسم بہار
باغ جہان کا ہے یہی رنگ عندلیب

شمیم ہی نہیں کچھ مصحفی سے فیض اندوز
ہے خار و گل پہ بہم فیض اس کا جاری آج

ابر تنگ میں جوں ہو نمایاں ماہ جامہ وہ
جھلکے ہے اس بدن کی صفا پیرہن میں زور

---

[1] ریاض الفصحا میں یہ مصرع اس طرح ہے ؏

تدبیر کوئی اب نہیں بن آتی ہے مجھکو

گور پر کیا چاہیے اس کی پس مرگ ان چراغ — حسرت و حرماں کے داغوں سے ہو جس کا تن چراغ

تیرے دیوانے کو ہے جینے سے حرماں باغ میں — زخم آنے ہیں نظر گلہائے خنداں باغ میں

نقشے کے ترے روبرو اے مایۂ خوبی — یوسف کی بھی تصویر نہیں بھاتی ہے مجھ کو

غضب تو یہ ہے نہیں نیند رات کو آتی — وگرنہ خواب ہی میں اُس سے گفتگو کرتے

دل کو یقیں ہوا کہ بس اب جی سے جا چکے — جب ہم تمہارے دامِ محبت میں آ چکے

صورت دکھا کے خواب میں اپنی وہ دل فریب — اک تازہ داغ از سر نو دے گیا مجھے

کر قتل نگاہوں سے مجھے اے بتِ خونخوار — آغشتہ بخوں تا تری تلوار نہ ہووے

بیدار نہ ہوویں کبھی ہم خواب عدم سے — محشر پہ اگر وعدۂ دیدار نہ ہووے

ریاض الفصحا ص۱۴۰ ، سرو چراغاں قلمی

# مرزا جوہر بیگ شوق

ریاض الفصحا میں ان کا نام مرزا جوہر ولد میرزا وارث علی چھپا ہے لیکن یہ پڑھنے کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ صحیح نام مرزا جوہر بیگ ہے ۔ لکھنؤ کے باشندے تھے مصحفی کہتے ہیں کہ کچھ دنوں سے شعر گوئی کا شوق ہوا ہے اوّل اوّل کسی کی شاگردی نہیں کی آخر "بہ رہنمائی دانش" میری طرف رجوع ہوئے اور اصلاح لینے لگے "۔ شعر صاف ستھرا کہتے تھے لیکن زبان میں قدرے لکنت تھی جس کی وجہ سے مشاعروں میں غزل خوانی سے کتراتے تھے ۔ اعظم الدولہ کہتے ہیں کہ فن نجوم و معما میں اچھا دخل رکھتے تھے مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گئے تھے اور وہیں قیام اختیار کر لیا تھا ۔ شوق کا ایک واسوخت ادارۂ ادبیات

حیدرآباد کے کتب خانے میں ہے اس کا آخری بند یہ ہے ؎

خفگی سے بھی اگر لوں کسی معشوق کا نام / سر بازار اُسے دیجئے لاکھوں دشنام
شوقؔ واللہ دل و جان سے ہے تیرا غلام / نام پر تیرے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام
کب کسی کی ہے مجھے جلوہ گری سے مطلب
حور سے مجھ کو غرض ہے نہ پری سے مطلب

یہ واسوخت شعلۂ جوالہ میں طبع ہو چکا ہے اس میں صرف تخلص درج ہے نام درج نہیں ہے۔ شوقؔ کے کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

حاصل یہ عشق میں ہمیں جاہ و حشم ہوا / آنسو تو فوج غم ہوئے، نالہ علم ہوا
تجھ بن قلق سے بسترِ غم پہ تمام رات / تڑپا کیا مرا دلِ مضطر تمام رات
فائدہ کیا جو لئے جاتی ہے بستاں کی طرف / لے چل اے وحشتِ دل مجھ کو بیاباں کی طرف
مہر و مہ کو جو کیا حسن سے تیرے ہم سنگ / حُسن تیرا تھا فزوں، پلۂ میزاں کی طرف
اُس پری رُو کے اگر وصل کی خواہش ہے تجھے / شوقؔ سے جا تو چلا ملکِ سلیماں کی طرف
عرق جب اس پری کے چہرۂ گلنار سے ٹپکے / نہ کیونکر اشکِ حسرت چشمِ گُل گلزار سے ٹپکے
اگر دعوائے ہم چشمی کرے وہ تجھ سے گلشن میں / لہو فی الفور چشمِ نرگسِ بیمار سے ٹپکے
تری وحشت سے جلّادِ فلک کو قشعریرہ ہے / لہو کیونکر نہ اے قاتل تری تلوار سے ٹپکے
ہمارا حالِ زار اے شوقؔ وہ آکر اگر دیکھے
یہ کیا ممکن ہے جو آنسو نہ چشمِ یار سے ٹپکے

---

ریاض الفصحا صہ ۱۵۷ ، شعلہ جوالہ صہ ۵۵۴ ، فہرست مخطوطات جلد سوم صہ ۲۷۳

---

# مولوی غلام امام شہید عثمانی

شہید کے مورث اعلیٰ ملک کے مشہور بزرگ شیخ الاسلام بندگی حضرت مخدوم نظام الدین عثمانی امیٹھوی تھے ۔ یہ اکبر کے زمانے میں گزرے ہیں اکبری دور کے اکثر اہل علم جن میں ابوالفضل اور ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں ان کے فضل وکمال کے معترف تھے ۔ مخدوم شیخ آدم صدیقی گوپاموی کی دختر بلند اختر ان سے منسوب ہوئی تھی ۔ مخدوم نظام الدین کے چار لڑکے تھے ۔ شیخ جعفر بندگی ۔ شیخ عبدالرزاق ۔ شیخ عبدالجلیل ، شیخ محمد ۔ شیخ عبدالجلیل کی اولاد کے سلسلے میں شاہ غلام محمد تھے جو شہید کے والد بزرگوار تھے ۔ شہید بے مثال مدّاح رسولِ مقبول ؐ اور شرف یاب حج بیت اللہ شریف ملقب بہ عاشقِ رسول ؐ تھے اور امام الشعرا کے خطاب سے مشہور تھے ۔

بقول انتظام اللہ شہابی شہید کی ولادت کا سن ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء ہے انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی پھر علوم متداولہ کی تعلیم کے لیے مولوی حیدر علی مصنف منتہی الکلام کے شاگرد ہو گئے اور عروض وعلم معانی کی کتابیں آغا اسمٰعیل مازندرانی سے پڑھیں ۔ عربی زبان کی معقول استعداد رکھتے تھے اور فارسی زبان میں منتہی تھے جس پر فخر کرتے تھے ۔ مرزا قتیل کا آخری زمانہ دیکھا تھا اور بقول صاحب عروس الاذکار اُن سے کسی قدر استفادہ بھی کیا تھا قتیل کی وفات (۱۲۳۳ھ) کے بعد شیخ امام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے لیکن اصل فیض ان کے شاگرد شاہ مینا ساحر کاکوروی سے پایا جو اپنے استاد کی سچی یادگار اور صرف فارسی کے شاعر تھے ۔ تحصیل علوم کے بعد شہید مرحوم نے سرکار برطانیہ کی ملازمت کی کچھ دن تحصیل دار رہے اس کے بعد صدر نظامت کے ساتھ منسلک ہو کر آگرے پہنچے ۔ اپنے مکان میں مستقلاً میلاد شریف کی محفل منعقد کیا کرتے

تھے اور اس میں اپنا تازہ نعتیہ کلام خوش الحانی اور والہانہ طور پہ پڑھتے تھے ان کی میلاد خوانی کی شہرت دُور دُور تک پہنچی ہوئی تھی جس سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن کے نواب محی الدولہ بہادر نے ایک ہزار روپیہ زاد راہ بھیج کر اپنے یہاں طلب فرمایا۔ سرکاری ملازمت ترک کر کے وہاں چلے گئے سرکار نظام سے چار سو تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ جس کے لیے کوئی خدمت مقرر نہیں تھی۔ کچھ مدت کے بعد حیدر آباد سے حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوئے تو راجہ گردھاری پرشاد باقی نے اپنی جیب خاص سے زاد راہ کا بندوبست کیا، نواب مختار الملک نے بھی پانچ سو روپے اس مقصد کے لیے پیش کیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جب تک مقیم رہے میلاد شریف برابر منعقد کرتے رہے واپسی کے بعد دائرہ محمد برکت الہ آباد میں متوکلانہ زندگی گزاری لکھنؤ کے قیام میں آغا سید محمد اصفہانی اور مرزا گل محمد خاں ناطق مکرانی کے ہم طرح رہے یہاں کے مشاعروں میں اکثر کامیاب رہتے تھے۔ قاضی محمد صادق خاں اختر سے خاص مراسم رکھتے تھے۔ لکھنؤ، آگرہ، مراد آباد، رام پور، الہ آباد اور حیدر آباد میں بہت سے ارادت مند تھے جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ تلامذہ کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے جن میں منشی احمد خاں صوفی، امتیاز علی شاں صوفی اور سرفراز علی خاں صفی الہ آبادی کافی شہرت یافتہ ہیں۔ قدر دان رئیسوں میں نواب کلب علی خاں والی رام پور، سعید عالم خاں بہادر رئیس سورت، نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن اور نواب علی بہادر رئیس باندہ خصوصیت رکھتے ہیں۔

آخر دو سال اس حال میں رہ کر ۱۲۹۶ھ میں آپ نے رانچی میں وفات پائی خواجہ غلام غوث بیخبر نے جو ان کے عزیز بھی تھے اور تقریباً شاگرد بھی یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے

شاعر بے مثل غلام امام ساحری از شاعریش شد پدید
بود بذاتش نہ ہمیں یک صفت عالم یکتا و ادیب وحید

قطع تعلق ز ہمہ کار کرد — داد دل و عشق پیمبر خرید
داشت امام الشعرا او خطاب — خوش سخنے کرد تخلص شہید
تاخت ازیں غمکدۂ تیرہ، او — رفت بگلزار ارم، آرمید
بیخبر غم زدہ اندر غمش — چارہ بجز صبر و رضا چوں ندید
گفت بتاریخ ہم آخر ز رنج — "وائے امام شعرا شد شہید"

۱۲۹۳ + ۳ = ۱۲۹۶ھ

شہید مرحوم کے ایک ذی استعداد لڑکے حافظ معشوق احمد تھے۔ یہ بڑے خوش خلق اور حافظ کلام اللہ تھے۔ صرف ۱۶ سال ختم کر کے سترھویں سال میں آئے تھے کہ ۵ ذی قعدہ ۱۲۹۳ھ کو رات کے گیارہ بجے وفات پا گئے۔ ضعیفی کے عالم میں اس حادثہ جاں گداز نے جناب شہید کی کمر توڑ دی، دیوانگی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ پھرتے پھراتے عظیم آباد پہنچے۔ عظیم آباد اور پھلواری کے ارباب سخن نے جن میں شاہ محمد اکبر داناپوری اور مولوی محمد سعید حسرت جیسے بزرگ بھی شامل تھے ان کے خیر مقدم میں فارسی قطعات تاریخ لکھے جو ورود شہید کے نام سے مطبع نظامی کان پور سے شائع ہو چکے ہیں۔

فارسی کا دیوان متعدد مرتبہ شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ میلاد شریف شہید، قصہ حضرت بلال رض، قصہ حضرت حلیمہ سعدیہ رض، وغیرہ تمام ہندوستان میں جاری و ساری ہیں۔ اور اب تک سینکڑوں کی تعداد میں ان کی طباعت ہو چکی ہے۔ انشائے بہار بیخزاں اور رموز الشہادتین بھی ان سے یادگار ہیں۔ اردو نثر میں ایک اور رسالہ لکھا تھا جس میں روضہ تاج گنج کی تعریف کی گئی ہے۔ کلام منتخب یہ ہے ؎

دم بدم کہتے ہیں ارنی ارنی — غیب سے ہو گئے موسیٰ پیدا
کاٹک تو میرے منہ سے چھٹے اب کسی طرح — ہوئے گزر مدینہ میں مجھ روسیاہ کا

سرسبز کیا ہوا اُس رُخِ تاباں کے روبرو | کیا منہ ہے شمعِ بزم کا اور مہر و ماہ کا
آئی بہارِ جانفزا، لائی گلستاں میں صبا | پیغامِ وصلِ دلربا، گُل کھل کھلا کر ہنس پڑا
موجِ صبا نے وا کیا ہر غنچہ کا بندِ قبا | بلبل یہ کرتی ہے صدا اب میں ہوں اور سیرِ چمن
حُر یہ کہتا تھا نہیں تشنہ لبی کا کچھ غم ۔ دیدۂ تر کی قسم
قطرۂ آب یہاں کا ہے مرے حق میں سم، حوضِ کوثر کی قسم
عجب آئی بہارِ جب وداں ہے | کہ گُل خنداں ہے بلبل نوحہ خواں ہے
مسیحا کا بیاں ہاتف نے سُن کر | پکارا ہاں نشاط جاوداں ہے

فارسی کلام

طرزِ نگہش، میل تغافل ز من آموخت | چشم سیہ اش خاصیت گُل ز من آموخت
جان دادن و نالیدن و بر خویش طپیدن | پروانہ ز من، قمری و بلبل ز من آموخت
ایں نالۂ موزوں کہ خراشد رگِ جاں را | آہنگ شہید است کہ بلبل ز من آموخت

---

شمعِ انجمن صـ ۲۴۴، خمخانۂ جاوید بنجم صـ ۲۱۰، انشائے بیخبر صـ ۲۹
دیوانِ غریب صـ ۳۳۲، عروس الاذکار صـ ۹۲
نامۂ منظفری صـ ۸۵، مدائح الشعرا قلمی صـ ۲۹۔

---

## منشی کرامت علی خاں شہیدیؔ

ان کے والد مولوی غلام رسول خاں ایک ہوشیار اور قابل معلم تھے وہ اپنے وطن موضع ہڑیا پور ضلع اناؤ سے لکھنؤ آ گئے تھے اور وہاں کے ایک قدیم بادہ قار رئیس راجہ

ٹکیت رائے کو فارسی کی تعلیم دینے پہ مامور تھے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ شہیدی کی ولادت سابقہ وطن میں ہوئی تھی یا لکھنؤ میں لیکن جوان ہونے کے بعد جب کہ ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی ایک انگریز کے منشی مقرر ہو کر دہلی چلے گئے۔ اس کے بعد کمسریٹ میں ملازم ہو گئے۔ یار باش، زندہ دل، بذلہ سنج اور آزاد مزاج تھے۔ حکیم عبدالحیٔ اپنے والد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ عابد علی بلندوی ایک، سیر چشم مہمان نواز آدمی ضلع فتح پور ہسوہ کے رہنے والے اودے پور میں کسی بڑے عہدے پہ مامور تھے ان کا اور شہیدی کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے۔ ابتدائے ملازمت میں وہ اور شہیدی نیمچ کی چھاؤنی میں سرکار انگریزی کے ملازم ہو گئے تھے۔

مولوی کریم الدین کا بیان ہے کہ ابتدا میں ایک لڑکے مسمی گنگا پرشاد پہ عاشق تھا۔ اس واسطے بجائے یا فتاح کے ہر ایک کتاب پر جو شہیدی کی ملک سے تھی "یا گنگا پرشاد" لکھ دیا تھا۔

شہیدی نے بہت سا روپیہ یار باشی اور فضول خرچی میں اڑا دیا۔ جب حساب طلب ہوا تو گھبرائے اور اپنے گھر میں آگ لگا کر (اسی میں دفتر بھی تھا) اور کچھ دنوں دیوانہ بن کر اپنی جان بچائی۔ اس کے بعد کسی ملازمت کی طرف رُخ نہیں کیا۔ بھوپال۔ دلی۔ اجمیر۔ پنجاب۔ گجرات اکثر آتے جاتے رہتے تھے اور یہاں اپنے بہت سے ملنے والے پیدا کر لیے تھے۔

لکھنؤ میں چونکہ تعلیم پائی تھی اور وہیں مصحفی کی شاگردی اختیار کی تھی اس لیے وہاں بھی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ جب شیخ ناسخ کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اور لکھنؤ جانے والا ہر شخص اُن سے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ شہیدی بھی گھومتے پھرتے لکھنؤ پہنچ گئے۔ شیخ ناسخ سے ملاقات کرنے کے لیے ان کے مکان پہ پہنچے۔ ناسخ دربار رَس اور مغرور تو تھے ہی ایک نوجوان شوخ مزاج شاعر کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اسی

وقت ناسخ کی یہ غزل بہت مشہور تھی جس کا مطلع ہے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

شہیدی نے اس زمین میں غزل کہی اور وہاں چھوڑ کر چلے آئے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

مرا سینہ ہے مسکن بود و باش شیر یزداں کا
فضائے لامکاں سے قرب ہے میرے نیستاں کا

ملازم نے ناسخ کو اندر جا کر خبر دی وہ جلدی سے باہر آئے تو شہیدی کی کہی ہوئی غزل دیکھ کر اپنے تساہل پر افسوس کیا نوکر کو بھیج کر بہت کچھ تلاش کرایا مگر ان کا پتا نہ چلا۔

میرے کرم فرما حافظ حضور احمد خاں آثم بریلوی فرماتے ہیں، کہ بریلی میں نواب عطا حسین صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا۔ مرزا عباس بیگ عباس و نادر مرحوم نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا ؎

نقب لگا کے جو ہم پہنچے کوئے جاناں میں
متاع حسن پہ عباس ہم نے مارے ہاتھ

شہیدی مرحوم اُس مشاعرے میں موجود تھے اور راس بناپور کہ اس سے پہلے بریلی کے کسی مشاعرے میں وہ شریک نہ ہوئے تھے، مقامی اہل سخن اُن سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے یہ مقطع دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ مرزا عباس نے اعادہ کیا تو پھر ایک مرتبہ اور پڑھنے کی خواہش کی۔ مرزا نادر نے مقطع کو کئی بار پڑھوانے سے سمجھا کہ اس میں کوئی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ غور کیا تو سمجھ میں آگیا۔ اب کی مرتبہ مقطع کو تبدیل کر کے اس طرح پڑھا ؎

لگا کے نقب جو ہم پہنچے کوئے جاناں میں
متاع حسن پہ عباس ہم نے مارے ہاتھ

شہیدی مرحوم نے گلے لگا لیا اور کہا کہ یہ غلطی نہیں بشریت ہے۔ اس سے شہیدی کی سوجھ بوجھ کا پتا چلتا ہے۔

۱۲۵۵ھ میں زیارت خانہ کعبہ کا ارادہ کیا، ہندوستان سے ذوق و شوق کے

جذباتِ عالیہ کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستے میں بیمار ہو گئے جب ان کا شغدف، اُس مقام پر پہنچا جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا۔ تو حسرت ناک نظر سے اُسے دیکھا اور طائرِ روح جسمِ عنصری سے پرواز کر گیا[1] اس طرح شہیدی کی وہ تمنا پوری ہو گئی جو انھوں نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کے ایک شعر میں بڑی دل سوزی کے ساتھ کی تھی۔ اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں :-

ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب — میسر ہو طواف اے کاش مجکو تیرے مرقد کا

کبھی نزدیک جا کر آستانے پر ملوں آنکھیں — کبھی گر دُور بیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا

فراغِ دل سے گر اس زندگی کا کوئی دم گزرے — حسد ہو خضرؑ و عیسٰیؑ کو مرے عیشِ مخلد کا

مدینے کی زمین کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ — کسی صحرا میں داں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

---

[1] مولوی فیروز الدین لکھتے ہیں کہ :-

مدینہ منورہ سے تین میل اِدھر یثرب کے پاس ایک پہاڑی ہے۔ یہاں سے گنبدِ خضریٰ صاف نظر آتا ہے اکثر زائرین یہیں سے درود خوانی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ میرے ہمراہیوں میں سے جو لوگ وہاں گئے انھوں نے بتایا کہ پہاڑی پر کرامت علی خاں شہیدی (مولوی فیروز الدینؒ غلام امام نام لکھا ہے) کی قبر ہے ــــ کہتے ہیں کہ شہیدی صاحب جب یثرب پہنچے تو حاکم مدینہ کو حضور پُر نور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے حکم ہوا کہ اس شخص کو مدینے میں نہ آنے دینا۔ چنانچہ وہ بیچارے یہیں روک لیے گئے۔ انھوں نے بہت منت سماجت کی اور کہا کہ مجھے اس پہاڑی پر سے روضۂ اطہر کی زیارت کر لینے دو۔ حاکم نے اجازت دے دی۔ آپ پہاڑی پر چڑھے اور روضۂ اطہر کی جھلک دیکھی تو بے اختیار غش کھا کر گر پڑے اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ (جہادِ زندگی ص ۱۱۸ - ۱۱۹)

ان کی وفات کی تاریخ ۴ رصفر ۱۲۵۶ھ ہے۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

آں شہیدی زبدۂ اہلِ کمال | چوں بخلاق جہاں بسپرد جاں
گفت ہاتف مصرعِ سالِ وفات | جامع حسنات و ممتاز الزماں

۱۲۵۵ھ

ایک قطعۂ تاریخ یہ ہے جس کے مصنف شاہ بہاء الدین بشیر دہلوی ہیں ؎

شہیدی شاعر نازک طبیعت | بحکم حق بدست موت جاں داد
بشیر ایں مصرعِ سالش رقم زد | شہید خنجر انداز بیداد

۱۲۵۶ھ

شہیدی کے استاد اول شیخ مصحفی تھے لیکن دہلی کے قیام میں انھوں نے کچھ غزلیں شاہ نصیر کو بھی دکھائی تھیں۔ ان دو باکمال استادوں کے فیض توجہ سے ان کے کلام میں بڑی آمد پیدا ہو گئی تھی۔ متعدد اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں۔ اُردو کا ایک مکمل دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

شہیدی کے شاگرد بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں ان میں شیخ نبی بخش ناداں کو خصوصیت حاصل ہے۔ جو میرٹھ میں رہتے تھے۔ وہاں اُن کے شاگردوں کا کافی بڑا سلسلہ ہے۔

اب یہاں چند منتخب اشعار لکھے جاتے ہیں ؎

قدر سب چاہنے والوں کی ترے دیکھ چکے | خوار رہتا ہے پُرانا تو پشیمان نیا
عام ہیں اُس کے تو الطاف شہیدی سب پر | تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا
شہیدی حشر کے دن بھی ہمارا ہو چکا اٹھنا | یہی عالم رہا بعد فنا گر ناتوانی کا
فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس بہتر | گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا
ہو چلا خنجر بیداد کا بسمل ٹھنڈا | لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا — ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

اغیار کا منہ تھا مجھے محفل سے اُٹھاتے — سچ یہ ہے تری رنجشِ بے جانے اُٹھایا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے — سنتے ہیں کہ ہاتھ اُس سے مسیحانے اُٹھایا

اندوہِ دائمی ہیں کٹے کس خوشی سے عمر — گر مجکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

بیقراری دل کی ہیں کیونکر بتاؤں یار کو — سینے پہ جب ہاتھ رکھتا ہے ٹھہر جاتا ہے دل

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پہ تری — اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

ناکامی جاوید کی ہم ملتے منت — افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے — دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

وہ وقت تو آنے دے بتادیں گے شہیدی — بن آئی کسی شخص پہ مرجاتے ہیں کیسے

دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں — کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کیے

شہیدی کا سے نہیں واقف ہیں ہم اتنا تو واقف ہیں — کوئی راتوں کو یاں کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

جی چاہے گا جس کو اُسے چاہا نہ کریں گے — ہم عشق و ہوس کو کبھی یکجا نہ کریں گے

مشام بلبل ہیں رشکِ گُل سے ہنوز بو بھی نہیں گئی ہے
ابھی وہ نام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے
بلا کو اس کی خبر ہے کہتے ہیں کس کو معشوق کس کو عاشق
ہنوز کانوں ہیں اُس پری کے یہ گفتگو بھی نہیں گئی ہے

---

گلشن بیخار ص ۱۱۴ ، گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۹۹ ، گل رعنا ص ۳۳۶ ،
دیوان غریب ص ۲۳۳ ، خمخانۂ جاوید نجم ص ۲۱۷ ،
طور کلیم ص ۵۹ ، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۶۹

## لالہ کانجی مل صبا

قوم کے کایستھ، اصلی وطن فیروزآباد تھا، ان کے والد کا نام مصحفی سے شیفتہ تک کسی نے نہیں لکھا۔ قاسم نے ان کا نام بھی کان جیو مل لکھا ہے۔

صبا کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں نشو ونما بھی پائی۔ جب مصحفی دہلی سے نکل کر لکھنؤ پہنچے تھے تو ان کا عنفوان شباب تھا۔ مصحفی کو غریب الوطن اور بے یار و مددگار سمجھ کر اپنے مکان پہ لے گئے اور کچھ دن بڑی عزت و احترام اور راحت و آرام سے رکھا۔ اسی زمانے میں صبا کی موزونی طبع ظہور پذیر ہوئی۔ ذہن نے شعر وسخن کی طرف توجہ کی اور جو کچھ کہا بڑی ارادت و عقیدت کے ساتھ مصحفی کے سامنے بغرض اصلاح پیش کیا، رفتہ رفتہ مختصر سا ایک دیوان مکمل کر لیا۔ چونکہ ان کی طبیعت شعر وسخن کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھی امید تھی کہ آگے چل کر شاعر نامور بن جائیں گے لیکن عمر نے وفا نہ کی، صرف چھبیس سال کی عمر پاکر عین جوانی کے عالم میں مدقوق ہوئے اور دنیا کو خیرباد کہا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۹ھ سے قبل کا ہے۔

صبا کی شاعری کو تذکرہ نویسوں نے پسند کیا ہے۔

مصحفی کہتے ہیں "طبیعتش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود"

سرور کہتے ہیں "ذوق شعر گوئی بسیار داشت۔ اشعارش اکثر خوش مضامین"

صبا کا دیوان دستیاب نہیں ہوتا۔ مصحفی نے جو منتخب کلام اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اس سے زیادہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا اور اسی انتخاب میں سے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

عبث ہے یہ تمھارا پاس میرے بار بار آنا ❊ جدائی میں مجھے مشکل ہے اے یار و قرار آنا
یہی شغل اس کے کوچے میں ہے اب آٹھوں پہر اپنا ❊ بصد امید جانا دن کو شب کو اشکبار آنا

افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا
جس کے لیے دنیا سے سفر ہم نے کیا تھا

فنا ہیں ایک دن سب یہاں عمارت اور گھر کس کا
یہ دنیا وہم ہے یارو پدر کس کا پسر کس کا

مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اس قاتل کے کوچے میں
لیے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا

چلے دامن اٹھا کر یہ کہو اس شوخ قاتل سے
کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خون بسمل سے

تغیر رنگ ہیں تاب و تواں نے ہمرہی چھوڑی
رعیت جس طرح پھر جائے ہے معزول عامل سے

صبا ہم نے تو کچھ ہرگز نہ دیکھا جذب الفت میں
غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

کبھی گلرو مرا جا کر جو دریا میں نہاتا ہے
فروغ حسن سے گلزار پانی میں دکھاتا ہے

عاشق مضطر کا سوزِ دل نہاں کیونکر رہے
شمع کے شعلے کی اے یارو زباں کیونکر رہے

ہاتھوں میں تیرے پیارے یہ طائر حنا ہے
یا مرغ دل کسی کا بسمل ابھی کیا ہے[1]

کیا تو نے کچھ صبا سے اے تندخو کہا تھا
روتا ہوا ادھر سے با چشم تر گیا تھا

ازل سے شور تیرے عشق کا جو سر میں تھا میرے
گیا یک جی سے اپنے پر نہ وہ سر سے گیا میرے

نہ آیا وہ مسیحا دم دمِ آخر بھی بالیں پر
مرا تو میں ولے ارمان یہ دل میں رہا میرے

---

اپنے پاؤں کی صدا مجھ کو سنا کر پھر گئے
کل جو آئے تھے وہ سننے کو مرا احوال دل

اے صبا سچ ہے جدائی میں بقول مصحفی
درد مند دوست بے آہ و فغاں کیونکر رہے

اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جب صبا
ایسا گیا کہ پھر نہ سراغِ صبا ملا

---

طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۷۲ ، خوش معرکہ زیبا اول ص ۳۷۸
ہندی گویاں ص ۱۴۱ ، مجموعہ نغز ص ۳۶۵ ، عمدہ منتخبہ ص ۴۰۲
گلشن بیخار ص ۱۲۵ ، گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۰۸

---

[1] یا مرغ دل ہے میرا بسمل اسے کیا ہے ۔ (عمدہ و نغز)

# رائے منولال صفا

رائے پورن چند کے بیٹے، رائے صاحب رام داروغہ املاک شاہ اودھ موقوعہ دہلی کے چھوٹے بھائی اور مہاراجہ جھاؤ لال نائب نواب آصف الدولہ کے داماد تھے۔ ان کا تعلق کائستھوں کی سکسینہ شاخ سے تھا۔ حکومت اودھ میں اخبار نویسی کے عہدے پر مامور رہے تھے۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ کے ملازم ہو گئے اور حسب تحقیق دی تاسی ۱۸۴۸ء میں ضلع مراد آباد میں انسپکٹر مدارس تھے۔ دی تاسی نے ان کی ایک اخلاقی نظم کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کا نام 'مفید الدہر' بتایا ہے۔

صفا عربی و فارسی میں ذی استعداد اور فارسی و اردو دونوں زبانوں کے نامور شاعر تھے۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مصحفی نے تذکرہ ہندی میں صفا کا ذکر اس حالت میں کیا ہے کہ اُن کے نام و نشان سے بے خبر تھے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ۱۲۰۹ھ کے بعد اول میر تقی کے شاگرد ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ شیام سندر لال برق کی تحقیق ہے اور ۱۲۲۵ھ میں میر کے انتقال کے بعد مصحفی سے رجوع کیا ہوگا۔ جیسا کہ اعظم الدولہ نے لکھا ہے اور اسی کی تقلید نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مولوی کریم الدین اور نواب نور الحسن خان نے کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منشی دیبی پرشاد بشاش کی تحقیق کے مطابق مصحفی کے انتقال کے بعد منشی مینڈو لال زار سے بھی مشورہ کیا ہو۔ صفا کے بھائی صاحب رام وہی شخص ہیں جن کا قطعۂ وفات مصحفی ہم نے "مصحفی اور حیات و کلام" میں درج کیا ہے۔ منولال صفا خطاطی کی اکثر اقسام میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے انھیں صاحب دیوان شاعر لکھا ہے۔ کلام بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے ؎

از بس کہ کوئے یار میں ہے جوشِ نقشِ پا
جو نقشِ پا پڑا ہے وہ ہمدوشِ نقشِ پا

اس راہ سے گئے ہیں بہت کارواں چلے
گویا کہے ہے یہ لبِ خاموشِ نقشِ پا

قدموں سے جو لگے ہیں نہ پامال کر انھیں
اے بیخبر ضرور ہے رکھ ہوشِ نقشِ پا

دیوانے کی ترے وہ سلاسل کا شور ہے
بہرے ہوئے ہیں سن کے جیسے گوشِ نقشِ پا

تکتی ہے راہ کس کی صفاؔ چشمِ تر تری
رہتی ہے وا جو صورتِ آغوشِ نقشِ پا

---

سامنے تیرے جو ہوں حور و پری کا منہ کیا
کیا چلے آگے ترے کبکِ دری کا منہ کیا

شکّر و تل ہیں ترے لعلِ لب و خالِ سیاہ
ان سے ہم ذائقہ ہو، تلِ شکری کا منہ کیا

لبِ رنگیں کے مقابل ہوں ترے یار کبھی
لعل و یاقوت و عقیقِ جگری کا منہ کیا

تابِ غفلت ہے جو ہو حال سے میرے غافل
لے نہ ہر آن خبر بے خبری کا منہ کیا

خوبصورت جو بہت حور کو سمجھا ہے صفاؔ
تو نے دیکھا نہیں اُس رشکِ پری کا منہ کیا

---

جب داغ دیکھتا ہوں میں سینے میں جائے دل
بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ہائے دل

کیونکر نہ اُن سے جان ڈرے دل کو خوف ہو
وہ چشم و زلف آفتِ جاں ہیں بلائے دل

صورت تمھاری دیکھتے ہیں دل میں ہم سدا
حاصل ہے مثلِ آئینہ ہم کو صفائے دل

ہم تنگ ہیں بہت تپشِ دل کے ہاتھ سے
وہ ہاتھ رکھے دل پہ نہ آرام پائے دل

کیونکر نہ ہم بتوں کے تئیں چاہیں ناصحا
دل ہے برائے الفت و الفت برائے دل

دیکھا صفاؔ نہ ہجر میں اس سے سوائے غم
کوئی نہیں انیس دل و آشنائے دل

---

محتسب جھوٹ ہے مے کس نے بھری شیشے میں
رہ گئی ہے مری آنکھوں کی تری شیشے میں

---

مرے منہ میں تو اس کے نام سے پانی بھر آتا ہے
مزا ایسا ہے کیا اس بوسۂ چاہِ زنخداں میں

---

مرے رونے سے دل اُس کا تو کچھ مائل بہ رقّت ہے[1]
مرے حق میں مرا رونا تو یہ بارانِ رحمت ہے

---

[1] میرے رونے پہ اُس کو رقّت ہے    کچھ تو آنسو مجھے غنیمت ہے    (آغا حجو ہندی)

## فارسی

نیست غم گر ز برِ من، دل پر غم بِرود — پارۂ ہست ز آتش، بہ جہنّم برود

سزائے جور تو ایں بود کہیں فلک چندے — ترا بہم چو تو بے مہر آشنا میکرد

بیم از تشنگیٔ روز جزا نیست صفاؔ — کہ اُمید کرم از ساقیٔ کوثر دارم

اکنوں کہ شباب رفت و پیری آمد — ور انس بخاک تا گزیری آمد

بیہودہ چہ در کشاکشی مثل کماں — بنشیں کہ زمان گوشہ گیری آمد

---

تذکرہ ہندی ص ۱۴۰ ، عمدۂ منتخبہ ص ۳۹۸ ، گلشن بیخار ص ۱۲۶ ، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۷۳ ، خوش معرکہ دوم ص ۵۳۶ ، سراپا سخن ص ۱۵۸ ، سخن شعرا ص ۲۸۱ ، آثار الشعرائے ہنود ص ۸۷ ، طور کلیم ص ۶۳ ، روز روشن ص ۳۸۸ ، دیوان غریب ص ۲۷۱ ، بہار سخن ص ، خمخانہ جاوید پنجم ص ۳۰۰ ، اعمال نامہ ص ۳۴۵ ،

---

## میر مظفر حسین ضمیرؔ

میر ضمیرؔ جن کے والد کا نام میر قادر حسین تھا پنگھوڑہ نزد سلطان پور ضلع گوڑگاؤں کے باشندے تھے۔ یہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے فیض آباد آگئے تھے اور میاں الماس علی خاں خواجہ سرا کے ملازموں اور مصاحبوں میں شامل ہو گئے تھے۔ میر مظفر حسین کا بچپن فیض آباد ہی میں گزرا۔

صاحب دربار حسین لکھتے ہیں :۔ " نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ان

(الماس علی خاں) کا انتقال ہوا۔ انھیں کا امام باڑہ معالی خاں کی سرائے میں تھا۔
جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے مقام حکومت منتقل کر کے لکھنؤ کو بسایا۔ میر قادر حسین اور اُن کے ساتھ اُن کے فرزند میر ضمیر صاحب لکھنؤ میں آئے"۔
مصنف دربار حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیض آباد میں میر ضمیر صاحب کو ایسی شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ مرثیہ گو استاد مانے جاتے تھے۔"
شجاع الدولہ کا انتقال ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو ہوا (قیصر التواریخ اول ص ۸۳) اور پھر بعد قیام (ہفت سال) فیض آباد بصلاح نائب (مختار الدولہ سید مرتضیٰ خاں ہیبت جنگ) مناسب وقت سمجھ کر لکھنؤ میں رہنا اختیار کیا۔"

(ص ۹۳ تاریخ مذکور)

اس حساب سے میر ضمیر کے لکھنؤ آنے کا سنہ ۱۱۹۵ھ ہوتا ہے اگر وہ لکھنؤ آنے سے قبل فیض آباد میں مرثیہ گو استاد کی حیثیت سے شہرت پا چکے تھے تو ان کی عمر پچیس سال سے کیا کم ہوگی، اور اس طرح سن پیدائش ۱۱۷۰ھ قرار پائے گا، لیکن یہ بات مندرجہ ذیل وجوہ سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) کسی تذکرے میں انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۰۰ سال کی نہیں بتائی گئی۔
(۲) مصحفی نے تذکرہ ہندی میں، میر خلیق کا ذکر تو کیا ہے میر ضمیر کا ذکر نہیں کیا حالانکہ مذکورہ بالا سال پیدائش سے اس وقت ان کی عمر چالیس سال کے قریب ہوتی ہے۔

(۳) میر ضمیر کا ذکر "ریاض الفصحا" میں کیا ہے جس کی ابتدا ۱۲۲۱ھ میں اور تکمیل ۱۲۳۶ھ میں ہوئی۔ اس میں لکھا ہے:- "عمرش سی سالہ خواہد بود"
اگر مصحفی نے ضمیر کے حالات ۱۲۲۱ھ میں بھی لکھے ہوں تو اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۱۹۱ھ قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے ۱۱۹۵ھ میں فیض آباد

میں مرثیہ گو استاد کی حیثیت حاصل کر لینا ناممکن ہے۔

(۴) جیسا کہ مصحفی نے تحریر کیا ہے کہ ان کا شاگرد ہونے کے وقت تک جس کا تعین ۱۲۲۱ھ سے قبل نہیں کیا جا سکتا وہ مرثیہ گوئی کا آغاز نہیں کر سکے تھے اس لیے اس سے قبل مرثیہ گو استاد کی حیثیت سے ان کا مشہور ہونا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

ضمیر کے شاگرد ہونے کی داستان مصحفی نے اس طرح درج کی ہے :۔

"ہمراہ شیخ محمد بخش کہ واجد تخلص دارد شیرینی تقسیم کردہ بود و بحلقۂ شاگردی فقیر در آمدہ بود"!

اس کے معنی بالکل صاف ہیں یعنی میر مظفر حسین ضمیر اور محمد بخش واجد دونوں نے ایک ساتھ شاگردی اختیار کی تھی اور شیرینی تقسیم کی تھی۔

لیکن سعادت خاں ناصر نے اس سادہ سے فقرے کے عجیب معنی پیدا کیے ہیں :" میاں (مصحفی) صاحب تذکرۂ دوم میں لکھتے ہیں کہ معرفت واجد بخدمتم آمدہ شیرینی تقسیم کرد و روبرو بے ہمہ ہا شاگرد من شدہ"۔

"اس اعلان کے ساتھ لکھنا خالی اس سے نہیں ہے کہ پہلے کسی کی شاگردی سے انکار کیا ہو۔"

دونوں بیانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سعادت خاں ناصر نے "روبرو بے ہمہ ہا" کے الفاظ کا اضافہ کر کے اپنی تحریر کی عدم صحت کے لیے ایک بنیاد قائم کر دی ہے۔ میر ضمیر کی قابل قدر مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کا اقرار اکثر نقادوں اور تذکرہ نگاروں نے کیا ہے[1]۔ انھوں نے مرثیے کے مضامین کو ترتیب دیا، رزمیہ، بین، سراپا، اسلحہ

---

[1] یہ عبارت اس مضمون سے لی گئی ہے جو رسالہ "قومی زبان" میں چھپنے کے لیے آیا تھا۔ (ا۔ ص)

جنگ کی تشریح، گھوڑے کی تعریف اور سب سے بالاتر یہ کہ واقعات کا تسلسل اور ترتیب، ان سب کی ابتدا میر ضمیرؔ سے ہوئی بہ حیثیت ایک شاعر کے بھی میر ضمیر کا درجہ بہت بلند تھا ان کے بیان میں روانی اور زور ہے، سلاست اور صفائی ہے، فصاحت اور دل آویزی ہے، یہ سب چیزیں ان کے کلام میں موجود ہیں اور پھر کوئی بند ایسا نہیں جو تاثیر سے خالی ہو۔ ص ۱۶۱

ضمیرؔ نے عہد نصیر الدین حیدر (۱۸۳۷ء) سے عہد واجد علی شاہ (۱۸۵۵ء) تک مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے اور سال بھر میں دو تین خواب مشاہدہ کر کے اس کو بطور شہادت نظم کر دیتے تھے۔ مرثیہ کی موجودہ روش میر ضمیرؔ کی طبیعت کا اختراع ہے۔ مرثیہ گوئی اول اول مربع کی شکل میں ہوئی اور مرزا سودا نے آخر میں اسے مسدس کی صورت دے دی لیکن اس کی ترقی و رواج صرف میر ضمیرؔ کی طباعی کا نتیجہ ہے۔ سراپا کی ایجاد، رزم کی منظر کشی، گھوڑے، تلوار اور دیگر اسلحہ جنگ کی اوصاف نگاری اور جزئیات کی تفصیل میر ضمیرؔ کے دم سے عمل میں آئی۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی کی ابتدا بھی میر ضمیرؔ ہی سے ہوئی اس سے پہلے مرثیوں کو سوز کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ ضمیرؔ کا عاشقانہ کلام بہت کم ملتا ہے کیونکہ بعد میں انھوں نے جیسا کہ لکھا جا چکا ہے اپنی زندگی صرف منقبت کے لیے وقف کر دی تھی اور مرثیہ و سلام کہتے تھے لیکن جتنا موجود ہے وہ ابتدائی کلام ہونے کے باوجود اثر انگیزی میں دوسرے شعرا سے کم نہیں۔

اس استاد باکمال نے ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ نومبر ۱۸۵۵ء کو وفات پائی۔ اور محلہ مفتی گنج لکھنؤ کی اس چھوٹی سی مسجد میں دفن ہوئے جو آج تک مسجد میر ضمیر کے نام سے مشہور ہے لیکن کوئی کتبہ موجود نہیں ہے۔

ضمیرؔ کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، صرف دو لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک

آغا سید مرزا عشق سے منسوب تھیں اور دوسری میر صفدر علی مرثیہ گو سے، جن کا تعلق سادات بارہہ سے تھا، اس خاندان کے ایک شاعر سید احمد رضا مضطر لکھنوی کا ذکر سید جمیل احمد جمیل سہسوانی نے اپنے تذکرے منشور سخن میں کیا ہے۔

قطعات وفات بہت سے شعرا نے لکھے ہیں جن میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

از مرزا حاتم علی بیگ مہر ؎

مرثیہ گو جناب میر ضمیر — جن کا شہرہ جہاں میں ہے ہر سو
تھا مظفر حسین نام ان کا — ذاکر ذکر شاہ تشنہ گلو
سوئے جنت گئے وہ جب اے مہر — خامۂ فکر کے بہے آنسو
ہجری و عیسوی لکھی تاریخ — جا کے حیدر سے مل ضمیر اب تو

۱۸۵۵ء

ضمیر + حیدر۔

۱۰۵۰ + ۲۲۲ = ۱۲۷۲ھ

از منشی مظفر علی اسیر ؎

سید ملک و شیعۂ مومن — مرثیہ گوئے بادشاہ انام
کردہ رحلت زعالم فانی — از خدا یافت در بہشت مقام
گفت سال وفات او دل من — بود سید ضمیر محو امام

۱۲۷۲ھ

آسماں بے کوکب و مہ ، بزم ماتم بے ضمیر

۱۸۵۵ء

میر ضمیر کے کلیات مراثی کے سوا مندرجہ ذیل تصنیفات اور ہیں :-

۱۔ مثنوی نسخۂ محبت ۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں ہے۔

۲۔ مثنوی مظہر العجائب ۔ یہ مثنوی ۱۲۳۶ھ میں تصنیف ہوئی اور کئی مطابع سے چھپ چکی ہے۔ ایک نسخہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں ہے۔ یہ مطبع مظہر العجائب ۱۸۹۵ء کا چھپا ہوا ہے۔

۳۔ مثنوی ریحان معراج ۔ یہ مثنوی ضمیرؔ نے ۱۲۴۷ھ میں تصنیف کی تھی اور نواب نصیر الدین حیدر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ؎

یہ فرمائش صاحب تاج ہے ۔۔۔ مسمی بہ ریحان معراج ہے

ریحان معراج کا ایک مخطوطہ سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد میں ہے اور دو مخطوطے کتب خانہ سالار جنگ میں ہیں۔ مزید برآں ایک اچھا نسخہ جس کی کتابت سید غلام رضا نام کے ایک کاتب نے کی ہے، انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ خاص میں بھی ہے۔ مزید تشریح کے لیے دیکھو مخطوطات انجمن ص ۳۹ تا ۴۳۔

ضمیرؔ کے تلامذہ کی تعداد زیادہ نہیں شاید اس وجہ سے کہ انھیں فکر سخن گوئی سے فرصت کم ملتی تھی یا اس وجہ سے کہ چند خاص قدیم تلامذہ کے علاوہ اکثر تلامذہ کو اپنے شاگرد رشید مرزا دبیرؔ کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ چند نام یہ ہیں:۔

۱۔ میر امید علی امیدؔ ۔

۲۔ سید حسن عسکری لکھنؤ کے خاندان اجتہاد کے ایک فرد تھے۔

۳۔ حسن علی خاں حسنؔ خلف رمضان علی خاں لکھنوی ۔

۴۔ سید حسن علی خاں عرف حسن مرزا حسنؔ خلف اکبر سید اکبر علی خاں بر چھیت لکھنوی، نواب سیف الدولہ کے نواسے، نثر گوئی میں میر انشاء اللہ خاں انشاؔ سے اصلاح لی۔ مرثیہ گوئی میں میر ضمیرؔ سے استفادہ کیا۔

۵۔ میر مداری شہرتؔ لکھنوی ۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے ۱۲۵۰ھ میں

فوت ہوئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ خدنگ نظر لکھنؤ ۱۹۰۰ء کے جولائی کے پرچے میں شہرت کا کلام شائع ہوا تھا لیکن اس وقت وہ پرچہ میرے پیش نظر نہیں۔

۶۔ مرزا نور الدین شاہی ابن مرزا کام بخت ابن مرزا سلیماں شکوہ گورگانی دہلوی مرزا حیدر شکوہ حیدر کے چھوٹے بھائی۔ تغزل میں خواجہ حیدر علی آتش اور نواب علی شور علی خاں سے اور مرثیہ میں میر ضمیر سے اصلاح لیتے تھے۔

۷۔ مرزا قادر شکوہ قادر خلف مرزا عباس شکوہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے پوتے اور مرزا حیدر شکوہ کے بھائی تھے۔ یہ ضمیر مرحوم کے تلامذہ میں تھے۔

۸۔ سید محمد حسین گریاں خلف سید حسن علی سوزاں عرف حسن مرزا لکھنوی اپنے باپ کی تقلید میں یہ بھی میر ضمیر کے تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔

۹۔ مرزا اکبر علی منیر ۔ان کے والد مرزا محمد تقی خاں رسالہ دار، دہلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ ہر مہینے اپنے مکان پر مجلس عزا ترتیب دیتے تھے۔ بالکل اپنے استاد میر ضمیر کے انداز میں پڑھتے تھے۔ ریاست دھول پور میں ملازم تھے

۱۰۔ میر وزیر نور ، اعتماد الملک میر بادشاہ خلف نواب سید عبد الرحیم خاں شصت ہزاری کے لڑکے اور لکھنؤ کے باشندے تھے۔ مرزا محمد رضا برق اور میر مظفر حسین ضمیر سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا دیوان "ضیائے نور" شائع ہو چکا ہے۔

میر ضمیر کے گیارھویں شاگرد مرزا سلامت علی دبیر ہیں جن کی شخصیت خود استاد کے لیے باعث فخر تھی اور جن کے فیضان عام کا سلسلہ ہندوستان کے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ اب میر ضمیر کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں ۔

مراثی کے بعض مطلعے ۔

کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا ___ پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اس طرح وہ سناں — بجلی چمک کے ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں
تھا دیدۂ حیران ہر اک زخم بدن میں — انگشت تاسف تھی زباں سب کے دہن میں
چیر کر فوج کو اس پار سے اس پار گئے — میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے
جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے — یہ تو کہیے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے

مخمس کا ایک بند ؎

کہوں بشر تو بشر کو یہ اختیار کُجا — کہوں ملک تو ملائک ہیں تیرے ناصیہ سا
کہوں نبی تو نبی تجھ سے ملتجی ہیں سدا — کہا خدا تو شریعت کے بر خلاف کہا
خدا کا محرم اسرار یا علیؓ تو ہے

تغزل ؎

تب میسر مجھے اک بوسہ جاناں نہ ہوا — جب کہ میں خاک ہوا خاک سے پیمانہ ہوا

حسرت کا داغ لے کے چلے ہم بجائے گل — سب میں کہیں گے ہم بھی گلستاں سے لائے گل
ہے میری اور ان کی محبت میں فرق یار — میں نے جگر پہ اوروں نے ہاتھوں پہ کھائے گل
معشوق بھی تو چرخ کی گردش میں آ گئے — دیکھو تو ٹکڑے ٹکڑے ہے ساری قبائے گل
قسمت تو دیکھیے کہ صبا نے پس از وفات — سوکھے مرے مزار پہ لا کر چڑھائے گل
ہے یہ جگہ ادب کی تو آہستہ چل صبا — شمع سر مزار مری ہو نہ جائے گل
اس کی نہ چشم ہی ہے نہ ابرو ہے نے نگاہ — بلبل! تو کیا سمجھ کے ہوئی مبتلائے گل
آیا ہوں سننے نالۂ مرغِ چمن ضمیر — لائی نہیں ہے باغ میں مجھ کو ہوائے گل

کیا کہوں میں کہ اب کہاں ہے دل — اس گلی میں رواں دواں ہے دل
ہائے بے رحم اسے اُٹھاتا جا — خاک اور خون میں طپاں ہے دل
گاہ پہلو میں گاہ یار کے پاس — دیکھیو تو کہاں کہاں ہے دل
دیکھنا عاشقوں کی ارزانی — ایک بوسے پہ بھی گراں ہے دل

اس قدر رکھ نہ اس پہ بار فراق ناتوانوں کا ناتواں ہے دل

---

صدمے سے شبِ ہجر کے کب جان بچ آئی یہ شام نہیں آئی قضا ہی نکل آئی
دیکھا مرا بستر جو کل اُس شوخ نے خالی ہر چند کیا ضبط مگر آنکھ بھر آئی
کرتا ہے کئی دن سے مرے قتل کی تدبیر صد شکر کہ اُس بُت کی طبیعت ادھر آئی
آتے ہی ترے آ گئی اک جان سی تن میں اے نکہتِ گیسوئے معنبر کدھر آئی
گلشن میں خزاں آئی تو بلبل یہ پکاری اب فصلِ بہارِ گل داغِ جگر آئی
تربت پہ چڑھانے کو ترے سوختگاں کی لے کر پر پروانہ نسیمِ سحر آئی
پوچھو تو ضمیرِ جگر افگار کہاں ہے جس دن سے گیا وہ نہ پھر اس کی خبر آئی

---

حالت مری جب اسکو دگرگوں نظر آئی اوروں کا تو کیا چشمِ مسیحا کی بھر آئی
کس وقت پھنسی تھی کہ رہا ہو کے چمن تک ایوائے نہ پھر بلبلِ بے بال و پر آئی
کاہیدہ کیا آہ جنوں نے مجھے یاں تک زنجیر مرے پاؤں سے آخر اُتر آئی

---

جب تک کہ تو جلوہ گر نہ ہووے میری شبِ غم سحر نہ ہووے
افسوس کہ جی سے ہم گزر جائیں اور تیرا ادھر گزر نہ ہووے
مر جائیں ہم آہ کرتے کرتے اور دل میں ترے اثر نہ ہووے
صد حیف ضمیر ہم تو روئیں اس کی کبھو چشم تر نہ ہووے

---

نے سر کی خبر نہ ہوش پا ہے کیا جانیے مجھ کو کیا ہوا ہے
دیکھے نہ کسی کے میں نے ابرو خنجر سا دل میں کیوں لگا ہے
واقف نہیں شکل سے بھی جس کی افسوس کہ اس پہ دل فدا ہے
یوسفؑ کو بھی تو نے اے زلیخا دل خواب میں دیکھ کر دیا ہے
یہ عشق مرا تو دیکھ میں نے دیکھا نہ صنم کو نے سُنا ہے
آگہ نہیں جس کے نام سے بھی ایوائے وہ جی میں کھپ گیا ہے

کیا کہیے ضمیر تجھ سے واللہ  یہ عشق ہے یا کوئی بلا ہے

ریاض الفصحا صفحہ ۱۴۳ ۔ خوش معرکہ زیبا اول صفحہ ۵۱۹
خمخانہ جاوید جلد پنجم صفحہ ۳۷۶ ۔ شمیم سخن صفحہ ۱۵۷

## مرزا بندہ حسن خاں طاؔہر

یہ فتح پور ہسوا کے رہنے والے تھے مگر لکھنؤ آگئے تھے۔ دیوان غریب اور سراپا سخن میں انھیں نواب عاشور علی خاں کا شاگرد لکھا گیا ہے لیکن مہدی حسن خاں رفعتؔ لکھنوی کے دیوان موسومہ "حدیقۂ بے نظیر" کی طباعت پر جو قطعہ تاریخ طاؔہر نے لکھا تھا اس کے عنوان میں ان کو مصحفی اور عاشور علی خاں دونوں کا شاگرد لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاؔہر نے عاشور علی خاں سے قبل مصحفی سے اصلاح لی تھی۔ وہ قطعہ یہ ہے ؎ ۱۲۹۹ھ

ماہ ذی حجہ میں جب دیوان رفعتؔ کا چھپا  فکر کی تاریخ کی طاؔہر نے تب مازیب وزین
بولا ہاتف جلد لے ان چار حرفوں کے عدد  لکھ کے اول میں الف بعد اسکے لکھ دے قاف غین

سخن شعرا کے مصنف نے ان کا نام مرزا بندہ حسین غلط لکھا ہے۔ کلام کا انداز وہی ہے جو ناسخ اور ان کے تلامذہ کے دور میں تھا۔ چند شعر مطالعہ کیجیے ؎

اشک دامن پہ ٹپکتے ہیں گہر کی صورت  یاد دنداں میں ہے یہ دیدۂ تر کی صورت
کرۂ نار جہنم جو کہوں تو ہے بجا  آتش غم سے یہ پہنچی ہے جگر کی صورت
زلف کی دھن میں وہ صحرائے جنوں خیز ہے یاد  دل سے بس صاف فراموش ہے گھر کی صورت
ناصحا! حال نہ کچھ پوچھ غم فرقت کا  سامنے ہے زغم و رنج کی سر کی صورت

سال ہا سال سے آباد یہ پیما طاہر
ایک مدّت سے نہیں دیکھی ہے گھر کی صورت

ابتدا سے ہیں فدائے جلوۂ جانانہ ہم
شمع بزم عیش اگر وہ ہے تو ہیں پروانہ ہم

جان کر اس عالمِ ایجاد کو ویرانہ ہم
ساتھ لائے مثل طفل اشک آب و دانہ ہم

دکھ دیا جو پائے ساقی پر نشے کی دھن میں سر
جانتے ہیں زاہدو یہ سجدۂ شکرانہ ہم

کیوں نہ ہو اے کافر بد خو پریشانی نصیب
غیر کو دیکھیں تری زلفوں میں کرتے شانہ ہم

ہے شب تاریک ساقی شمع مینا چاہیے
جوش میں مستی کے بھولیں گے وہ میخانہ ہم

داغ سودا تاج رشک چتر ہے ہر گرد باد
رکھتے ہیں دشتِ جنوں میں رتبۂ شاہانہ ہم

کبھی دکھائے جو نرگس کو وہ نگانہ آنکھیں
یقین ہے شرم سے ہرگز کرے نہ چار آنکھیں

اگر ہو نرگس شہلا خجل عجب کیا ہے
وہ آنکھیں ہیں تری، آہو کی ہوں نثار آنکھیں

نہ دیکھا اُس کو تو رویا مثالِ ابر بہار
کھلیں جو عالم رویا میں ایک بار آنکھیں

کروں گا آنکھ چرانے کے سیکڑوں شکوے
کبھی تو ہوں گی مری اور اُس کی چار آنکھیں

یہ جوش ہے غم سرور کا دل پہ آٹھ پہر
کہ شمع ساں مری طاہر ہیں اشکبار آنکھیں

اُلفتِ گیسوے خمدار لیے پھرتے ہیں
ہم یہ سودا سر بازار لیے پھرتے ہیں

حُسن کی جنس طرح دار لیے پھرتے ہیں
سیکڑوں ساتھ خریدار لیے پھرتے ہیں

غیر ممکن ہے مریضِ غم فرقت کا علاج
آپ وہ نرگس بیمار لیے پھرتے ہیں

کشتۂ تیغِ تغافل ہیں ہزاروں جانباز
وہ عبث خنجر خونخوار لیے پھرتے ہیں

---

خوش معرکہ زیبا جلد دوم ص۲۲۷ و ص۱۲۸ ، دیوان غریب ص۲۹۶
حدیقۂ بے نظیر ص

# مرزا رمضان بیگ طپاںؔ

مرزا رجب بیگ ولد مرزا مدار بیگ کے لڑکے چغتائی قوم کے فرد اور اسیون کے باشندے تھے نواب نور الحسن خاں نے ان کا نام مرزا محمد علی عرف مرزا رمضان بیگ تحریر کیا ہے۔ طپاںؔ کے جد امجد سلطنت مغلیہ کے دور میں ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور ان کے جانشینوں کو پرگنہ اسیون کی چکلہ داری تفویض کی گئی۔ اس کے ساتھ کچھ گاؤں بھی معافی میں ملے۔ اس لیے مستقل قیام یہیں اختیار کرلیا۔ طپاںؔ بانگر مئو میں پیدا ہوئے جہاں انکی والدہ اپنے دادا کے پاس آ گئی تھیں اور یہیں نشو و نما پائی۔ سن تمیز کو پہنچ کر اسیون آئے۔ مزاج میں شوریدگی تھی جس نے انھیں لکھنؤ پہنچایا۔

یہ ۱۲۲۸ھ کی بات ہے۔ یہاں تلاش معاش میں بھی رہے اور بہ مقتضائے موزونی طبع شعر گوئی بھی شروع کردی، سلیس عاشقانہ نثر نگاری کے ساتھ ساتھ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اور مصحفیؔ سے اصلاح لیتے تھے، ۶/۷ سال میں اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی۔ اور مقامی مشاعروں میں کماحقہ داد پانے لگے۔ مصحفیؔ کے انتقال (۱۲۴۰ھ) کے بعد کان پور چلے گئے اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔ آخرکار بنارس کا رُخ کیا۔ بنارس میں رہتے ہوئے ایک مشاعرہ کی بنیاد رکھی جو محلہ قدیم چوک میں نواب نصراللہ خاں کے کوٹھے پر منعقد ہوتا تھا۔ اسی مشاعرہ میں مولوی عبدالعلیم نصراللہ خاں کی ملاقات بنارس کے ایک شاعر شیخ سلامت علی سلامتؔ سے ہوئی تھی۔ نواب نور الحسن خاں نے انھیں قاضی محمد صادق خاں اخترؔ کا شاگرد لکھا ہے ممکن ہے کہ اپنے قدیم استاد مصحفیؔ کے انتقال کے بعد اخترؔ سے اصلاح لینے لگے ہوں۔ آخری زمانے میں الہ آباد چلے گئے تھے۔ اور وہیں انتقال کیا۔ مصحفیؔ نے ۱۲۳۶ھ میں ان کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے اس طرح سن ولادت ۱۲۱۱ھ ہوا۔ صحیح سن وفات کا علم نہ ہو سکا، لیکن تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار کی تالیف (۱۲۵۰ھ) تک یقیناً بقید

حیات تھے۔ یہ صاحب تلامذہ گزرے ہیں۔ ان کے ایک شاگرد شکر اللہ شفقت بناری کا ذکر سخن شعرا ص ۲۴۹ میں ہے۔

طپاں کے کلام میں بڑی پختگی ہے اور ہر شعر سنجیدگی کا مظہر ہے۔ فارسی و اردو کلام کا کچھ انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بطرز اہل ایراں گر غزل گفتیم جا دارد — طپاں ما تیم مرزا فارسی باشد زبان ما

عذرے دارم کہ سزاوار نیوشیدن نیست — کردہ ام جرم کہ مستوجب بخشیدن نیست
بسلامت را سرو کارے بطپیدن نبود — مست صہبائے ترا کار بہ لغزیدن نیست
اے طپاں عربدہ با آبلۂ پا داریم — ورنہ ما را ہوس بادیہ گردیدن نیست

بر دل بکنیم جبر تا چند — اے وعدہ خلاف صبر تا چند

ز راہ لطف اگر سویم نگہ دلدارم اندازد — ہزاراں رخنہ، چرخ کینہ ور در کارم اندازد
نقاب افگندہ بر رخ می رسد آں شوخ در محشر — کہ آنجا ہم، بدرد حسرت دیدارم اندازد

در سینہ نگہدار طپاں ایں دم آخر — تا بر سر بالین تو، جانان تو آید

خواہم گریم گہے بہ پیشش — آگاہ کنم ز حال خویشش

رفت از بر من آفت جانے کہ داشتم — دادم ز دست سرو روانے کہ داشتم
دل پارہ پارہ گشت ز تاب جمال دوست — شد نذر ماہتاب کتانے کہ داشتم
برباد شد ز دست فلک آں ہم اے طپاں — در کوئش از مزار نشانے کہ داشتم

بے زبانم بہ سوالے لب خود وا نکنم — جاں بہ حسرت دہم و عرض تمنا نہ کنم
اے طپاں سوے ارم گر ببرندم بے او — چشم پوشم ز رخ حور، تماشا نہ کنم

(اردو)

تن کو بھی لے روح لے جا جانب ملک عدم — چھوڑنا اچھا نہیں ہے راہ میں اسباب کا
جن کو گل کرنا نہ بھاتا تھا دم خفتن چراغ — حیف ہے ان کے نہ ہووے گر سر مدفن چراغ

یہ فیضِ مصحفی ہے انصاف کیجئے گر ۔۔۔ اعزاز ہے طپاںؔ کا جو مجلس سخن میں

اے طپاںؔ وہ تو نہ آیا چین کیوں کر آئے گا ۔۔۔ دھیان ہی اس کا کر و تارات کٹ جائے کہیں

دُور، یارانِ رفتہ بستے ہیں ۔۔۔ اُن کی شکلوں کو ہم ترستے ہیں

میری حالت سے کاش ہوں آگاہ ۔۔۔ میرے رونے پہ جو کہ ہنستے ہیں

ہے مشبّک دل و جگر اپنا ۔۔۔ جان نکلے تو لاکھ رستے ہیں

سیکھ ہم سے طریق رونے کا ۔۔۔ دیکھ اے ابر یوں برستے ہیں

یک طرف آئینے طپاںؔ ہم تو ۔۔۔ اُن کی صورت کو بھی ترستے ہیں

ہو کے بے تاب مری طرح سے فریاد کرے ۔۔۔ وہ بھی دن ہو کہ کبھی وہ مجھے یاد کرے

ریاض الفصحا ص ۱۸۲، گلشن ہمیشہ بہار ص ۳، روز روشن ص ۱۳۵

## لالہ بینی پرشاد ظریفؔ

خلف منشی روشن لال، قوم کائستھ ساکن لکھنؤ۔ لالہ چینی لال حریفؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بارہ سال کی عمر ہی سے موزونیٔ طبع کے جوہر دکھانے لگے تھے مگر کبھی کبھی فکرِ سخن کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب عمر پختگی کو پہنچی اور طبیعت میں وسعت و ترقی پیدا ہو گئی تو حسنِ کلام میں اضافہ ہو گیا زیادہ تر اردو ہی میں لکھتے تھے لیکن کبھی کبھی فارسی کی طرف بھی توجہ ہو جاتی تھی۔ دونوں زبانوں کے کلام میں غلام ہمدانی مصحفیؔ سے ہی اصلاح لیتے تھے۔ مصحفیؔ نے ان کے کلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"شعر بمتانت و فصاحت می گوید۔ باوجود فرطِ میلان طبیعت بطرف ریختہ

چند غزل فارسی ہم کہ از خامۂ فکرش ریختہ درست بستہ بنظر در آمد“۔

ظریف نے صرف غزل گوئی ہی نہیں کی بلکہ بہت سے مخمس و مسدس بھی لکھے تھے لیکن اس وقت دستیاب نہیں ہوئے۔ اُردو فارسی کے چند اشعار جو تذکروں میں ملتے ہیں درج کیے جاتے ہیں ؎

از بہر قطع کردنِ نخلِ حیاتِ من ـــــ چوں ارّہ دو دم نفسم در کشاکش است

بر حُسن رویت مائلم از تیغ نازت بسملم ـــــ ہرگز نمی گردد دلم محوِ دل آرائے دگر
عیشی! ظریف خستہ را بیخود نمودہ مصرعات ـــــ بنگر کہ ملک بیخودی دارد تماشائے دگر

غارت گرِ صبرِ من سرگرم فغانے ـــــ شد عشوہ گرے، کم سخنے، آفت جانے
نازک کمرے فتنہ گرے ہوش ربائے ـــــ شمشاد قدے گُل بدنے غنچہ دہانے
رنگین چمنے سبزہ خطے تازہ بہارے ـــــ گلبرگ ترے، لالہ رُخے سروِ روانے
خوش چشم بتے، سیم تنے، زہرہ فریبے ـــــ جادو نگہے، حور وشے، برقِ جہانے
داریم ظریف از غم و اندوہ فراقش ـــــ ہر لحظہ بلب نالہ و آہے و فغانے

## اُردو

کس کی طاقت سدِّ رہ ہو وقت رفتن آپ کا ـــــ آپ شعلہ اور رشکِ برق، توسن آپ کا
کیوں نہ پھرا پروانہ آسا ہو فدا جی سے ظریف ـــــ روئے نورانی ہے رشکِ شمع روشن آپ کا

مہر رخشاں سے فلک تار شعاعی لے کر ـــــ کر رہا ہے ترے دامن کی کناری تیار

ترے عشق میں اے بُتِ ماہ لقا گئی مفت ہی ساری مشقتِ دل
رہا موردِ رنج والم ہی سدا ہوئی شاد کبھی نہ طبیعتِ دل
وہی ہجر کا دن وہی ہجر کی شب وہی درد والم وہی رنج و تعب
وہی آہ و فغاں وہی شور و شغب، غم و غصہ وہی وہی حالتِ دل
ہے ظریف کو تجھ سے ہی چشم وفا کوئی اور بھی اُس کا ہے تیرے سوا؟

مری جان جو تو نہ سنے تو بھلا کہے جاکے وہ کس سے مصیبت دل

گو قید سے تھے ناخوش ہنگام گرفتاری — یاد آتے ہیں اب لیکن ایام گرفتاری

آزاد رہوں کیوں کر دیتی ہے ظریفؔ اب پھر — بے تابیٔ دل مجھ کو پیغام گرفتاری

---

ریاض الفصحا ص ۲۰۲ ، روز روشن ص ۴۱۸

---

## شیخ ظہور محمد ظہورؔ

خلف منشی محمد اسماعیل عرف منشی نہال خلف حافظ محمد صالح بلگرامی ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ظہور محمد تاریخی نام ہے۔ یہ حافظوں کے خاندان سے تھے مگر خود حافظ نہ تھے۔ البتہ قرآن شریف اس قدر روانی سے پڑھتے تھے کہ صرف ڈھائی گھنٹے میں پورا قرآن مجید ختم کر لیتے تھے۔ فارسی میں ضروری استعداد حاصل تھی۔ خوش نویس بھی تھے اور زود نویس بھی۔ مہذب اخلاق سلیم الطبع اور حلیم طبیعت تھے۔ ابتدائے شباب ہی سے اردو شاعری کا چسکا پیدا ہو گیا تھا اور اسی ذوق کی وجہ سے اکثر اساتذہ کے دیوان فراہم کر لیے تھے۔ جن کے متواتر مطالعے سے شعر گوئی کا ملکہ پیدا ہو گیا لیکن اول اول اپنی شوخ مزاجی کی بنا پر ہجویہ کلام زیادہ لکھتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مولوی کرم محمد کرم کے ایما سے مرثیہ و سلام لکھنا شروع کیے اور مدت تک اسی روش پر قائم رہے۔ مرثیہ و سلام کی اصلاح مولوی کرم محمد ہی کرتے تھے۔ مولوی صاحب مذکور لکھنؤ سے کانپور جانے لگے تو انھیں مصحفی کی شاگردی کا مشورہ دیا۔ اور اسی مشورے کے مطابق وہ مصحفی کے شاگردوں میں داخل ہو گئے۔ یہ شاگردی ۱۲۳۰ھ ہی میں عمل میں آئی۔ اب

اُن کے سامنے عاشقانہ شاعری کا وسیع میدان تھا جس میں رہوارِ طبیعت کو جولانی کا موقع میسر آیا۔ اس کے بعد صرف دو تین سال کی مدت میں ایک دیوان بھی مکمل کر لیا اور نثر کی دو کتابیں انیسِ ظہور ۱۲۳۲ھ اور خاتمِ سلیماں ۱۲۳۲ھ کے نام سے مرتب کیں۔ دوسرا دیوان بھی قریب الختم تھا۔ مزید برآں ایک دیوان خمسہ بھی ترتیب دینا چاہتے تھے خدا جانے اس ارادے میں کامیابی ہوئی یا نہیں۔

ظہور نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس کے کچھ اشعار محمد بخش مہجور نے نورتن میں درج کیے ہیں مگر ہمیں نہ اس کا نام معلوم ہو سکا نہ سنہ تصنیف اور نہ اس داستان کی تفصیل مل سکی جو اس مثنوی میں نظم کی گئی ہے۔

انتخابِ کلام —

ملتا ہے جوابِ خطِ عشاق یہ شمشیر　　کیونکر کرے وہاں عزم کوئی نامہ بری کا

خیال کس کے رُخ و زلف کا تھا تجھ کو ظہور　　سحر سے شام تلک تو جو اشکبار رہا

پہنچائی میری خاک نہ کوچے میں یار کے　　اتنا بھی کام تجھ سے نہ بادِ صبا ہوا

جب تلک حسن سے اپنے وہ خبردار نہ تھا　　کوئی اُس شوخ ستمگر کا خریدار نہ تھا

رات کو جا کے جو دیکھا ترے بیمار کے پاس　　آہ و نالہ کے سوا ایک بھی غمخوار نہ تھا

ان دنوں آپ کی ہے گرمیٔ بازار بہت　　جنس کم یاب پہ گرتے ہیں خریدار بہت

سب سے انداز جدا ہے ترے کہنے کا ظہور　　اہلِ دانش نہ کریں کیوں ترے اشعار پسند

بن رہا ہے عشق کے داغوں سے سارا تن چراغ　　میری تربت پہ نہ کوئی کیجیو روشن چراغ

از بس کہ ناقبولِ سگِ کوئے یار تھے　　کھائے ہمانے بھی نہ مرے استخواں دریغ

کرے ہے منع جو اے باغباں سیرِ گلستاں کو　　تجھے گلشن مبارک ہو چلے اب ہم بیاباں کو

نکلے نہ اُس کے رہتے تھے دیوانہ پن میں ہاتھ　　وحشی ہے تیرے اس لیے باندھے کفن میں ہاتھ

سچ کہہ بغیر حسرت و حرمان و یاس و غم　　کچھ بھی لگا ظہور محبت کے فن میں ہاتھ

سیاہ بختی نے پہنچایا زلف تک نہ ہمیں     کہ شرحِ حالِ دلِ خستہ مو بمو کرتے

اُٹھ جائے ظہور آنکھ سے غفلت کا جو پردہ
اس پردۂ ہستی میں کیا کیا نظر آوے

## مثنوی کے چند اشعار

خوشی رہ تُو چلے ہم اپنے گھر کو     وصیت کرتے ہیں تجھ بے خبر کو
نہ تو آئے گی میرے پاس جب تک     نہ نکلے گی مری جاں تن سے تب تک
تغافل کی قسم، تو جلد آنا     عدم کو تا ہوں میں جلدی روانا
نہ دکھلانا عذابِ نزع مجھ کو     قسم ہے کشتۂ اُلفت کی تجھ کو
چلا یہ کہہ کے پھر وہ جانِ ناشاد     چلے ہم اپنے گھر کو خانہ آباد

---

تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۹۲ ، خوش معرکہ اول ص ۴۳۷ ، سرو چراغاں قلمی
نورتن مختلف صفحات

---

## میر عارف علی عارف

ولد میر غلام رسول سید تخلص، نقوی خاندان کے ایک فرد، شاہ ولایت حضرت شاہ شرف الدین سہروردی کے اعقاب میں تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے میر جمیع الدین بن سید بدر الدین نبیرۂ حضرت شاہ ولایت پر منتہی ہوتا ہے۔

میر غلام رسول سید نام کے ایک بزرگ کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ اُردو کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ مجموعۂ نغز میں ہے :-

"سیدے از اہل قبول مسمی بہ میر غلام رسول (سید) وے از بزرگ زادہائے مستقر دار الخلافۃ اکبر آباد مرد تقوی نہاد است خیال شاعری در نہادش خیلے جا دارد و خود را از اساتذۂ آں دیار می شمارد ایں سہ بیت از گفتہائے اوست ؎

بالا تو بلا، چاند سا مکھڑا ہے ببھوکا — اک بقعہ کا عالم ہے، سراپا ہے ببھوکا

یاد آئے ہے وہ شوخ تو کیا دل کی طپش ہے — سینے میں ہے اک آگ کا اٹھتا ہے ببھوکا

خوبرویوں کے تو ملنے سے نہ باز آئے گا دل — یہ تو بد خو، نہیں جانے ہی مگر جان کے ساتھ

عمدۂ منتخبہ میں اسی عبارت کو مختصر کر کے صرف "از پیرزادہائے مستقر الخلافۃ اکبر آباد" لکھ دیا ہے اور یہ ایک شعر درج کیا ہے ؎

شہ خوباں کی تو باتیں ہی سبھی شان کے ساتھ — غمزہ و ناز و ادا اُس کی ہے اک آن کے ساتھ

گلشن بیخار کے مصنف نے سید کو مشائخ مراد آباد میں شمار کیا ہے۔

کریم الدین نے ان کو مراد آبادی تو لکھا ہے مگر تخلص سیادت بتایا ہے اور صرف ایک شعر درج کیا ہے۔

سخن شعرا میں غلام رسول نام اور سید تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے ایک تو یہی غلام رسول ہیں جو کہیں مراد آبادی ہیں اور کہیں اکبر آبادی ہیں دوسرے سید غلام رسول سید خلف سید احمد ہیں جو رام پور کے باشندے ظاہر کیے گئے ہیں اور اُن کے نام سے یہ شعر ہے ؎

مژگاں پہ دمِ گریہ ہے لختِ جگر آیا — یا ہے شجرِ عشقِ صنم پر ثمر آیا

ہمارے خیال میں یہ ایک ہی تصویر کے تین رُخ ہیں چونکہ امروہہ کا تعلق ضلع مراد آباد سے ہے اور سید عارف علی عارف بھی مراد آباد میں تھے ممکن ہے کہ یہ نقل وطن ان کے والد میر غلام رسول سید کے زمانے میں ہوا ہو۔

میر عارف علی علوم معقول و منقول میں مولوی سید امام الدین نقشبندی کے

شاگرد تھے اصل سکونت امروہہ کے محلہ جعفری میں تھی لیکن وہاں سے محلہ سدو میں منتقل ہو گئے تھے بڑے فہیم و دانا، فقیر منش اور آزاد مزاج آدمی تھے۔ علم عروض و قافیہ پر عبور کامل حاصل تھا۔ غزل گوئی کا چسکا پیدا ہوا تو لکھنؤ پہنچے اور لالہ بینی پرشاد ظریف کی معرفت شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ مصحفی لکھتے ہیں :

"درعرصۂ قلیل ہم سلک تلامذۂ عالی طبیعت ایں خاکسار گردیدہ، ذوالفقار زباں را بجوہر نظم ہندی و فارسی بیار است"

عارف مستعد عالم اور خوش تقریر خطیب تھے، اہل تشیع سے اکثر مناظرہ کرتے رہتے تھے آخر عمر میں شعر و شاعری سے طبیعت ہٹ گئی تھی اور وعظ و نصیحت سے خلق اللہ کی ہدایت میں منہمک ہو گئے تھے۔ امروہہ کی سکونت بھی چھوڑ دی تھی اور مراد آباد چلے گئے تھے وہیں ۱۲۴۵ھ میں وفات پائی منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی نے جو مرحوم سے بدرجہا چھوٹے تھے یہ تاریخ انتقال کہی ہے

| | |
|---|---|
| مرد چوں عارف علی استاد مذہب البلمال | گفت ہاتف فکر تاریخِ غم و رنج و الم |
| از بکاو آہ و گریہ دیگر از حیف و ملال | گیر سر الفاظ در الفاظ فارس کن رقم |

اس کا حل یہ ہے :

ب - اس کے عدد ۲ تلفظ فارسی دو = ۱۰

ا - اس کا عدد ۱ تلفظ فارسی یک = ۳۰

گ - اس کے اعداد ۲۰ تلفظ فارسی بیست = ۴۶۲

ح - اس کے اعداد ۸ تلفظ فارسی ہشت = ۷۰۵

م - اس کے عدد ۴۰ تلفظ فارسی چہل = ۳۸

۱۲۴۵ھ

مولوی کریم الدین کا یہ لکھنا غلط ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ میں شعر کہنا ترک کرکے وعظ کہنا اختیار کیا اور لوگوں کو راہ مذہب پر لانا شروع کیا۔

میر عارف علی کے ایک لڑکے سید نیاز علی تھے یہ بھی شاعر تھے اور تعلیم و شاعری دونوں میں اپنے والد سے فیض پایا تھا۔ ان کا انتقال ۱۸۷۳ء میں ہوا۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں دوسری زوجہ سے جو شاہ قیام الدین چشتی کی نواسی تھیں ایک لڑکی مسماۃ ظرافت النساء یادگار ہیں۔ جو سید اشفاق احمد ساکن محلہ سدّو سے منسوب تھیں یہ اپنے شوہر سے ایک سال بڑی تھیں۔ اور اسّی سال عمر پاکر یکم جولائی ۱۹۵۱ء کو دہلی میں جہاں وہ اپنے چھوٹے لڑکے سید آل محمد کے پاس تھیں انتقال کیا۔ سید اشفاق احمد ان سے چالیس بیالیس سال قبل صرف ۴۶ سال کی عمر میں ۱۹۰۹ء میں انتقال کر چکے تھے۔ انھوں نے دو لڑکے سید انصار احمد اور سید آل محمد یادگار چھوڑے تھے۔ سید آل محمد اپنے ضلع میں مدرس رہے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آکر ہیڈ مدرسی تک ترقی پائی اور ابھی تک بفضل خدا موجود ہیں۔ راقم سطور کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں ان کے تین بلند اقبال لڑکے ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہیں۔

## کلام

ہے شمع پہ عالم مری شوریدہ سری کا — پروانہ سبق سیکھے ہے بے بال و پری کا
دے خضر کو وہ زہر کہ پھر مانگے نہ پانی — اک دم میں تصور تری پوشاک ہری کا

وہیں پھر آن کر تلوار بیٹھی — جہاں چاک گریباں پہ رفو تھا
زبانِ شانہ پر کاکل سے میرا — بیانِ تیرہ بختی مو بمو تھا

رات ساری مجھے دونوں کی تسلی میں کٹی — ہاتھ دل پہ سے اٹھایا تو جگر پر رکھا
چشم کی راہ اٹھ بہہ گیا پانی ہو کر — پڑی آنسو کی جگہ دیدۂ نمناک میں خاک

ہاتھوں کو چاک جیب تلک دسترس نہیں — میں کس کے بس میں ہوں کہ مرا کچھ بھی بس نہیں
بازو نہ باندھ کس کے تڑپنے دے تنگ مجھے — صیاد مجھ کو اس کے سوا کچھ ہوس نہیں

اُجڑا خزاں کے ہاتھ سے جب سے تمام باغ — سنسان ہے اس قدر کہ تنین مگس نہیں
بدلے نہ کیوں کہ کروٹیں ایدھر اُدھر ہزار — بستر ترے مریض کا جُز خار وخس نہیں
کس پر نظر کریں کہ کوئی شش جہت میں آہ — بالا و زیر ایدھر اُدھر پیش و پس نہیں
چپکے سے فصل گل میں ہے عارف کو دل لگی
دیوانہ پن کا شور کچھ اب کے برس نہیں

جب ہوا گرد سے وہ وقتِ شکار آلودہ — تیرِ خاکی بنے مژگانِ غبار آلودہ

---

مجموعۂ نغز اول ص۲۳۴، عمدۂ منتخبہ ص۳۹۰ ص۲۳۴، ریاض الفصحا ص ۲۲۵،
طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۹۸ ص۴۷۵، سخن شعرا ص۲۳۱،
منتخبۃ التواریخ ص۴۹، طور کلیم ص۶۹، ملخص تسلیم ص

---

## نواب عاشور علی خاں عاشور

یہ نواب محمد علی خاں خلف نواب شجاع الدولہ کے لڑکے اور نواب حسن علی خاں عبرت کے بھائی تھے۔ مرحوم نے عجیب رنگا رنگ طبیعت پائی تھی نہ کبھی اپنا کلام بیاض میں لکھا نہ کوئی دیوان مرتب کیا۔ نہ مشاعروں میں غزلیں پڑھیں اور نہ گلدستوں میں طبع ہونے کو دیں مگر استادانہ قابلیت کا یہ حال تھا کہ سیکڑوں کے کلام پر اصلاح دے کر پختہ کار شاعر بنا دیا۔ وہ خلق وحلم کا مجسمہ اور فضل وعلم کے پیکر تھے۔ ایک نامور خاندان کے نامور فرد اور علوم معقول ومنقول ایسی منفرد استعداد کے مالک تھے

ایں سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناصر نے انھیں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردوں کے سلسلے میں لکھا ہے لیکن خواجہ عشرت کہتے ہیں کہ:

"معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے اور مصحفی کے اچھے شاگردوں میں تھے بہت سے لوگ ان کے شاگرد تھے۔ استاد گر مشہور تھے۔ ان کی قبر معالی خاں کی سرائے میں پیر بخارا کے تکیے میں سُنی جاتی ہے"

نواب عاشور علی خاں کی نکتہ رسی اور نکتہ سنجی ضرب المثل تھی۔ میر یار علی جان صاحب اور میر باقر علی چرکین ردولوی کو انھیں کے فیض تربیت اور حُسن اصلاح نے مقبول عام بنایا اور طرز خاص کا شاعر تسلیم کرایا۔ علم عروض و قافیہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی۔ ان کے ایک استاد بھائی منشی مظفر علی اسیر نے تاریخ وفات کہی جسے یہاں درج کیا جاتا ہے

عاشور علی کہ بود نواب — خوش صاحب ہوش طوطیٔ ہند
در باغ جناں ز باغ ہستی — شُد جلوہ فروز طوطیٔ ہند
تاریخ وفات گفت ہاتف — گردید خموش طوطیٔ ہند

۱۲۷۷ھ

ان کے انتقال کے بعد طوطا رام شایاںؔ شاگرد اسیر نے طلسم شایاں کی تمہید میں نواب موصوف کے انتقال پر ان اشعار میں اظہار تاسف کیا ہے ؎

علی خاں یہ لکھوں پہلے جو عاشور — عیاں نواب کا ہو نام مشہور
ریاض نظم کے وہ رنگ و بو تھے — وہ دریائے سخن کی آبرو تھے

یہاں ہے نام زندہ وہ عدم میں — جگہ اللہ دے باغِ ارم میں

چرکینؔ و جان صاحب کے علاوہ نواب احمد حسن عرف اچھے صاحب جوشؔ جو بعد میں اسیر کے شاگرد ہو گئے تھے۔ سید اکبر علی تمیزؔ، غلام حسین خاں وحیدؔ۔ رگھبیر نراین عیاشؔ لکھنوی مصنف چمنستان بہار، مقصود عالم مقصود پھپھوندی بھی انھیں کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے

نواب عاشور علی خاں کی تصنیفات میں صرف دو چیزیں ملتی ہیں ایک چہار شعری غزل جو سید محسن علی محسن کی فرمائش پر سراپا سخن کے لیے لکھی تھی دوسرا وہ مخمس جو ناصر کے اصرار پر کہا تھا۔ ان دونوں کو من وعن یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

کعبۂ صدق و صفا مشرقِ انوار دل　　عالم علم خفی مخزن اسرار دل

خضر طریقِ وفا۔ عیسیٔ معجز نما　　برق تجلی طور، طالب دیدار دل

خاکی و قدسی سرشت، نوگل باغ بہشت　　آئینۂ حق نما شمع شب تار دل

نالۂ قلبِ سقیم، گوہر اشکِ یتیم　　کشتۂ گلگوں قبا بزم عزا دار دل

---

عارفِ رازِ خفی، سیار او ادنیٰ علیؑ　　مرجع والنجم سبحان الذی اسریٰ علیؑ

بابِ شہرِ علم و فخر یثرب و بطحا علیؑ　　مُبطل آثار بدعت اصاحب فتویٰ علیؑ

قاریٔ قرآں، خطیب مسجد اقصیٰ علیؑ

رونقِ بزم ولایت، جانشین مصطفےٰؐ　　حامل عرش معظم، کار فرمائے قضا

حرز اربابِ فتوت، کاشف کرب و عنا　　رازق ہر ذی حیات و فائق حب و لوا

نقشبندِ صورتِ اطفال یا مولا علیؑ

اشجع و منصور و صفدر، غازی و دریدہ صف　　شیر حق معجز نما۔ نساخ ادیان سلف

قبلۂ اہلِ یقیں، امیر عرب شاہ نجف　　مہبط انوار قدسی، نیر برج شرف

نائب خیر الوریٰ، بے مثل و بے ہمتا علیؑ

خازن علم الٰہی، شارحِ آیات روح　　رحمت اللعالمینؐ، فتاح ابواب فتوح

معجزہ بخش سلیمانؑ، مرشد داؤدؑ و نوحؑ　　مونس ایوبؑ و یوسفؑ، غمگسارِ خضرؑ و نوحؑ

ہالک فرعونِ بے دیں، حافظ موسیٰؑ علیؑ

ہادی و رہبر، امام و مقتدائے کائنات　　زینت محراب و منبر رونقِ صوم و صلوٰۃ

اشرف اولادِ آدمؑ، سید والاصفات　　طیبؑ طاہر لطیف و صاف طینت پاک ذات

آشنائے بحرِ عرفاں، گوہر یکتا علیؑ

---

خوش معرکہ زیبا دوم ص۱۱۸، سراپا سخن ص۲۹۰، طلسم شاہاں ص۵
رسالہ معیار مارچ ۱۹۰۷ء، آب بقا ص۳۰، دیوان اسیر ص۴۸۰
دیوان غریب ص۳۰۴

---

## حافظ قاسم علی عاصی رودلوی

حضرت شاہ احمد عبدالحقؒ کے دیار پُر انوار کے باشندے، مزاج کے غریب، حافظ قرآن اور نابینا تھے تعلیم رسمی تھی لیکن طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس لیے غزل کہنے لگے اور اصلاح کے لیے غلام ہمدانی مصحفی کی خدمت میں آئے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ اس کی زبان تو درست تھی مگر محاورات کا صحیح علم نہ تھا۔ مصحفی نے ان کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے اس میں سے چند شعر بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں ؂

ہر چند کہ ہر شوخ کا اک ناز جُدا ہے — پر نامِ خدا آپ کا انداز جُدا ہے

شاید کوئی بے درد مجھے یاد کرے ہے — جو مثل جرس دل مرا فریاد کرے ہے

خواب میں بھی نہ اگر صورتِ یار آئے نظر — دلِ بے تاب کو کب شکل قرار آئے نظر
خواہش سیرِ چمن کب اُسے ہووے کہ جسے — اپنے سینے ہی میں داغوں کی بہار آئے نظر
چین پڑتا ہی نہیں اس کے بغیر اے عاصی — کاش اک بار تصور ہی میں یار آئے نظر

تو ہی نہ اگر پاس مرے آن رہے گا — کس طرح سے پھر جان مرا جانؔ نہ رہے گا
واقف وہ نہیں گرچہ ابھی نام سے میرے — پھر دل کو تسلّی ہے کہ پہچان رہے گا

ریاض الفصحا۔ ص ۲۳۳

# میر محمد یعقوب عباس لکھنوی

میر محمد انور کے بیٹے تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ اور وہ ہمیشہ شاہی ملازمت سے بہرہ ور رہے۔ عباس کی پیدائش بھی دہلی ہی میں ہوئی تھی لیکن نشو و نما لکھنؤ میں حاصل کیا۔ مزاج میں موانست تھی اور اخلاق پسندیدہ رکھتے تھے۔ آغاز جوانی ہی میں اہل سخن کی ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور طبیعت شعر گوئی کی طرف راغب ہو چلی تھی۔ ابتدا میں کچھ مدت میر تقی کی خدمت میں آنے جانے کا اتفاق رہا۔ اسی دوران میں میر سوز سے اصلاح لینے لگے۔ پھر میر قمر الدین منت کی شاگردی حاصل کی اور آخر میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی جانب رجوع ہو کر کمال کو پہنچے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ بندش کلام درست ہے اور اصلاح کی ضرورت زیادہ نہیں ہوتی صاحب گلشن ہمیشہ بہار نے ان کے بارے میں لکھا ہے

"اشعار خوب گفتے و مراثی با اسلوب چوں در سفتے باؤ بر نخوردہ ام فامّا بسماعت شعرش حظّے وافر بُردہ"

میر یعقوب لکھنوی نام کے ایک بزرگ کا انتقال ۱۲۳۷ھ میں ہوا جو عباس تخلص کرتے تھے ان کی وفات کا یہ قطعہ تاریخ دیوان ناسخ میں موجود ہے ؎

افسوس افسوس میر یعقوب     از مردنِ خود مرا رسانید آلام<br>
تاریخِ وفاتِ او نوشتم یا رب     عباس بفردوس کند عیش مدام

۱۲۳۷ھ

معلوم ہوتا ہے یہ وہی میر محمد یعقوب ہیں جو مصحفی کے شاگرد تھے اور ان کا ذکر ریاض الفصحا

ہیں عباسؔ کے بدلے عیاشؔ تخلص کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ریاض الفصحا کا مخطوطہ پڑھنے والے نے عباسؔ کو عیاشؔ پڑھ لیا ہوگا جو عباس کے مقطعوں تک میں قائم رہا۔ اور تصحیح نہیں کی جا سکی۔ یہی میر محمد یعقوب عباسؔ جن کا انتقال تذکرہ ریاض الفصحا کی تکمیل ۱۲۳۶ھ کے معاً بعد ہوا اور جو اپنے ابتدائی عہد میں میر تقی، میر سوزؔ اور قمرالدین منّت وغیرہ سے استفادہ کا موقع پاتے رہے تھے۔ عیاشؔ تخلص کے اس دور کے کسی شاعر کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔

عباسؔ کے کلام کا انتخاب پڑھیے ؎

اللہ ری تیرہ بختی کہ مرنے کے بعد وہ
سوسن کے پھول قبر پہ میری چڑھا گیا

قدرت خدا کی دیکھو مرے دل کے زخم کو
چھڑکے تھا جو نمک وہی مرہم لگا گیا

تھا شہرہ بدکلامی کا عباسؔ جس کی کل
دو چار گالیاں وہ مجھے بھی سنا گیا

---

سایہ کرے گر ہا کسی خاک نشیں پہ
وہ نخل کہاں ہے ترے کوچے کی زمیں پر

گھوڑے پہ چڑھا وہ تو ہر اک کو نظر آیا
بتخانۂ چینی کا سماں خانۂ زیں پر

سجدہ کروں ہر بت کو میں اے کاتب قدرت
لکھا تھا یہی تو نے مگر میری جبیں پر

وہ سوختہ دل ہوں کہ مری آہ کی بجلی
گرتی ہے سدا کنگرۂ عرش بریں پر

پڑھتا ہوں دل اپنے کا جہاں مرثیہ عباسؔ
روتی ہے سبھی خلق مری موتِ حزیں پر

خنجر بیداد کو سنگ فساں پہ تیز کر
وقت قتل اتنا ترحم مجھ پر اے خونریز کر

پیر میخانہ یہی کہتا ہے ہر اک رند کو
صحبتِ زاہد سے جتنا ہو سکے پرہیز کر

---

نہ کہیے دردِ دل اپنا کسی سے
اگر کہیے تو کہیے اپنے جی سے

کٹے گی کیونکہ پیاری رات اس بن
کرے ہے دل تو بے تابی ابھی سے

جدائی میں جیوں کب تک میں عباسؔ
بھلی ہے موت ایسی زندگی سے

---

دل بھر آئے ہے جوں جوں اسے خالی کیجیے
فکر اس درد کی کیا لئے مرے والی کیجیے

ایک پرواز بھی گلشن میں نہ کرنے پائے — کیا ترے ہاتھ سے اے بے پر و بالی کیجیے
عشق دیکھو کہ ٹپکتا ہے لہو بلبل کا — گر قلم باغ میں گُل کی کوئی ڈالی کیجیے

گولی بھر کر وہ طپنچے ہی کہے ہے، اِس کو
دل میں آتا ہے کہ عباس یہ خالی کیجیے

---

گلشن بے خار صـ ۱۳۸، گلشن ہمیشہ بہار صـ ۲۳۲، ریاض الفصحا صـ ۲۱۴
دیوان ناسخ صـ

---

## نواب حسن علی خاں عرف بڑے آغا عبرت

خلف الصدق نواب محمد علی خان بہادر ابن نواب شجاع الدولہ بہادر والیٔ لکھنؤ بڑے خوش ذوق رئیس تھے۔ شعر و شاعری میں بہت زیادہ انہماک رکھتے تھے ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کو ان کے دولت خانے پر مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں شہر کے تمام سربر آوردہ شعرا شریک ہوتے تھے۔ مصحفی کے تلامذہ میں تھے اور بقول ناصر ۱۲۶۱ھ میں نہ صرف کامیاب و خوش گو شاعر تھے بلکہ استادی کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔

انتخاب کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

شرم شیریں ہے تری شرم و حیا سے پیدا — حسن لیلیٰ ہے ترے رُخ کی ضیا سے پیدا
سرو قد شوخ نے مہندی جو ملی پاؤں میں — گُل لالہ ہوا ہر نخلِ حنا سے پیدا
رشکِ شیریں ہے ترا شیریں دہن اے فرہاد — تھوک دیوے وہ جہاں ہوویں جفا سے پیدا
کیا کہوں حال شبِ ماہ میں تم سے عبرتؔ — شوقِ وصل اور ہوا اُس کی ضیا سے پیدا

رشکِ خلیل وہ گُلِ خنداں نظر پڑا — آتش کدہ میں دل کے گلستاں نظر پڑا
آنکھوں نے جو لگائی یہ برسات کی جھڑی — ساون بھی میرے حال پہ گریاں نظر پڑا
داغوں بھرا جو دل لیے گلشن میں ہم گئے — سروِ چمن بھی سروِ چراغاں نظر پڑا

---

یادِ دنداں میں مرا ہر اشک گوہر بن گیا — جوہری بازار دیکھو، دیدۂ تر بن گیا
آتشِ فرقت نے دل میرا جلایا اس قدر — مجمرِ سینہ میں دل میرا تو اخگر بن گیا

---

اس قدر تیرا تصوّر ہے مرے پیشِ نظر — در و دیوار سے پیدا تری تصویر ہے آج
بحرِ خوبی تری زلفوں کا تصوّر آیا — موج دریا کی مرے پاؤں میں زنجیر ہے آج
صدقے اس منہ کے وہ جب منہ سے یہ کہتا عبرت — کیوں مری جان تو کس واسطے دلگیر ہے آج

---

جب آئینۂ دل ہو غباروں سے مکدّر — پھر چاند سا مکھڑا ہمیں دکھلاتے ہو ناحق
پوشیدہ جو کچھ حال تھا ظاہر ہوا سب کو — جھوٹی مری قسمیں اجی تم کھاتے ہو ناحق

---

اُجڑا پڑا ہے آج سراسر مزارِ دل — کس زلف نے کیا ہے الٰہی شکارِ دل
تکیے میں دفن میں ہوں وہ ہے کوئے یار میں — میرا الگ مزار، جدا ہے مزارِ دل
گردِ کدورت آئینہ رو کی مٹی نہ ہائے — ہرچند اشکِ گرم سے دھویا غبارِ دل

عبرت کہیں تو کس سے، سُنے کون حالِ دل
کوئی نہیں ہے غم میں ذرا غمگسارِ دل

---

خوش معرکہ جلد اول ص ۱۴۸ ، سراپا سخن ص ۳۵، ۲۴۷

---

## شیخ فضل رحمٰن عدل بدایونی

خاندان بنی حمید کے ایک فرد تھے ان کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے قاضی شہر

بدایوں قاضی صدر جہاں پہ منتہی ہوتا ہے جو قاضی عبدالوہاب ثانی کے بھائی تھے۔ یعنی فضل رحمٰن بن قاضی فیض الرحمٰن اول ملازم برطانیہ ابن قاضی عبدالرحمٰن قاضی تلہر بن حکیم قدرت اللہ بن محمد حاکم بن محمد زاہد بن عبدالمحمد بن قاضی صدر جہاں۔

عدل ایک مسکین طبیعت شخص تھے۔ تحصیل علم کے لیے وطن سے لکھنؤ پہنچے وہاں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا اور کچھ کہنے لگے تو اصلاح کے لیے شیخ مصحفی کے دربار ادب میں حاضری دینے لگے۔ مصحفی اپنے شاگرد غلام اشرف افسر کے مکان پہ ایک مجلس شعر و سخن منعقد کیا کرتے تھے۔ جس میں ان کے تمام تلامذہ شامل ہوتے تھے۔ عدل بھی اس میں برابر شامل ہوا کیے۔

وطن واپس آنے کے بعد سرکار برطانیہ میں ملازمت اختیار کر لی اور منصفی کے عہدے تک ترقی پائی۔ کچھ مدت تلہر ضلع شاہجہان پور میں بھی تعینات رہے تھے۔ مولوی شفاعت اللہ شفاعت حمیدی بدایونی جن کا ذکر خمخانہ جاوید میں ہے۔ اُن کے ہم زلف کے لڑکے تھے وہ اپنی ایک مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

خالو مرے قاضی فضل رحمٰن ۔۔۔ منصف تھے تلہر کے وہ سخندان
عدل ان کا تخلص اُن پہ زیبا ۔۔۔ عالم میں سخنوری کا چرچا
شاگرد رشید مصحفی تھے ۔۔۔ خاقانی کہوں کہ عسجدی تھے
قاضی جو کبیر خاندان تھے ۔۔۔ ناظم تھے فصیح و نکتہ داں تھے

افسوس ہے کہ ان کا مزید کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف ایک شعر دستیاب ہوا ہے جو مصحفی نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اور اسی کو سعادت خاں ناصر نے نقل کیا ہے:۔

دل میں آتا ہے کہ اب محتسب و قاضی کو ۔۔۔ جمعہ کے روز لڑا دیکھیے پالی کیجیے

---

خوش معرکہ زیبا حصہ اول صفحہ ۲۳۔ ریاض الفصحا صفحہ ۲۲۴۔ بدایوں قدیم و جدید صفحہ ۶۳

## شاہ مظہر حق عشاق

لکھنؤ میں رہتے تھے مصحفی لکھتے ہیں کہ "میں اس کے حسب و نسب سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کا بڑا بھائی نواب آصف الدولہ کی فوج کا قدیم ملازم ہے اور اس نے فقیرانہ وضع قبول کر کے عزلت اختیار کر لی ہے"۔

عشاق کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مصحفی کی خدمت میں آ کر اردو شعر و سخن کی باریکیوں سے واقف ہوئے اور فکرِ سخن کرنے لگے حتیٰ کہ اچھے خاصے شاعر بن گئے۔ مزاج میں حسن پرستی تھی جس نے درویشی سے مل کر اشعار میں ایک قسم کی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ مصحفی نے ان کی تین غزلیں اپنے تذکرے میں دی ہیں جن کا انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

جانِ غم میں قدِ موزوں کسے جو یاد نہ ہو
سبزہ تربت کا مری روکشِ شمشاد نہ ہو

ادبِ عشق سے تڑپا نہ میں خنجر کے تلے
تر لہو سے مرے تا دامنِ جلّاد نہ ہو

دفترِ عشق میں اے بادشہِ کشورِ حسن
فردِ باطل ہے وہ جس پر کہ ترا صاد نہ ہو

میں کبھی منزلِ معنی کو نہ پہنچوں عشاق
رہنما میری اگر شفقتِ استاد نہ ہو

---

شکوے کی زباں سے جو میں تقریر لگا لی
ناداں نے مرے قتل پہ شمشیر نکالی

یوسف کے مرقع پہ جو حیران ہوا مانی
تب میں نے بغل سے تری تصویر نکالی

آتا تھا کبھی خواب میں سو بھی ہوا موقوف
الٹی یہ مری آہ نے تاثیر نکالی

قاتل نے مجھے جرمِ محبت پہ کیا قتل
عشاق نئی اس نے یہ تعزیر نکالی

---

فیض مستی ہے سدا ساقیِ کوثر سے مجھے
کام ہرگز نہیں کچھ بادہ و ساغر سے مجھے

طالعِ بد نے دکھایا نہ کبھی وصل کا دن
چین اک شب نہ ملا گردشِ اختر سے مجھے

میں تو پہنچا ہی تھا واں بھیس بدل کر عشاق
رات درباں نہ اٹھا دیوے جو اس در سے مجھے

ریاض الفصحا ص ۲۱ ، خوش معرکہ جلد اول ص ۲۴۱

---

## نواب طالب علی خاں عیشی لکھنوی

نواب علی بخش خاں رفیق و مصاحب الماس علی خاں خواجہ سرائے شاہی لکھنؤ کے صاحبزادے تھے۔ جن کو ناصر نے خانہ زادہ لکھا ہے۔ یہ بڑے خوش فکر، قادر الکلام اور نکتہ سنج شاعر تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے وہ سننے والوں کے دل و دماغ پر یکساں اثر انداز ہوتا تھا۔ نثر نویسی میں قدیم انشا پردازوں کے سچے مقلد تھے۔ مصحفی کے نہ صرف شاگرد بلکہ مخلص دوست بھی تھے اور ابتدائے ملاقات سے آخر تک یکساں عقیدت و محبت پر قائم رہے۔ مصحفی کہتے ہیں :

"خوشہ چینی از فیض صحبت انشاء اللہ خاں و مرزا قتیل وغیرہ ہمہ کردہ اقرار بشاگردی یک کس نمی کند"۔

انکار کرنا شاگرد نہ ہونے کی علامت نہیں ہے۔ فیض صحبت حاصل کرنا جس میں فیض اصلاح بھی شامل ہو بجائے خود ایک قسم کا تلمذ ہے اور وغیرہم میں خود مصحفی بھی شامل ہیں۔ اس انکار کے باوجود بہت سے تذکرہ نویسوں نے انھیں مرزا قتیل اور مصحفی دونوں کا شاگرد بتایا ہے۔

"اصلاح شعر ہندی از غلام ہمدانی مصحفی یافتہ و مشق فارسی از مرزا قتیل صاف نمودہ"۔ (ذکا)

"بپارسی استفادہ از قتیل و در ریختہ از مصحفی نمودند" (شیفتہ)

"فارسی میں خنجر مصرع قتیل کے شہید یعنی نظم و نسق میں شاگرد رشید اور

اُردو میں میاں مصحفی ان کے محافظ صورت سخن" (باطن)

" فارسی کا شعر مرزا قتیل سے سیکھا اور ریختے میں مصحفی کا شاگرد ہے" (کریم الدین)

بعد کے بعض محققین بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عیشی مصحفی کے تلامذہ میں شامل تھے مصحفی کے ایک شاگرد طالب علی خاں عیشی نے سوز و ساز اور دوسرے شاگرد میر تقی ہوس نے لیلیٰ مجنوں لکھ کر اپنے استاد کی لاج رکھ لی"

نیاز فتح پوری مقدمہ مرزا شوق ص ۲۲

عیشی اُردو و فارسی میں بالکل غالب تھے ان کی نظم و نثر دیکھنے کے قابل ہے۔ اُردو کا دیوان سبحان اللہ دہلی کی شان اور غالب کا رنگ فارسی آمیز۔ فارسی کے دیوان میں نظیری کا رنگ، فارسی میں بقول بعض مرزا محمد حسن قتیل سے تلمذ تھا اور اُردو میں شیخ مصحفی سے اصلاح لی تھی۔ خواجہ عشرت لکھنوی

بوہر لائبریری کے فہرست نگار کا بیان ہے:

He was a native of Lucknow and a pupil of Mohemmed Hasan Qatil and Mushafi

مرزا قتیل کی شاگردی کا ایک اور ثبوت ناصر کے اس بیان سے ملتا ہے

" مرزا افغانی نوازش فرماتے تھے کہ مرزا قتیل کے مرض الموت میں شیخ ناسخ اور ہم واسطے عیادت کے گئے تھے اور استفسار کیا تھا کہ مرزا صاحب کا قائم مقام کس شخص کو زمرۂ تلامیذ میں سمجھا جائے۔ فرمایا۔ طالب علی کو۔"

اس بیان سے جب شاگردیٔ قتیل سے انکار غلط ثابت ہوتا ہے تو دغیرہم میں شامل مصحفی کی شاگردی خود بخود صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔

بہر حال طالب علی خاں عیشی کی فکر سخن شائستہ آفریں اور نظم نگاری دلا دینے

و دل نشیں تھی۔ افسوس کہ اس باکمال شاعر نے عین جوانی میں ہیضۂ وبائی میں مبتلا ہوکر ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔ شیخ ناسخ نے یہ قطعۂ تاریخ وفات نظم کیا ہے ؎

آہ طالب علی عیشی رفت — ناگہاں زیں سرائے رنج و محن
مرضش ہیضۂ وبائی بود — کہ ازاں رفتہ جانِ او از تن
بود اے وائے طبع موزونش — بلبلِ نغمہ سنج باغ سخن
از بہارِ کلام رنگینش — می شدی بزمِ شعر رشکِ چمن
گفت سالِ وفاتِ او ناسخ — ہائے افسوس اے سخنورِ من

۱۲۴۰ھ

دس ہزار اشعار کے اُردو دیوان اور پندرہ ہزار اشعار کے فارسی دیوان کے علاوہ فارسی و اُردو کی کئی مثنویاں تصنیف کی تھیں۔ کوئی دیوان تو شاید ابھی تک نہیں چھپا البتہ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۱۴ء میں عیشی کے اُردو دیوان کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ البتہ مخطوطات متعدد کتب خانوں میں ہیں۔ ایک دیوان فارسی کا اور ایک دیوان اُردو کا مخطوطہ انجمن ترقی اُردو پاکستان (کراچی) کے کتب خانۂ خاص میں ہے۔ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ایک کلیات فارسی بوہر لائبریری میں ہے اس میں ایک مثنوی "خزان و بہار" اور دوسری مثنوی ہجو بقال بھی ہے۔

عیشی کی ایک اور قابل قدر تصنیف ہے 'سرو چراغاں' یہ فارسی و اُردو کی ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو صائب کی اس زمین میں لکھی گئیں ؎

بر سرائے را کہ باشد از دل روشن چراغ — می جہد شبہائے تار از دیدۂ روزن چراغ

سرو چراغاں ۱۲۳۰ھ میں مرتب کیا گیا اس کا تاریخی نام "داغ بے دود" ہے یہ فارسی کے (۸) اور اردو کے (۳۳) شعرا کے کلام کا جامع ہے اور اس کا ایک مخطوطہ جو ۱۳ سطری مسطر میں (۲۳) اوراق میں ختم ہوا ہے۔ جناب مشفق خواجہ صاحب کے

ذریعہ نگاہ سے گزرا ہے۔

اب اردو اور فارسی کلام کا انتخاب دیکھئے

دل گرفتہ ہوں کرو ں گا ہو کے مَیں آزاد کیا
مجھ کو یکساں ہے چمن کیا خانۂ صیاد کیا

ایک عالم کر دیا برباد جس کے حسن نے
نقش ایسا کھینچنا تھا صانعِ ایجاد کیا

زخم کاری جسم پر کشتوں کے جان تازہ ہے
آب حیواں میں بجھا تھا خنجر جلاّد کیا

ہچکیاں آتی ہیں ہم کو شیشۂ مے کی طرح
میکشوں کو آج ساقی نے کیا ہے یاد کیا

خوں ہوا عیشی رگوں سے چشم تر کے موجزن
تھا خیال نوکِ مژگاں نشترِ فصاد کیا

کون پابندِ جنوں، فصل بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

دفن کس عارض روشن کا ہوا یاں کشتہ
نور یہ شمع سرِ گورِ غریباں میں نہ تھا

چشم پوشی ہے عبث مجھ سے کہ مانند سرشک
دیکھنا مجھ کو کہ اک جنبشِ مژگاں میں نہ تھا

تہمت جیب عبث مثلِ سحر ہے مجھ پہ
نام کو تار کبھی میرے گریباں میں نہ تھا

عیشی اس میکدے میں تب ہمیں لائی تقدیر
دُرد بھی جب کہ خم بادہ پرستاں میں نہ تھا

دیکھیں گے عقلِ کل تری ہشیاریوں کا حال
گر سامنا ہوا کسی مست شراب کا

زخم تیرِ عشق سے عیشی وہی آگاہ ہے
ہے جو زخمی اس خدنگ بے کمان و شست کا

رویا میں یاد کر کے بہت ماجرائے دل
پروانہ رات جل کے جو محفل میں رہ گیا

سخن اس کے عجائب لطف لکنت میں دکھاتے ہیں
نزاکت سے زباں پر حرف کیا کیا لڑکھڑاتے ہیں

تن تنہا مبادا منزلِ ہستی میں رہ جاؤ
اُٹھو عیشی عدم کو قافلے یاروں کے جاتے ہیں

دندان ولب کے وصف میں تشبیہ ہے نئی
دو لعل ہیں ازل سے یہ کان گہر کے ساتھ

میں نے عیشی سے جو پوچھا دلِ پُرخوں کا حال
اک صراحی مئے گلگوں کی بھری دکھلائی

پھر جنوں سلسلہ جنباں ہے خدا خیر کرے
صحبت دست و گریباں ہے خدا خیر کرے

مستی شور جنوں عشق، عین ہوش ہے
عقل کل اس میکدے میں رند ساغر کوش ہے

دل بس کہ ضعیف و ناتواں ہے
تن پر مرے جان بھی گراں ہے

ہر دیدۂ نم میں جوشِ نم ہے
ہر نالۂ دل شرر فشاں ہے

افسانۂ سوز و ساز عیشیؔ
گر سنیے تو گرم داستاں ہے

## (فارسی)

خود بباد نیستی دادم غبارِ خویش را
ہمت من بر فلک نگذاشت کارِ خویش را

دادم بہ برق کشتِ تمنائے خویش را
یک سو نمودہ ام غمِ فردائے خویش را

---

دلم چو قبلہ نما فارغ از طپیدن نیست
بہ عالمے کہ منم، بختِ آرمیدن نیست

برنگ آئینہ سرتابپائے من چشم است
ولے ز حسرتِ حسنش، مجال دیدن نیست

تو خود ز لذت درد آشنا نۂ ورنہ
کدام خار کہ آمادۂ خلیدن نیست

بریدہ باد زبان تو، سوختم عیشیؔ
فسانۂ تو بہ اندازہ شنیدن نیست

---

نصیب من بجز اندوہ جاودانی نیست
بکشورے کہ منم، رسم شادمانی نیست

---

تا ریخت چشم ساقیٔ ما رنگِ وحشتے
مستی ز نشہ، نشہ ز صہبا گذشتہ است

---

دل تہِ خاک سرِ طرّہ جاناں دارد
سبزۂ تربتِ من، خواب پریشاں دارد

عیشِ کامل نہ شود روزی کس زیرِ فلک
حسرتِ آب برد چہر اگر ناں دارد

نے ہمیں ناز و ادا حلقہ بگوش ابرو ست
فتنہ ہم چشم بآں جنبش مژگاں دارد

---

خورشید رخ از پردۂ نیرنگ بر آمد
ہر ذرہ برنگ دگرے رنگ بر آمد

شوق است کہ آذر شد و صد بت تراشید
عشق است کہ مانی شد و از رنگ بر آمد

اعدام اگر سینہ بہ خنجر بہ شگافند
راز غم نتوانم ز دل تنگ بر آمد

تا برق اثر زد بہ چمن نالۂ عیشیؔ
شور از دل مرغانِ خوش آہنگ بر آمد

---

درخورظرف نگاہت بنود جلوۂ دوست ؛ چشم بر بند اگر حسرتِ دیدن داری
ہمت از دستِ جنوں خواہ کہ در فصل بہار ۔ جامہ در بر چو گل از بہر دریدن داری
ذوقِ پروازِ سرِ سدرہ چہ دانی عیشیؔ ؛ تو کہ در کنجِ قفس مشقِ طپیدن داری

---

عمدۂ منتخبہ ص۴۴۲ ، ریاض الفصحا ص۲۱۴ ، گلشن بے خار ص۱۳۷ ،
گلستان بیخزاں ص۳۷۶ ، گلشن ہمیشہ بہار ص۲۲۷ ، عیار الشعرا قلمی
طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۷۶ ، خوش معرکہ زیبا اول ص۳۲۶ ،
سراپا سخن ص۲۳۱-۳۷۴ ، سخن شعرا ص۳۴ ، دیوان غریب ص۳۰۲
جلوۂ خضر جلد دوم ص۱۳۵

---

## منوّر خاں غافلؔ لکھنوی

صلابت خاں یوسف زئی کے بیٹے تھے ان کے بزرگ فیض آباد میں رہتے تھے اور نواب شجاع الدولہ کے عہد میں سواروں میں داخل تھے ۔ دار السلطنت فیض آباد سے لکھنؤ تبدیل ہوا تو یہ خاندان بھی لکھنؤ آگیا ۔ غافلؔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی ۔ طبیعت میں صلاحیت اور مزاج میں بردباری تھی ۔ اخلاق اچھے رکھتے تھے مکتب نشینی کے زمانے ہی سے کچھ کچھ موزوں کرنے لگے تھے ۔ مگر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے تھے ۔ ایک دن شاہ مظہر حق عشاقؔ جو مصحفیؔ کے شاگرد تھے انھیں اپنے استاد کے پاس لے گئے اس طرح یہ مصحفیؔ کے شاگردانِ جدید کے حلقے میں شامل ہو گئے ۔ کچھ دن اپنے مکان پہ مجلسِ مشاعرہ کے انعقاد کا مشغلہ بھی رکھا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا ۔ البتہ استاد کے پاس روزانہ اصلاح

کلام اور حصولِ فن کے لیے آتے رہتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پختہ کلامی حاصل ہو گئی۔ ان کے کلام کے دو حصے ہیں کچھ حصہ سادہ اُسی رنگ میں ہے جو اُن کے استاد کا رنگ تھا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

با شاعران پیشیں غافلؔ مرا چہ کار است	خوش کردہ ایم طرزِ استاد مصحفیؔ را

دوسرا حصہ معنی بندی کا ہے جسے پرکاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ مصحفیؔ کے بعد سارے اہلِ لکھنؤ پر یہی رنگ غالب آ گیا تھا۔ ناسخؔ اور ان کے شاگرد تو بالکل معنی بند تھے۔ غافلؔ نے بھی آخر میں عام رواج کے مطابق اسی رنگ کو اختیار کر لیا تھا۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ ان حضرات کے مقابلے میں غافلؔ کو کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن اس میں شک نہیں کہ غافلؔ کی فکرِ سخن کی حیثیت معاصرین سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

کیا استاد کے یہ الفاظ ان کے بارے میں سند کی حیثیت نہیں رکھتے کہ "معنی تازہ اگر می خواہد می یابد و در غزل سلاست کلامش مثلِ سلکِ گوہر است"

غافلؔ اپنے آبا و اجداد کی طرح سپاہی پیشہ تھے اور جوان ہونے کے بعد وہ کن کن روٴساء کے رفیق رہے اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ آخر میں وہ نواب فقیر محمد خاں گویاؔ ملیح آبادی کے رفقاء میں شامل ہو گئے تھے۔

گویاؔ نے جو خود سپاہی پیشہ اور رسالہ داری کے عہدے پر فائز تھے۔ غافلؔ کو جوہر قابل سمجھ کر مناسب قدر و منزلت سے رکھا جہاں انھیں کسی قدر نام و نمود حاصل ہوئی۔ اس کا اعتراف خود غافلؔ نے بھی کیا ہے ؎

نمود اتنی کہاں تھی شاعری میں میری اے غافلؔ	میں اس شہرت کو فیضِ صحبتِ گویاؔ سمجھتا ہوں

غافلؔ کے صحیح سن وفات کا علم نہیں۔ ناصرؔ نے لکھا ہے کہ اس کے گھر میں ایک اثنا عشری عورت تھی، محرم کے ایام میں اس نے تعزیہ بنایا اس نے آٹھویں تاریخ کو خوب شراب پی اور عورت پر دست درازی کرنا چاہتا تھا اُس نے بُرا بھلا کہا اور کہتی ہوئی تعزیے

کے قریب پہنچ گئی اس نے ایک لکڑی اُٹھا کر اُس کو مارنا چاہا کہ اس پر لقوہ کا حملہ ہوا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے مر گیا۔

اس واقعہ کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں مقصود یہ ہے کہ یہ واقعہ ۱۲۶۱ھ سے پہلے کا ہونا چاہیے کیونکہ ناصر کے تذکرے کی تصنیف اسی سنہ میں ہوئی لیکن محسن نے اپنے تذکرے میں جو ۱۲۶۹ھ میں تصنیف کیا اور جس میں تمام اُن شعرا کے نام کے ساتھ مرحوم یا مغفور لکھا ہے جو اس سے پہلے مر چکے تھے۔ غافل کے نام کے سامنے نہ مرحوم لکھا ہے نہ مغفور۔ علاوہ ازیں غافل کی وفات کے اس خاص سبب کے بارے میں بھی کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔

دیوان غافل مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپ چکا ہے۔

غافل کی اولاد میں ایک لڑکے کا نام جھمو خاں تھا یہ صاحب کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور منشی نول کشور کے مطبع میں ملازم تھے منشی صاحب موصوف نے انھیں کی زبانی منور خاں غافل کے حالات سُنے تھے اور قلمی دیوان منگا کر شائع کر دیا تھا۔ جھمو خاں کے لڑکے عبداللہ خاں تھے یہ شاعری کرتے تھے عظمت تخلص تھا۔ حافظ رحمت بنارسی اور منشی بال کشن قمر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ غافل کے ایک اور پوتے امجد علی خاں تھے جن کا تخلص واحد تھا۔ ان کا کلام گلدستہ سخن میں چھپا ہے

منتخب کلام یہ ہے ؎

صاف کینے سے اگر ہو دل بدظن اپنا
دوست ہی دوست ہیں پھر کون ہے دشمن اپنا

بےخبر موت سے اپنی ہے یہ ناداں کیسا
آکے یاں بھول گیا آپ کو انساں کیسا

کیوں نہ پتھر سے ہم آئینۂ دل کو توڑیں
کب یہ شایانِ نگاہ غلط انداز ہوا

لگ گئی آگ گلستاں میں مرے نالوں سے
برق صد خرمن گُل، شعلۂ آواز ہوا

اُکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

گرمِ بازاریٔ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

برگِ گل لائی صبا قبر پہ میری نہ نسیم
بھر گئی ایسی زمانے کی ہوا میرے بعد

وہ ہوا خواہِ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا ہوں اور بادِ صبا میرے بعد

شرطِ یاری یہی ہوتی ہے کہ تو نے غافل
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا میرے بعد

---

جب آیا رحم عریانی پہ میری دیدۂ تر کو
پنھایا پیرہن آبِ رواں کا جسمِ لاغر کو

دُرِ دنداں کے تیرے وصف جب تحریر کرتا ہوں
بنا دیتا ہوں موتی کی لڑی ہر نقشِ مسطر کو

---

شکوہِ سلطنت کے آگے کیا ہے حُسن کا رتبہ
لیے پھرتی ہیں پریاں دوش پر تختِ سلیماں کو

سبک ساروں کو خطرہ کچھ نہیں قہرِ الٰہی سے
خس و خاشاک کشتی جانتے ہیں موجِ طوفاں کو

---

صدمہ ہجر مری جان اُٹھانے کی نہیں
تو نہ آوے گا تو کیا موت بھی آنے کی نہیں

---

کون یاں ہم صفیر ہے میرا
طائرِ عرش آشیاں ہوں میں

---

آب ہو جاتا ہے تیرے روبرو پتھر کا دل
آرسی کیونکہ ترے رُخ کی تماشائی ہوئی

---

دامنِ دل لے نسیم گلشنِ جنت نہ کھینچ
لگ گیا ہے جی ہمارا اس خراب آباد میں

شعر کہنا آپ سے غافل کبھی آتا نہیں
عمر اک جب تک نہ کھوئے خدمتِ استاد میں

---

قتلِ عاشق سے کجی ابرو میں تیرے آگئی
کیا نہ تھی یہ تیغِ فولادی جو یوں بل کھا گئی

انتظارِ یار میں تن سے نہ نکلی جان اور
موت بیٹھے بیٹھے بالیں پر مرے اُکتا گئی

کون دریائے محبت سے اُتر سکتا ہے یار
کشتیٔ فرہاد آخر کوہ سے ٹکرا گئی

---

جو قشقہ صندل کا ہے جبیں پر تو ساتھ ابرو کے خال بھی ہے
سپہرِ خوبی پہ ماہ بھی ہے سُہیل بھی ہے ہلال بھی ہے

---

نہ تو نام اُس نے بتایا تھا نہ کچھ گھر دینا
ہم کہاں ڈھونڈتے کیا کہہ کے پکارا کرتے

---

حُسن وہ شے ہے اگر کوئی زرِ گل کی طرح
لاکھ پردے میں چھپائے پہ نہاں ہوتا نہیں

---

دل کی دل میں رہی اپنے تمنا کیا کیا
وقفۂ عمر، دمِ چند تھا۔ کرتے کیا کیا

جیسے پاتا ہوں خالی جوہر اشک ندامت سے — صدف کی طرح ہنستا ہوں میں اُس کے جیب و دامن پر

میں وہ درماندہ ہوں ہر ایک جس کو یاد کرتا ہے — جرس کی طرح سارا قافلہ فریاد کرتا ہے

نگاہِ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے — کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

کبھی تو کھینچ لائے گی اُسے گورِ غریباں پر — کہ مُدّت سے ہماری خاک دامن گیر پھرتی ہے

ہم اُس لیلیٰ کے دیوانے ہیں اے غافل جو صحرا میں — بغل میں اپنے مجنوں کی لیے تصویر پھرتی ہے

غافل فارسی میں بھی کہتے تھے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

نقابے بر رُخش زیرِ نقاب است — نمیدانم چہ ایں طرزِ حجاب است

قدِ خم گشتۂ خود را تنظر کن — کہ عمرِ بے وفا پا در رکاب است

زخمِ ناخوردہ از سنانِ نگاہ — پیش پایت تپیدنم ہوس است

روحِ حافظ بخُلد می گوید — شعرِ غافل شنیدنم ہوس است

یارب بہ کہ حالِ دلِ غمزدہ گویم — امشب سرِ بالیں نہ انیسے نہ رفیقے

سراپا سخن ص ۱۰۷ ، ریاض الفصحا ص ۲۲۳ ، روز روشن ص ۵۸۲
عمدۂ منتخبہ ص ۵۳۴ ، دیوان غریب ص ۲۳۲ ، رسالہ تنویر کراچی مئی ۱۹۳۶ء

## شیخ مغل فانی لکھنوی

لکھنؤ کے قدیم باشندے تھے یا وہاں جا کر رہنے لگے اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ شاعر کم تھے اور نثر نگار زیادہ۔ لکھنؤ میں مجلس مناثرہ کا آغاز انھیں نے کیا تھا اول اول

اس مجلس مناثرہ میں شہر کے غیر مسلم زیادہ شریک ہوتے رہے اور فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں نثر نگاری کے جوہر دکھاتے رہے۔ اتفاق سے ایک روز مصحفی بھی اُدھر جا نکلے تھے اور شرکار مجلس کے کہنے سے اپنی ایک فارسی نثر "در وصف دوکان تنبولی" جو ظہوری کے تتبع میں لکھی تھی اس مجلس میں پڑھی تھی۔ فانی کو شعر و شاعری کا شوق تو تھا ہی کبھی کبھی مصحفی کی خدمت میں آنے جانے لگے۔ ان کی شعر گوئی نے مجلس مناثرہ کو مجلس مشاعرہ میں تبدیل کر دیا۔ اور مصحفی کے بہ نفس نفیس شامل مشاعرہ ہونے سے اُن کے تمام شاگردوں نے بھی اپنی شرکت کو لازمی تصوّر کیا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ شیخ مغل کو نواب کلب علی خاں بہادر کی سرکار میں توسل نصیب ہو گیا۔ اس کے بعد بھی اس وجہ سے کہ شیخ مغل سے قبل مصحفی خود بھی نواب کلب علی خاں کے دربار میں بصیغۂ شاعری امتیاز رکھتے تھے برابر شریک ہوئے۔ مصحفی کو جب نواب مہدی علی خاں کی سرکار میں رسوخ حاصل ہو گیا۔ تو اس مجلس مشاعرہ میں انھیں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ ان کے شاگرد کچھ مدّت ضرور شریک ہوتے رہے۔

فانی کے اس سے زیادہ حالات کسی تذکرے سے دستیاب نہ ہو سکے۔ کلام یہ ہے ؎

سحر زلفوں میں ہے اور معجزہ گفتار میں ہے　　　فتنہ آنکھوں میں ہے محشر تری رفتار میں ہے

سچ ہے یہ ہوتا ہے اقرار میں اک لطف عجیب　　　پر مزا کیا کہوں جیسا ترے انکار میں ہے

فانی نے پینے کو آیا نہیں شاید یارو　　　شور کم آج بہت خانۂ خمّار میں ہے

اُردو کے ایک رقعہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے!

کیوں سکھ بچن۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تو کڑھی پکانا تو اب تک باتیں بھگارتی ہے۔ ایسا نہ ہو پھلوری سی تیری ناک کاٹ ڈالوں۔

---

ریاض الفصحا ص ۲۵۰، خوش معرکہ زیبا اول ص ۲۲۵

# فدا حسین خاں فدؔا

خلف ضیاء الدین حسین خاں عرف آغا مرزا۔ یہ نواب حاتم خاں ابن نواب غضنفر خاں کے پوتوں میں تھے اور مغلوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اللہ وردی خانی کہلاتا ہے مصحفی کہتے ہیں کہ شاہزادۂ دشت قبچاق سلطان قرانوالہ کی اولاد میں تھے۔ فدؔا کے بزرگ علم رمل میں بھی بے نظیر تھے اور طبابت میں بھی معاصرین میں ممتاز تھے۔ معلوم نہیں ان کے آباو اجداد لکھنؤ میں کب آئے۔ فدؔا حصول تعلیم کے بعد غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو پہلے میر قمر الدین منّتؔ سے اصلاح لی۔ پھر منّتؔ کے خلف الرشید میر نظام الدین ممنوؔن کی شاگردی اختیار کی۔ آخر یہ تعلق بھی مستقل صورت اختیار نہ کر سکا اور آخر میں غلام ہمدانی مصحفؔی کے شاگرد ہو گئے۔ جو اس زمانے میں اُن کے ہم محلّہ تھے۔ اور ان کے مکانات بھی ایک دوسرے کے قریب تھے۔

مصحفی نے ۱۲۰۹ھ میں ان کی عمر بائیس سال بتائی ہے اس حساب سے سنہ پیدائش ۱۱۸۷ھ قرار پاتا ہے۔ لیکن ۱۲۱۹ھ میں جب فدؔا لکھنؤ کے محلہ انور گنج میں رہتے تھے اور تذکرۂ ہندی کا وہ مخطوطہ نقل کیا تھا جسے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا ہے وہ اپنی عمر سی ام (۳۰ سال) لکھتے ہیں۔ اس لیے صحیح سال ولادت ۱۱۸۹ھ سمجھنا چاہیے۔

دہلی میں فدؔا کے دو عم زاد بھائی نواب سبحان الدولہ اور دلیل الدولہ تھے۔ یہ دونوں اختلال دماغ کے مرض میں گرفتار ہو گئے تھے۔ خوب چند ذکاؔ کہتے ہیں کہ یہ انھیں دیکھنے دہلی آئے تھے۔ اور چند روز قیام کر کے واپس لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہ بات مصحفؔی کی شاگردی سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ذکاؔ نے صرف نظام الدین ممنوؔن کی شاگردی کا اظہار اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ مصحفؔی کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ زبان میں لکنت

تھی۔ اس لیے مشاعروں میں غزل پڑھنے سے اجتناب کرتے تھے اور اپنا کلام کسی دوسرے آدمی سے پڑھوا دیتے تھے۔

تذکرہ نگاروں نے فدا کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ذکا کے دوستوں میں تھے۔ ان کا بیان ہے کہ خیلے صاحب تلاش و سیر مشق و فصیح زبان اور ملیح بیان معلوم شد"

قاسم لکھتے ہیں" مرد خوش اختلاط مستحکم ارتباط، محبت مشحون۔"

میر علی اوسط رشک کے دیوان میں فدا حسین خاں۔ لکھنوی کی وفات کا ایک قطعہ تاریخ درج ہے۔ ممکن ہے انھیں کی وفات سے متعلق ہو۔ اس طرح وفات کے وقت ان کی عمر ۴۳ سال بیٹھتی ہے۔ بشرطیکہ اہل جوان تاریخی اعداد مکمل کرنے کیلئے نظم ہوا ہو۔ قطعہ یہ ہے ؎

با پدر جلیل خود عازم کربلا چو شد | ناگہاں در بردہ مُرد وائے فدا حسین خاں
مصرع سال رحلتش رشک حزیں چنیں نوشت | اہل جواں نیک رواے فدا حسین خاں

۱۲۶۲ھ

انتخاب کلام دیکھیے ؎

زبس مضموں باندھا ہے قد موزونِ جاناں کا | بلندی زور ہی رکھتا ہے مطلع اپنے دیوان کا
گسستہ ہو گیا شیرازۂ جمعیتِ خاطر | ہوا ہے پنجۂ کس کا شانہ اُس زلفِ پریشاں کا

وہ مہ گر شام کو رخ سے اُٹھا دیوے نقاب اپنا | چھپائے دامن شب میں وہیں منہ آفتاب اپنا

غیر کی تم نے کی خوشی اور ہمیں خفا کیا | خوب کیا، بھلا کیا خیر بہت بجا کیا

اُدھر تیرا گزر جس روز اے بادِ صبا ہوگا | تو کہیو جا کہیں ہی تھا فدا اب مر چکا ہوگا

تیری جولنگاہ میں سبک ہیں | ہر ایک کے جی پہ بار ہیں ہم

کوئی کیا سر جھکا کے ہووے ذلیل | ہاتھ تیرا کبھو اُٹھا ہی نہیں
اور ہی اُس کی ہوگئی ہیئت | کل جو دیکھا تو وہ فدا ہی نہیں

نہیں کھاتا وہ قسم غیر کے گھر جانے کی
سچ جو پوچھو تو یہی بات ہے مر جانے کی

وان ہمکنار غیر سے وہ رشک ماہ ہے
یہاں کنج غم میں شکوۂ بخت سیاہ ہے
تیروں کا ان بتوں کی دل آماجگاہ ہے
ہم آہ آہ کرتے ہیں واں واہ واہ ہے
ہے آئینہ میں اپنا ہی تو محو خال و خط
احوال پر کسو کے تجھے کب نگاہ ہے
ظالم یہ جرم دل ہے کہ عاشق ترا ہوا
قتل فنا عبث ہے کہ وہ بے گناہ ہے

خفا ہم آپ ہیں اس سے کہ دم ہے نہ رہے
ترے فراق میں اے یار ہم رہے نہ رہے

ناکام کیا رہیں گے کچھ کام کر رہیں گے
بدنام ہوں گے تو بھی اک نام کر رہیں گے
دل تو دیا ہے، جان بھی دیں گے فدا ہم آخر
آغاز عشق کا کچھ انجام کر رہیں گے

طاقت کہاں ہے لیکن اک دم رہا ہے باقی
اس ناتواں میں تیرے لیے دیکھیو کیا ہے باقی

یہ مرض قابل شفا ہی نہیں
درد کی میرے کچھ دوا ہی نہیں

کل جو دم غسل کی اس نے درنگ آب میں
کیا ہی ہوا موج زن حسن کا رنگ آب میں

خوباں کی کوئی زلف گرہ گیر دکھاؤ
دیوانہ ہوا ہوں مجھے زنجیر دکھاؤ

دو گرہ دل کو مرے زلف گرہ گیر کے ساتھ
میں تو دیوانہ ہوں مجھے ربط ہے زنجیر کے ساتھ
قتل ہوتے ہیں تو ہم وصل کے مشتاقوں کا
خون جاتا ہے بہت جوہر شمشیر کے ساتھ
ہر سحر ہوتے ہیں برعکس ارادے شب کے
روز تدبیر مری لڑتی ہے تقدیر کے ساتھ

نہیں ہے باقی کوئی تمنا ہمیں بہر طور یاس اب ہے
نہ اپنے جینے کا ہے بھروسا نہ ان سے ملنے کی آس اب ہے
خفا ہوئے ہو خدا سے اس پہ کہ اس نے شکوہ کیا تمھارا
خدا کرے گا تمھارا شکوہ یہ بات دور از قیاس اب ہے

جویائے وصال یار ہیں ہم
رسوا و ذلیل و خوار ہیں ہم
دل کو نہ قرار ہے نہ ہے صبر
بے صبر ہیں بے قرار ہیں ہم

تذکرہ ہندی گویاں ص۱۶۹، ۱ ۔ عمدہ منتخبہ ص۴۸۷، ۴ گلشن بے خار ص۱۳۶
عیار الشعرا ص۔ ، طبقات الشعرا کریم الدین ص۳۲۰
مجموعہ نغز ص۳۴ ب ، طور کلیم ص۷۶

---

## مولوی وحید الدین خاں فرد

یہ عرف عام میں خدا بخش خاں کہلاتے تھے ۔ مصحفی نے ان کا صرف یہی نام لکھا ہے باپ کا نام محسن خاں تھا جن کا تعلق پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تھا ۔ مصحفی ان کا وطن غازی پور زمانیہ بتاتے ہیں اور صاحب روز روشن حوالیٔ عظیم آباد کا قرار دیتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ دربھنگا کے رہنے والے تھے ، حسب ضرورت عربی بھی جانتے تھے اور فارسی بھی ۔ اپنے وطن سے دور دراز سفر کی صعوبت اٹھا کر لکھنؤ آئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے ۔ آخر عمر میں کان پور میں مقیم ہوگئے تھے اور وہیں ۱۲۵۱ھ میں وفات پائی ۔ مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے تاریخ وفات لکھی ہے ۔ جو ان کے دیوان "ارمغانی" میں درج ہے ؎

آں کہ فرد است در سخن دانی — آں کہ او گوہر سخن می سفت
مرد و سالِ وفاتِ او نساخ — "عقل فضل و کمال مرد" بگفت

۱۲۵۱ھ

فرد بہت اچھے تاریخ گو تھے ۔ شاہ اجمل الہ آبادی کے سانحۂ ارتحال پر کہتے ہیں ؎

از جہاں چوں محمد اجمل شاہ — رفت سوئے جناں چو تیر از قوس
سال تاریخ رحلتش از فرد — گفت ہاتف "برفت در فردوس"

۱۲۳۶ھ

معتمد الدولہ آغا میر وزیر اودھ معزول ہونے کے بعد چند ماہ اپنے مکان میں نظر بند رہے۔ آخر ریذیڈنٹ کی مداخلت پر بیس لاکھ روپے نصیر الدین حیدر کو دے کر کان پور جانے کی اجازت پائی اور اکتوبر ۱۸۳۱ء میں انگریزی سواروں کی محافظت میں مع کل اثاث البیت کان پور میں داخل ہوئے۔ فردؔ نے اس واقعہ کی بھی تاریخ لکھی ہے۔

جناب معتمد الدولہ یعنی ضیغم جنگ
حشم سے جن کے ہے شرمندہ آج حشمتِ مہ
حسد سے چرخ جفا جو کے مثل یوسف وہ
فریب و مکر زمانہ میں پڑ گیا ناگہ
ولے تھا فضل الٰہی جو اس کے شاملِ حال
چلی نہ شبیر کے آگے خدیعت روبہ
چھٹا جو مخمصے سے وہ عزیز مصر جلال
کی دل میں فکر کے تاریخ مخلصی نے جگہ
سروش غیب سے آئی صدا کہ سالِ خلاص
محاق خدع سے نکلا وہ چاہ کنعان سے مہ

۱۲۴۲ھ

کان پور میں پانچ سال قیام کرنے کے بعد معتمد الدولہ نے دوشنبہ ۵ ذی الحجہ ۱۲۴۷ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۳۶ء کو وفات پائی۔ تو فردؔ نے اس واقعہ کی تاریخ بھی اس طرح لکھی

جب معتمد الدولہ پناہ عالم
دنیا سے گزر گیا وہ رشکِ حاتم
تاریخ کی فکر میں ارم کے در پہ
رضواں نے کہا "بسیا وزیر اعظم"

۱۲۴۷ھ

فردؔ صاحب دیوان شاعر تھے اور فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ کان پور اور اس کے قرب و جوار میں ان کے کافی اصلاح یافتہ شعرا گزرے ہیں جن میں امداد علی انعامؔ، نواب علی نفیسؔ، حکیم مومن سجاد مشتاقؔ وغیرہ مشہور ہیں جن کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔

کلام کا انتخاب بھی پڑھیے ۔

کبھی کعبہ کبھی بتخانہ ہے مسکن اپنا
دین و مذہب کہوں کیا؟ شیخ و برہمن اپنا

شاعری عیب نہیں فردِ ہنرمندوں کو
ہم عناں علمِ لدنی سے ہے یہ فن اپنا

بند انگیا کے نہ بندھوائے کبھی
عمر بھر بندہ تو نامحرم رہا

سطحِ سینہ پہ ترے اے بتِ نوخیز یہ کیا
ابھرا ابھرا نظر آتا ہے کچھ اٹھا اٹھا

دل ٹکڑے ٹکڑے یار کے رخسار نے کیا
اس گل نے جو کیا نہ کسی خار نے کیا

وہاں چھاتی ہے گدرائی، نہ ہو کیونکر یہاں کھٹکا
درخت بارور میں باندھتا ہے باغباں کھٹکا

کیوں عشق میں ہو نام نہ موسیٰ مرے دل کا
ہر داغ بنا ہے ید بیضا مرے دل کا

ہر دم رخِ روشن کا ہے اک بت کے تصور
ہم سنگ بنا طور سے پتلا مرے دل کا

گرہوں میں اسے باندھ کے لٹکا لیا آخر
زلفوں کے لگا ہاتھ جو سودا مرے دل کا

اے نوک مژہ تجھ سے خجل نشتر و سوزن
لیکن نہ نکالا کبھی کانٹا مرے دل کا

مہمانی، غم یار کی کل ہم نے جو کی فرد
لب چاٹے کباب اس نے جو کھایا مرے دل کا

ہندو او باش تو عالم میں ہزاروں ہیں ولے
فرد دفتر میں ترا نام مقدم دیکھا

دل جو کر لیتے ہیں نت سب کا مسخر ہاتھ میں
ہیں ہتھیلی کی لکیریں یا کہ منتر ہاتھ میں

مژدہ تجھ کو شہادت کا مبارک ہو دلا
آج قاتل آیا ہے مہندی لگا کر ہاتھ میں

فیض کیا وصف لب سرخ بتاں کا میں لکھوں
لعل ہو جاتے ہیں لیتا ہوں جو پتھر ہاتھ میں

عاشق مژگاں کو اپنے کیجیے گا قتل کیا
آج کل رکھنے بہت ہیں آپ خنجر ہاتھ میں

فرد اس ساقی سے ہے چشم عنایت ہم کو بھی
حشر میں دے گا جو سب کو جام کوثر ہاتھ میں

سودائی نہیں پہنے جو زنجیر گلے میں
ہے طوقِ غمِ زلف گرہ گیر گلے میں

نکلی ہے خطِ سبز کی تحریر گلے میں
تقریر ہے تحریر ہے تحریر گلے میں

کیا زلفِ مسلسل کی گرہ گیر ہیں آہیں
اک آہ سے کھنچ آئی جو زنجیر گلے میں

بے تاب ہوں میں تشنگی ذبح میں قاتل — ٹپکا دے تو آبِ دمِ شمشیر گلے میں

کس شب نہ پڑے آبلے یاں سوزِ دروں سے — کس صبح کو چھڑکی نہ طباشیر گلے میں

ہے ختم نزاکت کہ بہ رنگِ رگِ گلبرگ — تقریر نظر آتی ہے تحریر گلے میں

سب عاشق و معشوق اسیر آئے نظر فرد

یاں پاؤں میں بیڑی وہاں زنجیر گلے میں

---

کیا کیا نہ حظ اٹھائے ہیں غیروں نے یار سے — محروم اک ہمیں رہے بوس و کنار سے

پہنچاتی ایک دن وہ درِ یار تک اسے — الفت صبا کو ہوتی جو میرے غبار سے

سوز و گداز مجھ پہ جو گزرے ہیں زیرِ خاک — سب آ کے پوچھ لو مری شمعِ مزار سے

عشقِ بتاں میں میں بھی جو کچھ بت سا بن گیا — گردن کٹی نہ نیمچۂ آب دار سے

کیونکر نہ آئے حال گلوں کو چمن میں فرد

پیدا ہو صوتِ زمزمہ جب شاخسار سے

---

(فارسی)

سوائے قتلِ مسلماں دگر نہ می دانند — بدوستانِ خدا اند ایں بتاں دشمنی

قصیدہ در منقبت حضرت شاہ بدیع الدین شاہ مدار"

اے مدارِ ہمہ عالم تو چہ عالی نسبی — خلق آید بدرت از پئے حاجت طلبی

نام والائے تو معروف بدیع الدین است — وردِ اسمِ تو کنند جملہ جہاں خوش لقبی

فیضِ خاکِ درت اے شاہ چہ گویم کہ ازاں — دلِ ہر کس شدہ چوں شیشۂ صاف حلبی

رتبۂ اعلیٰ نبود ارچہ ترا در عالم — سیدِ پاک نسب آلِ رسولِ عربی

آں ریاضت کہ تو کردی نہ نمود است کسے — گشت از جنس فزوں ثمرہ ایں بوالعجبی

چشمۂ فیض و عطائے تو بود بے پایاں — میتوانی کہ نشانی زجہاں تشنہ لبی

پایۂ فقر بدیں گونہ کہ را شد حاصل — خلعتِ خاص تو پوشیدہ ازو

ارض زیر قدمت ہست چو خرما مشہور ہمہ اثمار مکن پر بہ شیریں رطبی
ہست آثار جلال تو عیاں بہ ہر فرد
سوزد از آتش قہرت کہ کند بے ادبی

---

مفتاح التواریخ ص ، تاریخ اودھ چہارم ص۲۵۷، روز روشن ص۱۸
تذکرہ ریاض الفصحا ص ، رسالہ معارف ، دسمبر ۱۹۳۱ع ص۴۲۹

---

## مرزا مغل بیگ فریاد

مرزا علی نقی بیگ کے بیٹے اور آغا رضی کے پوتے تھے۔ بزرگوں کا وطن کرمان تھا جہاں سے یہ خاندان دہلی آیا اور دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا۔ فریاد کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں نشو و نما پائی۔ تعلیم کہاں تک حاصل کی یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کا علم کچھ کم نہ تھا۔ اور ضروریات شعری سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ اول اول مرثیہ و سلام لکھنے کا شوق ہوا اور اس میں میر پناہ علی افسردہ سے اصلاح لی۔ ۱۲۳۴ھ کے قریب مصحفی کے رغبت دلانے سے غزل گوئی کی جانب مائل ہوئے اور انھیں سے اصلاح بھی لی۔ مصحفی اپنے اس شاگرد کی رسائی ذہن کے قائل تھے اسی بنا پر لکھ گئے ہیں کہ "اگر زمانے نے فرصت دی تو اپنا مقام حاصل کرلے گا"۔

فریاد مدت تک الہ آباد کے محکمۂ رجسٹری میں سررشتہ دار رہنے کے بعد اپنے وطن لکھنؤ آگئے تھے لیکن اس کے بعد بھی الہ آباد کا آنا جانا بند نہ ہوا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ اول یہ کہ ان کے ماموں مرزا بندہ علی بیگ یہاں منشی عدالت تھے دوسرے یہ کہ خود ان کا سلسلۂ ملازمت وہاں ہونے کی وجہ سے اکثر حضرات سے دوستانہ

تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

کلب حسین خان نادر کا بیان ہے کہ فریاد نے اپنی کچھ غزلیں ناسخ کو بھی دکھائی تھیں یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب ناسخ لکھنؤ سے خارج البلد ہونے کے بعد الہ آباد میں مقیم تھے۔ نادر نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے اور صاحب دیوان شاعر لکھا ہے۔ ۱۲۶۱ھ سے قبل وفات پائی۔ دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے ایک میں تمام غزلیں صرف (۳۱) اشعار کی ہیں۔ کلام کا انداز یہ ہے ؎

دل بھی مرے احوال کا پرساں نہیں ہوتا — افسوس کہ کوئی مرا خواہاں نہیں ہوتا
رسوائیاں کیا کیا ہوئیں گھر جانے سے اس کے — اس پر بھی تو اے دل تو پشیماں نہیں ہوتا

---

نہ جیتے جی تو غم عشق سے فراغ ملا — گر ایک داغ ہوا بہ تو اور داغ ملا
وہاں بھی مشتعل اک شعلۂ جدائی تھا — لحد میں بھی نہ ہمیں رنج سے فراغ ملا
جو شمع بزم حریفاں ہوا زمانے میں — اسی کو سب نے جلایا اسی کو داغ ملا
کہیں گے حال دل غمزدہ ہم اے فریاد — کبھی جو اس ستم ایجاد کا دماغ ملا

---

خال اس روئے کتابی پہ نمایاں دیکھا — بچۂ زاغ سیہ حافظ قرآں دیکھا

---

دن رات آتش غم بھڑکے ہے تن کے اندر — شعلے سے بھر گئے ہیں کچھ میرے بدن کے اندر
کس کے بدن کی نکہت لائی صبا چمن میں — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر
کیا احتیاج ہم کو شمع مزار کی ہے — داغ جگر ہے اپنا روشن بدن کے اندر

---

جب نہ تب پڑتے ہیں پائے رہرواں بالائے سر — کارواں کے ہیں روانہ کارواں بالائے سر
ماہتاب حسن ہے یا چہرۂ پُر نور ہے — موتیوں کی مانگ ہے یا کہکشاں بالائے سر
اس وفور گریہ میں حاصل ہو گیا دیدارِ یار — کب نظر آئے جو پانی ہو رواں بالائے سر
یہ نہ سمجھے کوئی، میں نے سر پہ رکھے ہیں بال — آتش فرقت ہے سینے میں دھواں بالائے سر
نجد سے یوں ناقۂ لیلیٰ کو دوڑاتا نہ جا — خون مجنوں کا نہ لے او سارباں بالائے سر

گو تعلّی ہے عدو میں پہ سخن سنجی کہاں　　بے سخن ہے شمع کی جیسے زباں بالائے سر

ایک سے ہے ایک اعلیٰ قدرتِ اللہ ہے
دیکھ فریاد آسماں کے آسماں بالائے سر

---

کس طرح لوں میں زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں　　ڈرتا ہوں، پڑ نہ جائے یہ زنجیر ہاتھ میں
یہاں مچھلیوں کو مثلِ سمندر نہیں گزند　　یہ آتشِ حنا کی ہے تاثیر ہاتھ میں
سودائے مار زلف طبیبو یہ سر میں ہے　　سم ہو کبھی جو لوں عرقِ شیر ہاتھ میں
وہ بدنصیب ہوں میں گلستانِ دہر میں　　مانگوں جو گل تو خار دے تقدیر ہاتھ میں
منکر نکیر کو یہ دکھاؤں گا بعد مرگ　　رکھتا ہوں اس لیے تری تصویر ہاتھ میں
سر پیشِ طاقِ ابروِ جاناں، جھکا دیا　　طاقت نہ پائی جب دمِ تکبیر ہاتھ میں
فریاد جس طرح کفِ پا میں ہے یار کے　　موسیٰ کے اس طرح نہیں تنویر ہاتھ میں[1]

---

• آئینہ کیا لے بھلا وہ ماہ طلعت ہاتھ میں　　دیکھتا ہے آئینہ ساں اپنی صورت ہاتھ میں
ساقیا میں کیا کروں تیری مئے گلرنگ کو　　بادۂ عرفاں سے ہے یاں جامِ وحدت ہاتھ میں

---

پھینکے ہے سدا سنگِ ستم چرخِ ستمگر　　فریاد کہیں شیشۂ دل چور نہ ہو جائے

---

دل یہ بھرا کہ جوش میں آنسو ٹپک گئے　　ساغر ہماری چشم کے آخر چھلک گئے
جانا تھا سوئے کعبہ، گئے دیر کی طرف　　مستِ مئے جنوں تھے ہم، آخر بہک گئے
تاثیر اس کے دل میں نہ کی، غم یہی رہا　　گو نالہ ہائے نیم شبی تا فلک گئے
فریاد کیا کریں نہ رہا ایک بھی رفیق　　اور اپنے پاؤں پہلی ہی منزل میں تھک گئے

---

• ریاض الفصحا ص ۲۴۰، خوش معرکہ اول ص ۲۶۲، شوکت نادر قلمی، گلشن بیخار ص ۱۴۹
سرا پا سخن ص ۱۹۷، سخن شعرا ص ۳۶۷، دیوان غریب ص ۳۵۴۔

[1] فریاد جس طرح کے کفِ پا میں یار کے　　موسیٰ کی اس طرح نہیں تنویر ہاتھ میں　　(دیوان غریب ص ۲۵۵)

## میر بندہ علی فصاحت لکھنوی

فصاحت کے بزرگ اسلام آباد کے رہنے والے تھے مگر فصاحت نے اپنے والد میر علی کی نگرانی میں لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ عنفوان شباب میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور مصحفی کے تلامذہ میں داخل ہو گئے تھے۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر صرف ۱۷ سال بتائی ہے اور لکھا ہے کہ "طبع موزوں رکھتا ہے، واللہ ایک دن اپنا مقام حاصل کر لے گا"۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

اگلی سی نہ وحشت ہے نہ اب شورِ جنوں ہے — کیا بھول گیا ہاتھ مرا جامہ دری کو

آپ کو حالِ پریشاں سے مرے کیا کام ہے — آپ بیٹھے چین سے زلفیں بنایا کیجیے

تب ہمیں صیاد نے چھوڑا قفس سے یا نصیب — جب چمن سے پھول گلچیں بھر بھرا کر لے گئے

---

ریاض الفصحا ص ۲۵۴

---

## نواب جعفر حسن خاں فیض عظیم آبادی

خلف نواب محمد علی خاں ابن خادم حسین خاں خادم ابن حاجی احمد علی صاحب ابن شیخ اسد اللہ، نواب محمد حسن خاں ارشکی کے برادر زادہ اور نواب عبداللہ خاں نازی پوری کے خاندان سے تھے جن کا ذکر تاریخ بہار میں نواب فخر الدولہ روشن الدولہ کی صوبیداری کے سلسلے میں آتا ہے۔ پٹنے کے محلہ سنگی دالان میں ان کا بہت بڑا دولت خانہ تھا فیض اپنے وقت میں شہر کے رکن رکین، دولت مند، عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل،

تہذیب و آداب میں یگانۂ روزگار اور اکثر فنون کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ خط نستعلیق و شفیعا میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ امیر سے غریب تک سب ان کے حسنِ اخلاق کے قائل تھے۔ شروع شباب سے پچھتر برس کی عمر تک ایک ہی ترتیب اور ایک ہی وضع قطع سے زندگی بسر کی۔ آمدنی کو اس سلیقے سے خرچ کرتے تھے کہ اُن کے خوان کرم سے سیکڑوں غریب دوستوں آشناؤں کی دست گیری ہوتی تھی۔ تمول کے باوجود کسی طالب علم کو درس دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ علم طب میں اچھا خاصہ دخل حاصل تھا اور تصویر کشی و شناوری بھی خوب جانتے تھے۔ عہد شباب ہی میں لکھنؤ جا کر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور مشق سخن کو اس درجہ تک پہنچایا کہ مسلّم الثبوت قرار پائے[۱] برسوں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کر کے خراج تحسین و آفرین حاصل کیا۔ زبان بہت شُستہ و رفتہ تھی۔ غزلوں میں خاص قسم کا مذاق تھا جس سے جوان و پیر یکساں محظوظ ہوتے تھے۔ پڑھنے کے انداز میں دل کشی و دل آویزی تھی عظیم آباد کے شعرا میں ان کے استاد بھائی مرزا امان علی ذبیح کے علاوہ شاہ الفت حسین فریاد۔ حکیم ابوالحسن محزون۔ خواجہ محمد کاظم خاں شفا اور ناظر وزیر علی عبرتی وغیرہم ان کے ہم مشاعرہ اور ہم صحبت تھے۔

مولوی محفوظ الرحمٰن ان کا ایک واقعہ لکھتے ہیں :۔

"پٹنہ محلہ دیوان میں بڑے بابو مہاجن کے یہاں مشاعرہ تھا وہاں مہدی بخش تسلیم نے خلاف طرح ایک مطلع پڑھا ؎

یہ داغ سینہ اور یہ چشم گریاں دیکھتے جاؤ
چمن کی سیر کر لو اور باراں دیکھتے جاؤ

گریاں اور باراں دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں دونوں میں الف و نون

---

[۱] حیات فریاد

فاعلی ہیں اگر ان کو نکال دیا جائے تو لفظ مستقل گریہ و بار رہ جاتے ہیں اور چوں کہ ان لفظوں میں قافیہ ہونے کی صلاحیت نہیں اس لیے داخل ایطا ہے۔ فیض مرحوم نے سننے کے ساتھ کاہش[1] سے آہستہ سے کہا کہ مطلع میں ایطا ہے۔ کاہش نے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی اور پھر ایک مرتبہ سن کر صاف اعتراض کر دیا۔"

اس واقعہ سے فیض کی عروض دانی اور احتیاط فن شاعری کا پتا چلتا ہے۔

فیض پہلی مرتبہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں یعنی ۱۲۲۹ھ میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ جا چکے تھے اور مصحفی کی شاگردی اختیار کر چکے تھے۔ ۱۲۵۶ھ میں دوبارہ لکھنؤ گئے اب کی مرتبہ زیادہ قیام کر کے مجتہد العصر جناب سید حسین کی خدمت میں بعض علوم کی تحصیل کی اور چونکہ مصحفی ۱۵-۱۶ سال پہلے رہگرائے عالم باقی ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے نواب عاشور علی خاں سے کچھ دن مشورہ کیا۔ ۱۲۵۸ھ میں فیض حج بیت اللہ کے ارادے سے نکلے نجات حسین خاں مصنف تذکرۃ الاکابر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ابھی جہاز میں سوار ہوئے تھے کہ ایک رفیق کی وفات کی خبر ملی۔ ناچار فسخ عزیمت کر کے واپس آ گئے۔

نواب مہدی علی خاں مہدی ان کے صاحب زادے بھی اپنے والد کی سچی نشانی اور کامیاب شاعر تھے اور ان کو شیخ غلام علی راسخ سے تلمذ تھا۔ فیض نے ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔ حاصل شدہ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

آسماں پہ اشک کو لے جائے گی تحریک آہ | یہ ہوا اُٹھتے ہی دریا موجزن ہو جائے گا
فیض اب اُس کو ندامت ہے نمک پاشی سے | میرے زخموں نے عبث اس پہ شکر خند کیا
رات ایک پری سامنے آ لے گئی جی کو | جلوہ کہیں چہرے کا دکھا لے گئی جی کو
کیا رات ترے کوچہ گیسو میں بسی تھی | آتے ہی سحر باد صبا لے گئی جی کو

[1] مضمون نگار نے کاہش کا نام غلطی سے عبدالرحمٰن لکھ دیا ہے ان کا نام سید اولاد علی تھا۔ (ا-ص)

بے دیکھے ہی باتوں میں ہوا میں ہمہ تن گوش
پردے ہی سے بس اُس کی صدا لے گئی جی کو

اب ہاتھ کسی رنگ سے آتا ہی نہیں ہے
مہندی بھری کس کی کفِ پا لے گئی جی کو

دل شہر میں لگتا نہیں کیا جانیے ہوا کیا
پھر ان دنوں صحرا کی فضا لے گئی جی کو

ہے سیلِ سرشک اور دمِ سرد پہ عالم
بے ساختہ دریا کی ہوا لے گئی جی کو

تھا نعشِ تمنا پہ وہ گریاں کئی دن سے
سمجھا کے بہت پاس اٹھا لے گئی جی کو

ہم دیکھتے ہیں فیض تمھیں دو دو پہر گم
سچ ہم سے کہو کس کی ادا لے گئی جی کو

---

رشتۂ تسبیح اپنا ہو گیا تارِ نفس
ذکر موقوف ترا گر یہ دم بھر ٹوٹ جائے

کیسی پابندی ہیں زنداں کی اور زنجیر کی
وہ جنوں کا زور ہے سدِ سکندر ٹوٹ جائے

---

مے پینے کی تہمت تو دے سکتا نہیں لیکن
آنکھوں میں گلابی سا ڈورا نظر آتا ہے

---

کیا غرض شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے
جس کا دیوانہ ہوں راضی وہ پری زاد رہے

دم بدم رنگ بدلتا ہے مرا فرقت میں
کاغذ و خامہ لیے ہاتھ میں بہزاد رہے

دل لگا لیں گے کہیں تم نہ سہی اور سہی
کشورِ حسن سلامت رہے آباد رہے

اس شہِ حسن نے جو مجھ سے گدا کو پوچھا
وہ سلامت رہے آباد رہے شاد رہے

کیجیے دیوانہ وہ کیونکر نہ ہو انساں اے فیض
روبرو آٹھ پہر جس کے پری زاد رہے

---

تذکرۃ الاکابر قلمی حیات فرہاد ص ۷، نوائے وطن ص ۱۰۳،
نوائے ادب جنوری ۱۹۶۰ء ص ۱۰، خمخانۂ جاوید پنجم ص ۲۹۹،
جلوۂ خضر جلد اول ص ۴۰: دیوان غریب ص ۳۵۱

# مرزا امیر علی بیگ قاصر دہلوی

مرزا رستم بیگ کے لڑکے تھے۔ بزرگوں کا وطن سمرقند تھا جہاں سے ان کے دادا فرخ سیر کے زمانے میں دہلی وارد ہوئے اور منصب لائقہ کے ساتھ اور رعل خاں کا خطاب پایا قاصر کی پیدائش دہلی میں ۱۱۹۵ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ جوان ہونے کے بعد فوج میں ملازم ہو گئے تھے اس لیے تعلیم زیادہ حاصل نہ کر سکے۔ بڑے خوش اختلاط ہوشیار روشن طبع نیک معاش یار باش اور ریختہ کار تھے۔ شاعری کا شوق ابتدائے شباب ہی سے شروع ہو گیا تھا دہلی میں رہتے ہوئے حکیم ثناء اللہ خاں فراق سے اصلاح لیتے رہے کچھ دن بعد ملازمت سے طبیعت متنفر ہو گئی تو تجارت کرنے لگے اور دہلی سے اضلاع مشرق کی طرف سفر کیا۔ سردھنہ ہوتے ہوئے جہاں اُن کی ہمشیرہ نواب ظفر یاب خاں ابن بیگم سمرو سے منسوب تھیں لکھنؤ پہنچے۔ یہاں جو کچھ کہا۔ اس میں غلام ہمدانی مصحفی سے اصلاح لی۔ ۱۲۱۵ھ میں پٹنہ اور مرشد آباد کی سیر کرتے ہوئے کلکتے چلے گئے اسی سفر میں وجیہ الدین عشقی سے ملاقات ہوئی جو شعرائے اُردو کا تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ قاصر نے اس تذکرے کے لیے اپنے کلام کا انتخاب دیا۔ کلکتے کا قیام ان کے مزاج کے مطابق ثابت نہ ہوا اور اپنے وطن واپس چلے آئے۔

شاعری کے فن میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ہر نو مشق جب کچھ کہنے لگتا ہے تو خود کو فارغ التحصیل اور مسلم الثبوت استاد سمجھنے لگتا ہے اور استاد محسن کی فیض بخشی کے انحراف کو اپنے کمال فن کی دلیل سمجھتا ہے۔ یہی صورت قاصر کی بھی ہے۔ لکھنؤ میں مدتوں اصلاح لینے کے بعد جب دہلی پلٹے، تو وہاں مصحفی کی شاگردی سے انکار کرتے رہے۔ قاسم کہتے ہیں :-

"از چندے بہ بلاد شرقیہ اقامت گزیدہ بوطن مالوف معاودت نمود و

بحسب اظہار مردم شعرش را بمیاں غلام ہمدانی مصحفی اصلاح فرمود. اگرچہ وے ابائے کلی ایں معنی بیاں می آرد وخیال خودسری درسر دارد"

قاصر کا کلام اچھا ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دل سیر مسیحا سے ہے بیمار تمھارا
وارستۂ عالم ہے گرفتار تمھارا

---

بیاں کس سے کروں اے ہمنشیں اس جان پر غم کا
کہ سننے سے پراگندہ ہو جس کے ہوش عالم کا

---

بہزاد سے جب اس کی ابرو کا نون اترا
تب چشم ماہِ نو میں حسرت سے خون اترا

---

ان دنوں جوش پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا
اے صبا کہیو ٹھکانا کرے طوفاں اپنا

---

یوں نہاں ہیں مرے ہر داغ جگر میں سوراخ
زیرِ گل جیسے کہ ہوتے ہیں سپر میں سوراخ

---

غزل ایسے کے آگے عرض کرنا لطف ہے قاصرؔ
جو مغز شعر سمجھے اور اندازِ سخن جانے

---

یاد کس نکہرو کی اس دل کو نہ اکت آگئی
آہ کر سکتا نہیں ایسی نقاہت آ گئی

---

دمِ عاشق نکلتا ہے یہاں اک دم کی فرصت پر
کرو ہو وعدۂ دیدار تم روزِ قیامت پر

---

جنوں کے جنگل میں خاک وحشت تمام دن آہ ہم نے چھانی
ولے نہ مشتِ غبارِ مجنوں کی پائی آخر کہیں نشانی

---

کھل گیا کس غرقۂ الفت کا مدفن آب پر
نخل فوارہ ہوا جو سایہ افگن آب پر

تا نہاں چشم صدف نظارۂ عالم کرے
کیا ہوا نے موج کی چھوڑی ہے چلمن آب پر

---

دل میں اس بت کے مرے نالے اثر کیونکر کریں
یہ بہ رنگ شعلہ اس پتھر میں گھر کیونکر کریں

طالبِ دیدار کو سیری گلِ تر سے نہ ہو
وقف کام تشنگاں، آب گہر کیونکر کریں

---

تو حشر میں ہو دست و گریباں تو دل اپنا
اس شرط پہ آمادۂ تقصیر کروں میں

ہے جی میں کہ جس میں ہو رقم حسن کی قیمت
اوس فرد کو سردفتر تقدیر کروں میں

پھر صاحبِ زنداں کو وہ قاتل مجھے سونپے
خواہش کی نظر گر سوئے شمشیر کروں میں

کس رنگ سے گلشن میں کروں گل پہ نظر میں
اب غنچہ صفت باندھ چکا رختِ سفر میں

کہنا بجا ہے خار کو مانوس آبلہ | ہوتا ہے ہر قدم پہ یہ پابوس آبلہ
برگشتگی بخت نے نوبت مری یہ کی | معکوس پا بہ خلق ہوا کوس آبلہ

---

میں وہ میکش ہوں مغاں چاہیے چالیس قدم | ساتھ لاشے کے مرے خانۂ خمار چلے
ظلمت زلف بتاں میں نہ گزر پیک نگاہ | اُس مسافر کو خطر ہے جو شب تار چلے

---

کیوں نہ وہ آہ شرر افشاں اثر پیدا کرے | صورت گلریز جو ہر دم شرر پیدا کرے

---

وہ ہوشربا جس دم وا کردہ نقاب آوے | موسیٰ کا تو کیا منہ ہے یوسف کو نہ تاب آوے

---

خدا جانے تمھیں کیا ننگ ہے اب یہاں کے آنے سے
وگرنہ مجھ تک آ سکتے ہو پیارے ہر بہانے سے

---

اپنے داغ دل سے خورشید قیامت زرد ہے | روبرو میری فغاں کے شور محشر سرد ہے

---

تذکرہ عشقی ص ۱۵۸، مجموعہ نغز ص ۹۰، عمدہ منتخبہ ص ۵۲۴، ریاض الفصحا ص ۲۵۶
تذکرہ بے جگر قلمی ص ، گلشن بے خار ص ۱۵۷، گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۵۷
خوش معرکہ زیبا اول ص ۹۹، قصہ عجیب ص ۸۰، طبقات سخن قلمی
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۱۲۔

---

## مولوی فصیح اللہ فاعل الہ آبادی

مولوی امیر اللہ شاغل کے حقیقی بھائی اور کڑہ مانک پور کے رؤسا میں تھے۔ استعداد علمی معقول تھی، کچھ مدت لکھنؤ میں قیام کر کے وہاں کے علما سے تحصیل علم کر کے فکر سخن کی ابتدا کی تھی اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے اصلاح لی تھی۔ شعر کہنے کا

اتفاق کبھی کبھی ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ کہتے تھے سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔

ان کے تین لڑکے تھے (۱) مولوی مظہر حسن یہ وکیل تھے اور ترقی کرکے سب ججی کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ نواب گنج میں قیام تھا۔ خوش اخلاق، کنبہ پرور اور مسکین نواز تھے ۱۳۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ علیم الہ آبادی نے قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے

وائے آں مظہر حسن سب جج — از رئیس کڑہ بجاہ و حشم

چوں بہ نواب گنج جاں بسپرد — تار برقی رسید، پر ز الم

در وطن نعش او چو آوردند — گشت مغموم ہر دل خرم

بہ شب شانزدہ ز ماہ صیام — دفن کردند بعد روز دوم

کرد چو پرسش ز سال او چو علیم — روح او گفت "داخل خلدم"

۱۳۰۹ھ

مولوی مظہر حسن کے تین لڑکے تھے (۱) شیخ محمد اظہر حسن بی اے علیگ۔ ریاست حیدر آباد دکن میں ہوم سکرٹری تھے۔ (۲) محمد موسیٰ الہ آباد میں وکالت کرتے تھے۔ یہ لاولد انتقال کر گئے۔ (۳) مولوی مسیح الدین جن کے لڑکے شیخ ضیاء الدین احمد نے علی گڑھ سے بی اے پاس کرنے کے بعد وکالت کی سند حاصل کی اور بارہ بنکی میں وکالت کرنے لگے۔ آخر میں سرکاری ملازم ہو کر سیشن ججی تک پہنچے۔ خان بہادر کا خطاب پایا اور اسی عہدے سے پنشن حاصل کی۔ یہ شاعر بھی تھے۔ ضیا تخلص کرتے تھے۔ ان کے یہ اشعار ہمیں عزیز القدر واصل عثمانی سے حاصل ہوئے ہیں ؎

طلب دل میں ہو گی تو دیدار ہو گا — سرِ طور ہو گا سرِ دار ہو گا

---

کبھی تم نے مرا کہنا نہ مانا — کہا جب کچھ نکالا اک بہانا

ستا لو جتنا جی چاہے ہمیں کیا — تمہیں کو نام رکھے گا زمانا

لحاظ حق خدمت کیجیے گا — ضیا ہے آپ کا خادم پرانا

قائل کے صرف دو شعر حاصل ہو سکے جنھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے ۵

عاشق پہ اپنے رحم تجھے اے صنم نہیں — وعدے کی شب ہے اور یہاں دم میں دم نہیں

خاک و اکسیر کی ہے قدر برابر مجھ کو — کر دیا فقر کی دولت نے تونگر مجھ کو

---

عمدۂ منتخبہ ۴۷۲، سخن شعرا ۵

---

## نواب شمس الدولہ قسمت لکھنوی

نواب بارگاہ قلی خاں[1] کی یادگار، عظیم المرتبت باپ کے ذی حیثیت بیٹے شجاعت و تہوری میں لاثانی اور سیادت خاندانی میں ضرب المثل تھے۔ باپ بیٹے دونوں کو مرزا جہاں دار شاہ کی سرکار میں تقرب حاصل تھا اور ۱۱۹۸ھ میں انہیں کی ہمراہی میں دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ مصحفی کو مرزائے موصوف کے دربار میں باریابی کا شرف انہیں کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ اجتماع عید کے موقع پر اس وقت کہ صغیر و کبیر جمع تھے اور مصحفی اپنا قصیدۂ تہنیت پیش کرنے سے معذور نظر آرہے تھے۔ انہیں شمس الدولہ قسمت نے عمائد و امرا کی صفوں میں سے نکل کر ان کے قصیدے کو شاہزادے کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ یہ ابتدائے شاعری میں مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اپنے اس اعتقاد کے زیر اثر جو انھیں مصحفی کی جناب میں حاصل تھا اُن کے شاگرد ہو گئے تھے۔ مرثیہ و سلام زیادہ لکھتے تھے اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ سرور کہتے ہیں

"اکثر اوقات موزوں نمودن سلام و مراثی سید الشہدا مصروف می ماند۔ بالفعل دریں زمانہ مثل او در مرثیہ گوئی کسے دیگر نیست۔

---

[1] سرور نے یادگار قلی خاں نام لکھا ہے اور اسی کی تقلید شیفتہ نے کی ہے۔

قدرت اللہ قاسمؔ لکھتے ہیں :-

"در مرثیہ و سلام گوئی، گوئے سبقت از اکثرے ربودہ"

مختلف تذکروں سے جو کلام دستیاب ہوا اس کا انتخاب یہ ہے :-

اے نالہ اُس کے دل میں اک دن اثر تو کر جا | اُس شوخ بے خبر کو بارے خبر تو کر جا
مژگاں تر ہیں تیرے ابر بہار قسمتؔ | دامان کوہ و صحرا اک بار تر تو کر جا

---

کہتے ہیں یوں چمن میں پھر آئی بہار گل | شکر خدا کیا تھا بہت انتظار گل

---

دیکھا ہیں جنسِ دل کے طلبگار تم نہیں | پھرتے ہو بوالہوس سے خریدار تم نہیں
کہتا ہے اُن کو دیکھ کے چپ پر جبیں رقیب | کیا ماجرا ہے مجھ سے تو بیزار تم نہیں
آنکھیں نکالتے ہو عبث مجھ غریب پر | کہتا ہے کون یہ کہ طرحدار تم نہیں

---

آتا نہیں شب کو خواب تجھ بن | بیداری ہے (اک) عذاب تجھ بن
اے ماہ سپہر خوبروئی | سرگشتہ ہے آفتاب تجھ بن
سینے سے نکل پڑے گا گویا | ہے دل کو یہ اضطراب تجھ بن
قسمتؔ کی بھی تجھ کو کچھ خبر ہے | دیکھا ہیں اُسے خراب تجھ بن

---

جو دل لے کر ہمارا دشمنِ جاں یار جانی ہے | تو اس سے مرنا ہی بہتر ہے پھر کیا زندگانی ہے
شبِ ہجراں ہے اور میں ہوں یہ اندھیرا، ور آنسو ہیں | اذیت ہے مصیبت ہے نہایت ناتوانی ہے
نہیں کوئی زیست کی صورت بقولِ مصحفیؔ قسمتؔ | نہ قاصد ہے نہ نامہ ہے نہ پیغام زبانی ہے

---

گر وہ بُت کافر شب مہ بام پہ آوے | اک ماہ دوئم ماہ فلک کو نظر آوے
مژگاں ترے، دل میں مرے ہیرے کی کنی ہیں | ناسفتہ نہ دیکھا کوئی لختِ جگر آوے
مقدور ہے کس کا جو ترے حکم کو ٹالے | رستم جو بڑا ہووے تو وہیں اُس کا سر آوے
تو بر سرِ بازار جہاں جلوہ نما ہو | خورشید فلک بیچنے اپنی سپہر آوے
جوں ماہِ منور ہو شبِ تار ہماری | قسمتؔ وہ اگر چاند سی صورت نظر آوے

الٰہی یا تو میرے دامنِ دلدار ہاتھ آوے / نہیں تو ہاتھ کے اُس کی جو ہے تلوار ہاتھ آوے
اِدھر میں کھڑا ہوں کھینچ لینے کی تمنا پر / اُدھر ہے کاشکہ تیرا ہی نا دیوار ہاتھ آوے
اگر تسبیح ہاتھ آتی نہیں ہے تیرے اے قسمت / تو دانے توڑ ڈال اُس کے کہ پھر زنّار ہاتھ آوے

---

اُمیدوارِ بوسۂ لب ہے کھڑا کوئی / دیتا ہے تجھ کو دیر سے پیارے دعا کوئی
قاصد اگر گزر ہو ترا کوئے یار میں / کہیو کہ آرزو میں تری مر گیا کوئی

---

پھر مجکو کیا جو غیر کے تم جا کے گھر رہے / میرے تو ساتھ وعدۂ شام و سحر رہے

---

آتی نہیں کسی کی جواب تک صدائے پا / درماندگان قافلہ یارب کہاں رہے

---

گلشن بیخار صفحہ ۱۹۰، تذکرہ ہندی صفحہ ۱۸۰، عمدہ منتخب صفحہ ۵۲،
مجموعۂ نغز صفحہ ۱۳۱، طور کلیم صفحہ ۸۰، طبقات الشعرا کریم الدین صفحہ ۳۲۶

---

## شیخ جمال الدین کامل

ولدیت کا حال معلوم نہیں ہوا۔ آنولہ ضلع بریلی کے باشندے تھے تحصیل علم کے لیے لکھنؤ گئے۔ موزونیٔ طبع نے شاعری پر اُکسایا اور مصحفی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ آدمی ذہین اور عقل مند تھے بہت جلد ترقی کرلی[1] اور معاصرین میں ممتاز ہوئے یہ اسیر و ذاکر و کاہش وغیرہ کی طرح مصحفی کے ان شاگردوں میں شامل ہیں جنھوں نے اختتام تصنیف ریاض الفصحا ۱۲۳۶ھ کے بعد اُن سے تلمذ حاصل کیا۔ شیخ عبدالرؤف شعور اور مرزا علی نظر وغیرہ تلامذہ مصحفی کے ہم عصر

---

[1] طبقات الشعرا میں یہیں درج ہے۔

وہم مشق تھے۔ ان کے کلام میں اگرچہ بلند پروازی اور رفعت خیالی اتنی نہیں ہے لیکن سلاست و روانی سے خالی نہیں ہے

تجھ سے وحشی صنم کو رام کیا — جذبۂ دل نے کیا ہی کام کیا
مژدہ اے چشم انتظار نصیب — جلوۂ حسن اُس نے عام کیا
دل دیا تجھ سے بے مروّت کو — ہم نے یہ کیا خیالِ خام کیا
اُس نے منہ کو چھپا کے زلفوں سے — روز روشن ہمارا شام کیا
کوچ کرتے ہی آپ کے ہم نے — منزلِ گور میں قیام کیا
کیا ہی کامل کے کشورِ دل میں — اے شہِ حسن انتظام کیا

---

عاشقِ زار ہوں اک گُل کے رُخِ رنگیں کا — زردیٔ رنگ سے ظاہر ہے چھپانا کیسا
شمعِ محفل کو اگر غم نہیں پروانے کا — شام سے تا بہ سحر اشک بہانا کیسا

---

طائرِ دل کو جو رہتا ہے خیالِ کاکل — کیا ہوئی پھر ہوس دانۂ خالِ کاکل
فصلِ سودے کی پھر آئی ہے خدا خیر کرے — دیکھیے پڑتا ہے کس کس پہ وبالِ کاکل
دل سودا زدہ کی ہے یہ دعا اے کامل — وصلِ جاناں ہو تو حاصل ہو وصالِ کاکل

---

فوجِ غم و الم میں پھنسا شہریارِ دل — ہو کون بے کسی کے سوا غمگسارِ دل
آغاز میں عیاں ہے یہ انجام کارِ دل — دو چار دن ہے زندگی مستعارِ دل
اُس شمع رو صنم نے جو کی سرد مہریاں — کافور ہو گیا ہے شکیب و قرارِ دل
بحرِ جہاں میں ہے یہی کامل کی آرزو — ہو زیبِ گوشِ یار، دُرِ شاہوارِ دل

---

اس گھڑی حاصل ہمیں سیرِ شبِ مہتاب ہو — ماہ رو ہو اور حسین آباد کا تالاب ہو
بندگی کیونکر نہ ہو قاتل کے کشتوں کی قبول — بہرِ سجدہ خنجرِ قاتل کی جیب محراب ہو
ہم سے جانبازوں کے خوں سے اس کو بھر جائے اگر — تیغ میں قاتل کی پیدا جوہرِ نایاب ہو
زلف کی کس غیرتِ یوسف کی رہتا ہے خیال — دیکھتے ہر شب جو کامل تم پریشاں خواب ہو

سراپا سخن ص ۴۶، ۴۷، سخن شعراء ص ۳۹۵، خوش معرکہ جلد اول ص ۴۱۴

## مولوی حکیم سید اولاد علی کاہش جون پوری

خواجہ عبدالروف عشرت صاحب کا بیان ہے کہ مولوی سید عیوض علی کے لڑکے محلہ حمام دروازہ کے رہنے والے کاظمی نسب حنفی مذہب قادری مشرب امام موسیٰ رضا کی اولاد میں تھے۔ لیکن سید عطا حسین فانی کو ان کی سیادت سے انکار ہے وہ کہتے ہیں کہ:

"مولوی سید اولاد علی جون پوری متخلص بہ کاہش نسب خود منسوب بہ حضرت جنید میکردند۔ الا حضرت جنید را سید می گفتند۔ ایں غلط فہمی شان ہست نسب نامہ حضرت جنید ہمیں است، خواجہ جنید بغدادی ابن خواجہ زید ابن شیخ عمر ابن شیخ ابو بکر ابن خواجہ عبید ابن شیخ سعد ابن امیر المومنین حضرت عمرؓ ۔"

یہ جون پور کے ایک نامور بزرگ شاہ عنایت مخدوم کے نواسے تھے۔ ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ کمسنی ہی سے نہایت ذہین اور طباع تھے۔ چھ برس کی عمر میں مکتب نشین ہوئے اور دس برس کی عمر تک گلستاں، بوستاں اور میزان و منشعب کی درسیات مکمل کر لیں۔ انھیں دنوں میں ایک روز مجمع میں شبرات کی آتش بازی کا تماشا دیکھ رہے تھے جہاں محلے کے اور بچے بھی جمع تھے کسی لڑکے سے کچھ تکرار ہو گئی۔ یہ شکایت ان کی والدہ تک پہنچی تو والدہ نے موقع پا کر بیٹے کو غیرت دلانے کے واسطے کہا کہ "ہم تو سمجھتے تھے کہ تم جوان ہو کر باپ دادا کا نام روشن کرو گے اور مولوی اولاد علی کے نام سے مشہور ہو گے مگر آثار کچھ الٹے نظر آتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھارے سبب سے

خاندان کا خاندان بدنام نہ ہو جائے۔

ماں کے ان لفظوں نے بیٹے کے دل پہ تیر و نشتر کا کام کیا کسی بہانے گھر سے باہر نکلے اور اپنے کوکا بندو خاں کو ساتھ لے کر لکھنؤ کا رخ کیا آخر پیادہ پا سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے لکھنؤ پہنچے۔ بعض اہل خیر نے مدد کی۔ یہاں مرزا قتیل سے فارسی کی تکمیل کی اور عربی کے اسباق مولوی مرزا حسن علی ہاشمی محدث دہلوی سے نکالے۔ ان علوم کی تحصیل کے بعد تحصیل زبان اور شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے ہی اردو میں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ یہیں علمائے فرنگی محلی سے بھی استفادہ کیا اور طب میں حکیم مسیح الزماں کے شاگرد ہو کر کچھ دن اُن کے مطب میں بیٹھے۔ آخر گھر والوں کو ان کے لکھنؤ میں ہونے کا پتا چل گیا اور ایک قاصد بھیج کر وطن بلوا لیا گیا۔ اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں بہار چلے گئے۔ اور ضلع گیا میں اوّل عدالت دیوانی میں پیشکار رہے پھر سررشتہ دار ہو گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ترک ملازمت کر کے عزلت گزینی اختیار کی۔ گیا میں شادی بھی کر لی تھی۔ ان کے پانچ لڑکے تھے اور پانچوں شاعر، اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان لڑکوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) سید فدا علی کشش (۲) امیر حسن خواہش (۳) مولوی نور الحسن دانش (۴) سید مہدی حسن سازش (۵) نوازش جن کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ شاہ فدا حسن اور شاہ محمد تقی جون پوری ان کے نواسے اور حکیم محمد جنید جون پوری طب میں ان کے شاگرد ہیں۔

ان پانچوں کی اولاد بھی شاعر تھی اور سب کا ذکر تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں موجود ہے۔ کاہش کو طریقہ قادریہ رشیدیہ میں اپنے بزرگوں سے بیعت تھی گیا میں رہتے ہوئے شاہ سید قمر الدین حسین سے طریقہ منعمیہ ابوالعلائی میں فیض حاصل کیا۔

۱۲۸۱ھ میں جہانِ فانی کو خیرباد کہا اور موضع متھن پور ضلع فیض آباد میں مدفون ہوئے ان کے ایک شاگرد شیخ التفات حسین گوہر جون پوری نے یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے

کرد رحلت بگماں استادِ من سوئے ارم | داشت شہرت در فنِ حکمت بہر شہر و دیار
عالم کامل حکیم حاذق اولاد علی | شد ذکائی و شفائی در غم او دل فگار

۱۲۸۱ھ

از فلک فرمود عیسیٰ سالِ فوت دین پرست | بوعلی سینہ فگار از مرگ آں عالی وقار

۱۲۸۱ھ

مصرع اول زہر بیت سراپا حکمتم | عیسوی و فصلی دہمت می نماید آشکار (کذا)
گر سن ہجری بخواہی اے دلِ جوہر شناس | از حروف مصرع آخر ببیں آئینہ داری نماید

رسالہ صرف در قواعد فارسی۔ رسالہ مکتوبات در انشا۔ منتخب العروض۔ دو دیوان فارسی اور دو دیوان اردو یادگار چھوڑے۔

دیوان دوم فارسی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ انہیں کا تحریر کردہ ہے جس کے آخر میں یہ ترقیمہ ہے "تمام شد دیوان دوم فارسی از نتائج طبع ہیچمدان احقر العباد کمترین خلائق اعجز الناس المرجو الی اللہ المدعو سید اولاد علی الکاظمی و جون پوری بن سید محمد عوض مرحوم غفراللہ لہما وستر عیوبہما متخلص بہ کاہش در ۱۲۷۱ھ ماہ ربیع الاول سیوم مطابق سیوم جنوری ۱۸۵۴ء۔

کوئی دیوان دست یاب نہ ہو سکا جو کلام ملا حاضر کیا جاتا ہے ؎

غنی ہوتا ہے ہر محتاج تیری آشنائی کا | حباب بحر نے کاسہ لیا اُلٹا گدائی کا
قفس میں جو تڑپا چمن یاد آیا | مصیبت زدوں کو وطن یاد آیا
بیانِ حالِ دلِ زار ہو نہیں سکتا | یہ درد وہ ہے کہ اظہار ہو نہیں سکتا
رشک مقتل ہے ترا کوچہ بُت قاتل مگر | گبر تڑپے ہیں جدا کافر جدا ترسا جدا (کذا)

عاشقوں کو گر یہی نیرنگیاں دکھلائے گا  آخرش دزدِ حنا اک روز باندھا جائے گا

---

یوں حسرت دل کہتی ہے فرہاد سے رو رو  تیشہ جو لگا سر پہ تو پچھتائے گا آخر

---

بھر گئے زخمِ جگر سب جب سُنی تقریرِ زلف  مثلِ مرہم ہو گئی اللہ ری تاثیرِ زلف

دہری زنجیروں میں کس کس پیچ سے جکڑے ہیں دل  واہ ری تدبیر کاکل واہ ری تدبیرِ زلف

---

شیشے کی طرح یار کا ایسا ہے بدن صاف  سینے سے نظر آتی ہے چوٹی کی شکن صاف

---

تمنا باغ کی رکھتے نہ پروانے بیاباں ہم  چمن ہم خار ہم گلدستہ ہم گل ہم گلستاں ہم

---

ہڈیاں مجنوں کی مت کھا اسے ہما  آگ ہے اس استخوان زار میں

---

مِسّی ملی تو دیکھ کے سوسن نے آہ کی  نرگس شہید ہو گئی ترچھی نگاہ کی

---

عجب اک ہو کا عالم ہے عجب حسرت برستی ہے  نہ جانے کہ یہ گورِ غریباں کیسی بستی ہے

تردد کیوں تمہیں اے سالکانِ ملکِ ہستی ہے  عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے

عجائب رنگ دیکھا ہم نے دنیا کی دو رنگی کا  کہیں بستی میں صحرا ہے کہیں صحرا میں بستی ہے

عبث مغرور نازاں ہے تو اپنی شانِ رفعت پر  بلندی کا مآل کار جب دیکھا تو پستی ہے

مقرر تو ہوا ہے شیفتہ آہو نگاہوں کا

ترے چہرے سے کاوش صاف اک وحشت برستی ہے

---

ایک بے نقطہ مرثیہ کا بند ہے ـــ

ہر گاہ ہوا حملۂ اعدا سوے صحرا  گہ وار لگا رمح کا گہ تیر کو مارا

گر وار عدو کا ہوا رہوار کو روکا  ہر گھاؤ کھلا لالۂ کہسار سا سر کا

رو کر کہا اللہ مددگار مرا ہو

اس دم کہ دم سرد ہو اور سوکھا گلا ہو

---

(فارسی)

سینہ تا دل ہمہ پُر داغ تمنا کردی  اے فلک با تو چہ کردیم کہ با ما کردی

---

مرا ست کنج قفس خوشتر از چمن بے تو　　چراغ گور بہ از شمع انجمن بے تو

---

کیفیت العارفین ص ۴۵۳، کنز الانساب ص ۱۴۹ و ص ۱۵۲، سخن شعراء ص ۔

تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸۴ ۔ گلدستۂ نیض ۱۳۲۵ھ

---

# مرزا حیدر علی بیگ گرم

مرزا نیاز علی بیگ کے لڑکے اور دہلی کے باشندے تھے مگر دوسرے دہلوی ارباب کمال کی طرح یہ بھی ہجرت کر کے لکھنؤ آگئے تھے۔ مزاج میں صلاحیت اور طبیعت میں موزونیت تھی اس لیے عنفوان شباب ہی میں شعر گوئی کرنے لگے اور جو کچھ لکھا اُس میں مصحفی سے اصلاح لی۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کی عقیدت اور ذہانت و ذکاوت کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دوسرے شاگردوں کی بہ نسبت یہ میرے ساتھ زیادہ ارادت رکھتے ہیں۔ مصحفی کے ان الفاظ کا ثبوت اس وقت ملا جب مصحفی اور انشا کی چپقلش میں یہ اپنے استاد بھائی منتظر کی شرکت میں خم ٹھونک کر انشا کے مقابلے پہ آئے۔

واقعہ یہ ہے کہ انشا کو اگر حکومتِ وقت کے کارندوں کی امداد و اعانت حاصل نہ ہوتی تو ان شورہ پشتوں کے مقابلے میں جن کے ساتھ شہر کے دوسرے لوگ شامل تھے انشا کو منہ کی کھانی پڑتی۔ ان کی یہ غزل اسی وقت کی ہے۔ جس کے پانچ منتخب شعر نادر نے دیوان غریب میں لکھے ہیں ؎

شب شمع نے دیکھی تھی جو اس حور کی گردن　　دی آگ میں رکھ اپنی وہ کافوری گردن

جیوں جیوں کہ ہیں سر اپنا رکھا پاؤں پر اس کے | تنتی ہی گئی اس بت مغرور کی گردن
زانو پہ جھکائے ہوئے بیٹھا ہوں سر اپنا | دیکھی ہے جو اک شاہد مستور کی گردن
سب عضو ترے نور کے سانچے میں ڈھلے ہیں | نا فہم کے آگے ہے فقط نور کی گردن

اے گرم پڑھ اک ایسی غزل سننے کے جس کے
چھپ جائے گریباں میں مغرور کی گردن

مصحفی نے اپنے تذکرے میں پیش گوئی کی تھی کہ "بشرط مزاولت بجائے خواہد رسید" یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور گرم نے اپنی مشق و مزاولت کی بدولت خاصی شہرت حاصل کی۔

۱۲۱۱ھ اور ۱۲۱۷ھ کے درمیان یہ لکھنؤ سے کالپی کی طرف گئے اور وہاں سے دکن کی طرف چلے گئے۔ جہاں بقول مصحفی اچھی نام و نمود حاصل کی۔ اگر تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول میں شعرائے دکن کا کوئی تذکرہ مرتب ہوا ہوتا تو گرم کی کامیابیوں پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن ۱۱۹۴ھ اور ۱۲۸۹ھ کے درمیان کا کوئی ایسا تذکرہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ البتہ سرور نے حیدر آباد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "دریں ولا بہ بلدۂ خیر بنیاد حیدر آباد توطن گزیدہ"۔

عبدالعلیم خاں کے مطابق "بازارِ سخن بدم گرم اۂ گرم تر بود و در لشکر نواب میر خاں گزرا وقات می نمود"، لیکن اس فقرے سے نہ زمانے کی تفصیل معلوم ہوتی ہے نہ مقام اسی زمانے کی بات ہے۔ نواب میر خاں ابن شاہ نظام الدین دہلی کے ایک رئیس تھے جن کے یہاں شاہ بغدادی نے بھی کچھ مدت قیام کیا تھا یہ بات ۱۲۲۴ھ یا ۱۲۲۵ھ کی ہے۔ ممکن ہے کہ گرم ۱۲۱۷ھ کے بعد لکھنؤ سے نکل کر چند سال دہلی میں رہے ہوں اس کے بعد دکن گئے ہوں۔

گرم کے دیوان کا مخطوطہ جس میں صرف ۴۷ صفحات ہیں اور تقریباً ایک ہزار

اشعار ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ یہ خط نستعلیق نیم شکستہ میں لکھا گیا ہے اور سخاوت مرزا صاحب کے خیال میں گرم کے قلم کا معلوم ہوتا ہے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

کہتا ہوں میں ریختہ جو ایسا — یہ فیضِ سخن ہے مصحفی کا
منکر کوئی اس کو گو نہ مانے — چھ بایہ زباں ہے فارسی کا
ملحد مجھے کوئی گو کہے گرم — بندہ دل و جاں سے ہوں علی کا

یہی تمنا ہے گرم میری کہ خاک کی میں اگر ہوں ڈھیری
کسی طرح سے نجف میں پہنچے صبا کے ہاتھوں غبار اپنا

عالم ثروت میں بھی ہم گرم بے ساماں رہے — اور جو ساماں بھی کیا تو وہ فقیرانہ کیا
گرم ایسا کون ہے جو ہم کو آصف کی طرح — سیر دکھلانے کو (ہمراہ) سفر لے جائیگا

پھرتا تھا تو جس وقت کہ گلشن میں خراماں — کیا سرو بھی آگے ترے ناچار کھڑا تھا

ہر چند گنہگار ہے پر کشتے کا اپنے — لاشہ تو بھلا آن کر اُٹھوائیے صاحب
میں گرم گیا ملنے کو ان کے تو انہوں نے — فی الفور ظرافت سے کہا آئیے صاحب

شب رخصت ہے رہو تم مرے گھر آج کی رات — جاں بلب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات
آگے آنکھوں کے اندھیرا سا سرِ شام سے ہے — دیکھیے ہوتی ہے کس وقت سحر آج کی رات

بلبل کے سر سے جاتی ہے کوئی ہوائے گُل — ہوتی ہے وہ قفس میں بھی پھر پھر فدائے گُل
جس رُخ کے آگے مہرِ درخشاں بھی گرد ہو — عارض کو اُنگ سکے ہے کب اُس کے صفائے گُل
دو ہوئیں بھر رہے ہیں ترے ہاتھ سچ بتا — تربت پہ کس شہید کی تو نے چڑھائے گُل

گلدستہ لا دیا جو کل اس کو رقیب نے
اے گرم ہم نے رشک سے ہاتھوں پہ کھائے گُل

میں یاں تک اشک پونچھے آستیں سے — کہ ہے اک موجِ دریا ہر شکن میں

ناتوانی سے اُٹھا جب کہ نہ بارِ دامن — آستیں کرنے لگی ہاتھ میں کارِ دامن

نالوں کی گرمیوں سے پھٹتے دل و جگر ہیں — لب خشک ہو رہے ہیں کانٹے زبان پر ہیں

تیغِ نگاہ کس کی دیکھی ہے ہم نے یارب — جز زندگی سے اپنی بیزار اس قدر ہیں

یارانِ رفتگاں کا مت پوچھ ہم سے قصہ — اے ہمنشیں ابھی حیران ہوں، کدھر ہیں

سینے کے داغ سوزاں، آنکھوں کے اشکِ خونی — اس نخلِ عاشقی کے یہ گل ہیں یہ ثمر ہیں

کس شعلہ رو کے غم میں رویا ہے اس قدر تو — جو گرم اشک تیرے سوزندہ جوں شرر ہیں

سیلِ گریہ سے نہ ہم تا بکمر ڈوب گئے — اس قدر روئے کہ ہمسایوں کے گھر ڈوب گئے

مُرخ اُس کے جو بر میں پیرہن ہے — آتش کدہ ساری انجمن ہے

رنگیں نہ سمجھ تو نقشِ شیریں — نقاش! یہ خون کوہکن ہے

مرغِ قفسی ہوں میں قفس زاد — صیاد کا گھر مرا وطن ہے

انگلیٹ ہے وہ تری کہ گویا — سانچے میں ڈھلا ہوا بدن ہے

اشکوں کے سبب سے آستیں میں — موجوں کی طرح ہر اک شکن ہے

ہستی کا ثبات اپنی اے گرم
دیکھا تو نہ جائے دم زدن ہے

---

تذکرۂ ریختہ گویاں صـ۱۹۸ ۔ مجموعۃ الانتخاب قلمی
مجموعہ نغز صـ ۱۳۵/۲ ۔ عمدہ منتخبہ صـ ۲۰۰
تذکرۂ بے جگر قلمی صـ ۔ گلشن بے خار صـ ۱۸۶
گلشن ہمیشہ بہار صـ ۲۶۷ ۔ بزم سخن صـ ۱۰۰
ماہ نامہ اردو جولائی و اکتوبر ۱۹۵۵ء ۔ طبقات الشعرا کریم الدین صـ ۲۵۶
دیوان غریب صـ ۳۹۹ ۔ طلسم ہند صـ ۱۸۵

# گلاب رائے گلشن

راجا درگا پرشاد مہر سندیلوی مصنف تاریخ اودھ کے عم نامدار اور سندیلہ کے رئیس ذی وقار تھے۔ عربی و فارسی میں ید طولی رکھتے تھے۔ اور علم تاریخ و لغت نیز سخن سنجی و شعر فہمی میں ضرب المثل تھے۔ ریاست و جاگیرداری کے ہمہ وقتی مشاغل کے باوجود طبیعت شعر گوئی کی طرف راغب تھی اوّل مرزا محمد حسن قتیلؔ کے شاگرد رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ سے اصلاح لی۔ تیر اندازی کے علم میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ یہ صرف فارسی زبان میں فکر سخن کرتے تھے اور اس میں ایک ضخیم دیوان تصنیف کیا تھا جو ممکن ہے اُن کے اعقاب میں موجود ہو۔ دیوان کے علاوہ گلشنؔ نے ایک فارسی شعرا کا ضخیم تذکرہ بھی لکھا تھا۔ خدا جانے وہ اس وقت صفحۂ روزگار کی زینت ہے یا نہیں۔ نواب علی حسن خان کا بیان ہے کہ ریاست ملک اودھ میں مختلف اعلیٰ عہدوں پہ سرفراز رہے تھے۔ دیکھئے کس قدر برجستہ کلام ہے۔

نسیم صبح پیغام شگفتن داد گلہا را — دریں گلشن چو نرگس باز کن چشم تماشا را
نمی دانی کہ اینجا بیکسے سر در کفن دارد — چہ بیدردانہ بر خاک مزارم می بری پا را

با تیغ ناز و غمزہ سوار سمند شد — فریاد الاماں ز ملائک بلند شد
صد چاک سینہ دوختم اما ز اضطراب — آخر برون ز سینہ دل دردمند شد

عاشقاں اند کہ جز نالہ ز دل سر ندہند — پارہ سازند گریباں بہ رفو گر ندہند
خبر بر دیانِ جہاں را چہ کنم شرحِ ستم — صبر ہرگز نبود تا غم دیگر نہ دہند

آں کس کہ از زبانِ تو حرفِ جفا شنید — گویا پیام خضر ز آب بقا شنید

میل خاطر بسوئے او دارم — روز و شب آرزوئے او دارم
صبح و شام از پئے نظارۂ او — سیر گلہے بکوئے او دارم

رنجش آرد مزاجِ من ہر دم — عاشقم یک خوئے او دارم

غمے دارم کہ دلدارے ندارم — وگرنہ دارم وفادارے ندارم

دلِ من شیشۂ صاف است در عشق — بریں آئینہ زنگارے ندارم

برو بلبل! تو بر گل باش خورسند — کہ من پروائے گلزارے ندارم

عاشق کہ سوئے ملکِ عدم شد سفرِ او — آشفتہ نگر بود بیاد کمرِ او

دریں بہار نہ گل خوش نہ بوستاں بے تو — اگر خوش است ہمیں چشم خونفشاں بے تو

نہ سوئے لالہ ببینم نہ سوئے گل گاہے — کہ چشم من نگشاید براین و آں بے تو

با شمع بگفتیم کہ ہر شب بہ چساں — سازی تو ہمہ سوزِ دلِ خویش عیاں

گفتا کہ نسازیم بایں سوز چرا — بوئے ز دوا نیست در ارباب جہاں

گردشِ چشمش ز ہوشم داد بیکاری مرا — دورِ ساغر برد اے ہمدم ز ہشیاری مرا

زیرِ شمشیرِ جفائش سر نہادن طاعت است — میکند تاکید استادِ وفاداری مرا

در خمِ زلفش اسیرم از جہاں آزادہ ام
بہ ز آزادی است یا رب ایں گرفتاری مرا

---

قصیدہ در توصیف راجہ پرم دھن صاحب جدِّ امجد راجہ درگا پرشاد مہر

آمدم شاد بکوئے تو و نالاں رفتم — بچہ رنگ آمدہ بودم بچہ عنواں رفتم

جیب در جیب بچیدم ز تو خارِ حسرت — از پئے چیدنِ گلہائے گلستاں رفتم

آمدم پیش تو ناگاہ نمودی تشنہ لبم — از دمِ تیغ تو بر چشمۂ حیواں رفتم

وہ کہ امروز ز ایں تو سراپا مایوس — چوں سکندر ز لبِ چشمۂ حیواں رفتم

عوضِ لطف تو با من چو نبود ایثارے — دوش زیں واقعہ شرمندۂ احساں رفتم

دست برکش ز ستم ورنه صنم نام خدا
بر درِ رائے زماں عادل دوراں رفتم

چوں رسیدم بدرت از مددِ بختِ سعید
در حقیقت بدر کعبهٔ عرفاں رفتم

لذّت تلخیٔ دشنامِ تو نایافته ام
در ہوائے فہم روضهٔ رضواں رفتم

ہادیم عشق شده برد بسوئے تو مرا
للّٰه الحمد ز قطع ره چو للاں رفتم

راه نا کرده به بستان وصال تو خزاں
از گل داغ دل اپنا شسته داماں رفتم

عقده وا کرد ز زلف تو از آں دم که صبا
باد دوش در همه اطراف پریشاں رفتم

کرد پیغمبر عشق تو از آں دم که نزدل
در رهِ ملّت آشفته مرا جاں رفتم

تا که یارم اثرِ گریهٔ ذوق الفت
جانبِ دشتِ جنوں خرّم و خنداں رفتم

اشک چشمم شده بس موج زناں یکباری
گشت ز ورق نه مہیا که بطوفاں رفتم

رائے رایانِ جہاں رائے پرم دُکن که از ده
در همه عالم ایجاد ثنا خواں رفتم

گر دمے غنچه چو روشن تنگ ز دوراں گشتم
از ہوائے کرمش چوں گلِ خنداں رفتم

حاسدا! خنده ازیں امر روا نیست اگر
بدرِ کعبهٔ جاں ناصیه سایاں رفتم

تا آں بد بواد چو آشفته مرا جاں نروم
از پئے فایدهٔ خویش بجولاں رفتم

گر ترا نیز بود فائدهٔ زو منظور
دیر تا چند؟ تو ہم آ، کہ من ہاں رفتم

مہر اُمید بر آورد سر از شرقِ درش
با همه یاس اگر ہمچو عزیزاں رفتم

از مئے خلق کرم یک جرعه بکامم افگند
تا در ثمر ز خود رفته چو مستاں رفتم

تا که زلف سخنش نافهٔ سربسته گشاد
رشک افزائے گل و سنبل و ریحاں رفتم

نیزه ات تا که سر خویش بعیوق کشید
آسماں گفت که من از سرِ دوراں رفتم

میکنم بهر دعائے تو کنوں دستِ دراز
زاں که در راهِ ثنائے تو گراں رفتم

تا که گویند که بلبل سر گلشن دارد
تا که گویند پے گل صفاہاں رفتم

سایۂ لطفِ خدا باد بہ فرقت جاوید
کہ شہا بودم واز تو مہ تاباں رفتم

---

صبحِ گلشن ص ۲۲۹ بوستانِ اودھ دفترِ دوم، ص ۱۱۰، ۱۱۳

---

## مرزا قادر بیگ مائلؔ

بریلی کے باشندے تھے اور ابتدا میں میر غلام علی عشرتؔ سے تلمذ رکھتے تھے لکھنؤ میں آنے کے بعد غلام ہمدانی مصحفیؔ کے شاگرد ہو گئے مصحفیؔ نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر تیس سال بتائی ہے. کلام یہ ہے

جس وقت آہ لشکرِ غمِ دل پہ آ پڑا
سینے سے دل نکل کئی فرسنگ جا پڑا

اُس مہ کو دیکھ آئینہ حیران رہ گیا
سنبل بھی دیکھ زلف پریشان رہ گیا

سب ہم صفیر، منزلِ مقصود کو گئے
میں پا شکستہ بے سر و سامان رہ گیا

وہ اک آن میں آن کو توڑتا ہے
تصوّر جو ہم سالہا باندھتے ہیں

جنوں مجھ کو ہے یا جنوں ہمدموں کو
جو زنجیر سے دست و پا باندھتے ہیں

نہ ملو غیر سے، اس لئے ہاتھ اپنے
ترے آگے اے دلربا باندھتے ہیں

محبت کے عقدے ہزاروں ہیں کُھلتے
تصوّر جو اس کا ذرا باندھتے ہیں

جو مائلؔ ہیں دل سے کسی اچپلے پہ
وہ مضمون بھی اچپلا باندھتے ہیں

موت آئی نہ سرِ شامِ جدائی مجھ کو
سخت جانی نے عجب رات دکھائی مجھ کو

لاکھ درجے صاف تر ہے بدلے یار آئینہ سے
ہم نے دیکھا ہے ملا کر لاکھ بار آئینہ سے

دماغ دوستو جو ہیرے کجکلاہ کا ہے　　نہ حور کا نہ پری کا نہ بادشاہ کا ہے

---

ریاض الفصحا صہ ۲۰۴ ، عمدۂ منتخبہ صہ ۵۸۷

---

## سیّد احسان حسن مخلوقؔ

مصحفیؔ نے ان کا نام احسان حسن لکھا ہے، میر حسنؔ صاحب مثنوی سحرالبیان کے لڑکے، میر غلام حسین صاحکؔ کے پوتے اور میر خلیقؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاعری ورثے میں پائی تھی، ابتدائے شباب سے شوق شعر گوئی پیدا ہوا جب تک فیض آباد میں رہے اپنے بڑے بھائی میر مستحسن خلیقؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد گاہے گاہے مصحفیؔ سے بھی مشورۂ سخن جاری رہا۔ مرثیہ و سلام زیادہ لکھتے تھے اور افسانہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آخر وقت میں ریختی کی طرف توجہ ہو گئی تھی اور اس صنف میں اس قدر شغف تھا کہ سلاموں میں بھی ریختی کے نمونے یادگار چھوڑ گئے۔ بہم رسیدہ کلام کا نمونہ یہ ہے

پاویں جو نہ طلق ترے کوچے میں گزر ہم　　پھر تو ہی بتا یہ کہ بھلا جائیں کدھر ہم

---

اس کے آنے تک سنبھل جاوے　　پھر بلا سے جو دم نکل جاوے

شمع اُن سے کرے جو دعوی احسن　　یارب اُس کی زبان جل جاوے

---

ہمیں دو جواب جو ان دنوں تمہیں غیر سے سروکار ہے
کہ وہ بات ہے نہ وہ آنکھ ہے نہ وہ دوستی نہ وہ پیار ہے

---

ریختی کی مثالیں دیکھیے

اب ذرا دیکھیو ہووے گا بڑا شر پیدا　　لو زناخی نے کیا اور نیا گھر پیدا

مزاج گل سے بھی نازک تر ادوگانہ ہوا | جو پھول انگیا میں رکھا تو درد شانہ ہوا
مجرائی ہوتی جو میں حضرت شبیرؑ کے ساتھ | دیکھتے کرتی جو میں فرزند بے پیر کے ساتھ
پہلے تو حرملہ کی ناک میں دیتی میں تیر | ناک چھدواتی موئے کی میں اسی تیر کے ساتھ
زہر دلوائے بوا جس نے حسنؑ کو مارا | میں بھی دیتی اُسے ہیرے کی کنی کھیر کے ساتھ

حاکمِ شام کی جورو کو خصم کرواتی
(اور) لڑتی عمر سعد کی ہمشیر کے ساتھ

---

ریاض الفصحا ص ۳۰۷۔ خوش معرکہ اوّل ص ۱۰۴

---

## محمد جعفر مخمور

خواجہ محمدی کے لڑکے اصلاً کشمیری تھے لیکن وہاں سے ان کے بزرگ لاہور آبسے تھے۔ خواجہ محمدی لاہور سے لکھنؤ آئے اور محلہ وزیر گنج میں بود و باش اختیار کر لی۔ مخمور کی پیدائش یہیں ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے بعد منور خاں غافل کے ہمراہ مصحفی کی خدمت میں آئے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ: "ایک سال سے میرے پاس آتے ہیں، اب ستائیس سال کی عمر ہے۔ لکھنؤ میں عطاری (دوا فروشی) کی دوکان کرتے ہیں، اور یہی ذریعہ معاش ہے۔"

خواجہ عشرت کا بیان ہے کہ عہد شاہی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ طرح تھی "پائے بلبل" "لگائے بلبل"۔ اس میں مخمور کا یہ شعر بہت زیادہ کامیاب رہا تھا، اور بہت پسند کیا گیا۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر | چار دن اور ہوا باغ کی کھائے بلبل

مخمور کا دیوان مکمل تھا اس کا انتخاب مولانا حسرت موہانی ۱۹۱۴ء میں مطبع فیض عام علی گڑھ میں چھپوا کر شائع کر چکے ہیں۔

مخمور تقریباً ہر غزل کے مقطع میں اپنے تخلص کی رعایت قائم رکھنے کے خوگر تھے اس نوع کے چند مقطعے لکھے جاتے ہیں ؎

یاد آئی بادہ نوشی جو مخمور باغ میں — ساقی نے برگِ تاک کا ساغر بنا دیا

ہوش باش کہ مخمور تیری بالیں پر — سبو لئے ہوئے ساقی پُر خمار آیا

مخمور باہر آنہ سکا میکدے سے میں — احساں یہ مجھ پہ نشۂ سرشار نے کیا

مخمور مجھے بادۂ سرخوش سے چھکایا — ہونے کی نہیں ساقی کی امداد فراموش

بادہ نوشی کی نہ دے مخمور کو تکلیف آج — تیری آنکھوں ہی سے سیری ساقیا ہو جائے گی

مخمور کا کلام بہت رواں ہے، اس میں بندش کی چستی بھی ہے اور الفاظ مناسب کا استعمال بھی۔

مخمور کے صحیح سنہ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ ان کے ایک لڑکے جن کا نام خواجہ ولایت علی تھا شاعر اور خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ وہ کلکتے میں بھی کچھ مدت رہے تھے۔ سید اکمل پشاوری جن کا ذکر خمخانۂ جاوید میں ہے انہیں مسرور کے شاگرد تھے۔

مخمور کے تلامذہ بہت کم ہیں۔ ان کے ایک شاگرد کا نام تو منشی اصغر علی تھا جو مفتون تخلص کرتے تھے۔ یہ گڑھ مکتیشر کے باشندے تھے اور ابتدا میں مصحفی کے شاگرد رہ چکے تھے ان کا ذکر تلامذہ مصحفی میں کیا گیا ہے۔ دوسرے شاگرد حسین علی خاں یادگار خلف کاظم علی خاں تھے جو لکھنؤ کے محلہ احاطۂ خانساماں میں رہتے تھے۔ ان کا ایک واسوخت شعلۂ جوالہ میں شائع ہوا ہے۔ اس مسدس کا ایک بند یہ ہے ؎

یہ بلا عشق حسیناں زماں ہوتا ہے | اک جہاں ہوتا ہے برباد جہاں ہوتا ہے
ہدف اس تیر کا ہر پیر و جواں ہوتا ہے | یہ ہر اک رنگ سے دنیا میں عیاں ہوتا ہے

تو بہ کس طرح بھلا عاشق مضطر سے ڈرے
جب یہ ظالم نہ خدا سے نہ پیمبر سے ڈرے

اب مخمور کا کلام ملاحظہ کیجیے ؎

خدا کے فضل و کرم پہ نگاہ کرتے ہیں | گناہگار ہیں لاکھوں گناہ کرتے ہیں
غم ہو تو امید رکھ خوشی کی | رونا بھی دلیل ہے ہنسی کی
اُڑ جائے ہوا پہ جوں سلیمانؑ | تصویر جو کھینچے اُس پری کی
بار دُنیا اُٹھائے سر پہ | جرأت تو دیکھو آدمی کی
ہر ایک نفس کی آمد و شد | دیتی ہے خبر روا روی کی

نظروں میں ہے فنِ شعر مخمور
آنکھیں دیکھی ہیں مصحفیؔ کی

---

آمد بہار کی ہے گلستاں کے در کھلے | مرغ اسیر باغ میں پھرتے ہیں پر کھلے
ناچیز کو کرے جو وہ رزاق سرفراز | مور و مگس کے واسطے تنگِ شکر کھلے
میخانے میں کھپے ہے یہی اشتیاق مے | مخمور منہ لگائے خمِ مے اگر کھلے

---

ریاض الفصحا ص ، شعلۂ جوالہ ص
خمخانۂ جاوید اوّل ص ، آب بقا ص

---

## مست

مستؔ کا نام معلوم نہ ہو سکا لکھنؤ میں رہتے تھے. مصحفی نے صرف یہ لکھا ہے کہ

وہ محمد قاسم خاں[1] کے نواسے یا پوتے اور وجیہ، شجاع اور خوش وضع جواں ہیں۔ دو سال سے گیروی لباس زیب تن کر رکھا ہے مال دار اور متموّل حضرات سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ اہل و عیال کے باوجود طمانیت و استغنا کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں فن موسیقی میں بھی کسی قدر دخل رکھتے ہیں، اور جو کچھ کہتے ہیں اس میں مجھ سے اصلاح لیتے ہیں۔" کلام کا انداز یہ ہے ؎

دکھاؤں تجھے ایک نقشا مصوّر | رہے گر ترا ہوش بر جا مصوّر
نہ کر دھیان نازک خیالی کا اُس کی | لیا ہے تجھے وہم نے کیا مصوّر
جو کھینچے گا تصویر تو اُس پری کی | تو ہو جائے گا تجھ کو سودا مصوّر

ریاض الفصحا صد ۳۱۰ ۔ طلسم ہند صد ۲۶۳، ۲۶۴

---

[1] عالی جاہ محمد قاسم خاں نبیرہ امتیاز خاں خالص (دہلی میں فوت ہوئے اور درگاہ شاہ مرداں میں دفن کئے گئے۔ نواب علی ابراہیم خاں کی سفارش سے تین سو روپے ان کے لڑکوں کے لیے اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے لڑکیوں کے لئے انگریزی حکومت سے مقرر ہوئے ——— ایک لڑکی ان کی اقبال الدولہ ابن مختار الدولہ سے اور دوسری لڑکی محمد ناصر خاں سے بیاہی گئی۔ جب صاحب زادے سن تمیز کو پہنچے توفیق تربیت علی ابراہیم خاں سے علم و ہنر کے ساتھ آراستہ ہوئے۔ نوکری تحصیل داری وغیرہ بقدر لیاقت و آبرو سرکار انگریزی سے پائیں۔ اور نواب مرتضیٰ خاں دختر وزیر مملکت یمین الدولہ سے منسوب ہو کر لکھنؤ آئے۔ طرح قیام ڈالی۔ میر عبداللہ اور میر کلّو وغیرہ نے بھی لکھنؤ میں پہنچ کر بعزت و آبرو بسر کی۔ اور سندھیا کے پاس جا کر اعزاز حاصل کیا۔ اور بعض پوتے عالی جاہ کے بنارس اور لکھنؤ میں ناز و نعمت کے ساتھ قیام پذیر ہوئے۔

# پیر بخش مسرور

کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے شاہ علی حیدر کاکوروی نے مشاہیر کاکوری میں شیخ نور الاسلام منتظر کی طرح انھیں بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ اکثر تذکروں میں اُن کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔

مسرور کے والد کا نام حیات اللہ تھا۔ یہ حکیم بھی تھے اور شاعر بھی اور قلاش تخلص کرتے تھے۔ شیخ محمد بخش مہجور نے جو قلاش کے برادر نسبتی تھے نورتن میں ان کا یہ فارسی شعر درج کیا ہے ؎

بعد کشتن رحم بر حالم نہ فرمائی چرا
ہمرہِ تابوت تا گورم نمی آئی چرا

مسرور کی پیدائش ۱۲۰۴ھ میں ہوئی، وہ اپنے نانا حکیم خیر اللہ کی زیر تربیت رہ کر (جن کا قیام لکھنؤ میں تھا) سن بلوغ کو پہنچے۔ رسمی تعلیم بھی انہیں سے پائی اور فن طب بھی انھیں سے حاصل کیا۔ تعلیم کے زمانے ہی سے اساتذہ کے پسندیدہ اشعار ذہن میں محفوظ رکھنے کے خوگر تھے اس دل چسپی نے موزونی طبعی پیدا کر دی، اور خود کچھ کچھ کہنے لگے۔ لیکن ابتدائی فکر سخن کو کسی کے سامنے ظاہر کرنے سے اجتناب کیا اور اس تجسس میں رہے کہ فن شعر کی معلومات اور کلام کے حسن و قبح کی آگاہی کے لیے کس استاد کا انتخاب کریں۔ آخر ۱۲۲۱ھ میں جب کہ ان کی عمر ابھی سولہ سترہ سال کی تھی مصحفی کی خدمت میں آئے اور تلمذ اختیار کیا۔

مسرور کو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے تعلق تھا۔ یہ تعلق کب قائم ہوا اس کا علم تو مشکل ہے البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب سلیمان شکوہ لکھنؤ

سے رخصت ہوئے تو مسرور بھی اُن کے ساتھ تھے۔ شاہزادہ سلیمان شکوہ کے ساتھ دہلی بھی گئے اور اکبر شاہ ثانی شاہ دہلی کے تیئیسویں سال جلوس (۱۲۴۴ھ) میں اور اس کے دوسرے سال جب شاہزادہ مذکور آگرے میں تھے تو غافل اور حیدر علی افصح وغیرہ کے ساتھ مسرور بھی مہاراجہ بلونت سنگھ کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مسرور نے اپنے آقا کے ساتھ وابستگی کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے ؎

ہے بس کہ سلیماں کے علاقے کا مجھے فخر
نوکر ہوں سکندر کا نہ ہے جم سے علاقہ
کہتا ہے یہی سارا زمانہ مجھے مسرور
اس شخص کو ہے صاحب عالم سے علاقہ

ایک شعر میں اپنی ملازمت کو سلیماں شکوہ کا تصدق قرار دیتے ہیں ؎

کرے ہے نوکری مسرور کیا سلیماں کی
تصدق اپنا وہ دیتا اسے ہے گھر بیٹھے

مسرور کی شعر گوئی کے تذکرہ نویس قائل ہیں

سرور کہتے ہیں: "کلام موزونش دلچسپ و سرور افزا"۔

ناصر کی رائے ہے: "کلام اس کا مرہم ریش عشقبازاں بلکہ دلولہ انگیز خاطر محبوباں ہے۔"

خود ان کے استاد کا بیان یہ ہے :۔

"وضع موزونیش در ریختہ احیائے دل مردگاں می کند و دریں فن از معاصرین خویش پائے کمی نمی آرد بلکہ شیرینی گفتارش نمک بر جراحت عشقبازاں می باشد"

حقیقت یہ ہے کہ مسرور نے سلامت روی و سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ اپنے عہد کے دوسرے اہل سخن کی طرح کوہ کندن و کاہ برآوردن سے پرہیز کیا ہے۔ مسرور کا انتقال کب ہوا اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ البتہ ۱۲۷۱ھ تک وہ موجود

تھے کیوں کہ اس سنہ میں اپنے استاد بھائی منشی سید مظفر علی اسیر کے طباعت دیوان کا یہ قطعہ لکھا ہے ؎

چھپا ہے جا کے علی بخش خاں کے مطبع میں
مثال آئینہ، بندش صفا بیاں کیا خوب

پڑھا جو جاتا ہے مسرور شاعروں میں کبھی
پھڑک کے کہتا ہے ہر ایک مہرباں کیا خوب

پسند خلق ہے تاریخ کہہ رہے ہیں سب
مزا اسیر کے دیواں میں اے میاں کیا خوب

۱۲۷۱ھ

مسرور پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ سرور کے بیان کے مطابق دو دیوان اشعار مرتب و مکمل کئے تھے اور یہ زیادہ سے زیادہ ۱۲۳۰ھ تک کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ کہا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کوئی مطبوعہ دیوان ہماری نظر سے نہیں گزرا، البتہ مولانا حسرت موہانی نے جن کے پاس مسرور کا قلمی دیوان تھا ایک انتخاب شائع کیا تھا جس میں صرف غزلیات ہیں۔ حالانکہ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس کے کچھ منتخب اشعار مہجور نے نورتن میں موقع بموقع درج کئے ہیں۔

مسرور نے ایک تذکرہ شعرا بھی مرتب کیا تھا جو تذکرۂ مسرور کے نام سے مشہور ہوا۔ تذکرۂ مسرور ۱۸۳۳ء (۱۲۴۹ھ) میں مکمل ہوا۔ تذکرہ مسرور (مخطوطہ) کو جناب منشی امیر احمد علوی کے صاحب زادے قادری شبیر احمد علوی ناظر کاکوروی نے مرتب کیا تھا اور یہ نسخہ امیر محل لائبریری میں محفوظ تھا۔ آج کل یہ نسخہ کہاں ہے اس کا پتہ نہیں چلتا، غالباً دست برد زمانہ سے ضائع ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس تذکرہ کا اضاف شدہ نسخہ حضرت مصحفی نے خود ملاحظہ کیا تھا اس کے خاتمے کی عبارت اس طرح ہے:۔

"بر ضمیر آئینہ نظیر مبصران گوہر معنی مخفی نماند کہ مؤلف این" بیاض

صبح ازل" شیخ پیر بخش ولد حکیم حیات اللہ متوطن کاکوری مضافات سرکار اودھ کہ بہ تخلص مسرور شہرت دارد از سبب نامساعدت روزگار کجا فرصت آں داشت کہ بہ تفحص وتجسس احوال شعرائے نامدار پردازد ولیکن بہ رہبری علامہ دہر استادی غلام ہمدانی مصحفی مدظلہ العالی این بیاض را صاف کردہ بہ حضور آں علامہ پیش کردہ و صاف نمودہ درست ساختہ بطور بیاض تحریر یافتہ اما قاصر شکر ہستم گر ذکر عزیزم رمضان علی بیگ طپاں نہ کنم کہ بغیر امداد آں حضرت این کار دشوار بود.

تاریخ

سال او چوں زخرد پرسیدم | یک ہزار و دو صد سی دو نوشت

عبدہ الراجی پیر بخش مسرور کاکوری | ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ یوم آدینہ

کاتب بندہ مرزا بہادر بیگ وفا ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۳۹ھ مفتی گنج، لکھنؤ

" این تصنیف استاد زمانہ شیخ پیر بخش مسرور کاکوروی شاگرد خاقانی ہند شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۔ کتبہٗ لالہ گور بخش ادیب بار دوئم ۔ شہر ربیع الاول ۱۲۴۹ھ ۔ تمت الکتاب بعون الملک الوہاب"

تذکرہ مسرور کو دو کاتبوں نے الگ الگ لکھا ہے ۔ پہلی بار وفا نے اور دوسری بار لالہ گور بخش ادیب نے یہ لالہ صاحب غالباً وہی کہاور شاگرد ہیں جن کی غزلوں پر اصلاح محمد عیسیٰ تنہا کی صلاح سے موقوف کی گئی تھی ۔ اور جو نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں محرر خزانہ ہو گئے تھے ۔

مسرور نے کچھ شاگرد بھی بنا لئے تھے لیکن نام و نمود کا کوئی شاعر ان کے تلامذہ میں نہیں ہوا ۔ میرزا بہادر علی بیگ وفا، شیخ نبی بخش شاد آں، شیخ غلام حیدر بارش

میر اشرف علی بہتر، مرزا بندہ علی شفیق اور محمد وارث اظہار کا ذکر ناصر نے کیا ہے
ان میں سے آخر کے دونوں شاعر مسرور سے قطع تعلق کر کے ان کے استاد مصحفی
کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے تھے۔ اور ان کا ذکر اسی کتاب میں موجود ہے۔

کلام بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے ؎

عید کا چاند جو تھا مدِ نظر دیکھ چکا
تیرے ابرو کو میں اے رشکِ قمر دیکھ چکا

کبھی آسماں کو پھونکا کبھی رُخ کیا زمیں کا
شبِ ہجر تھا یہ عالم مری آہِ آتشیں کا

گلشن میں جو جاتا ہے مرا مہرِ درخشاں
پتوں میں چھپا لیتے ہیں منہ یاسمن اپنا
گر دستِ جنوں کی یہی چالاکی ہے مسرور
تربت میں بھی ثابت نہ رہے گا کفن اپنا

تربت پہ مری کوئی صنم خانہ بنا دو
معلوم کریں تا کہ اسے عشقِ بتاں تھا
اس کشتۂ دیدار کے اوسان تو دیکھو
جو ذبح کے دم تک سوئے قاتل نگراں تھا
مسرور رہا کیا کوئی درماندہ بچھڑ کر
جو یوں جرسِ قافلہ سرگرمِ فغاں تھا

کہا یہ جھاڑ کے گرد اس نے اپنے داماں کی
غبار یاں بھی کسی خاکسار کا پہنچا

اٹھتا ہے جب جنوں کو قاتل کے سامنے
اٹھتا نہیں ہے ہاتھ کسی داد خواہ کا
یہ فیضِ مصحفی ہے کہ مسرور ان دنوں
ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا

زلفوں میں رخِ یار نہاں ہو سکے گا
شعلے سے تو بہتر یہ دھواں ہو نہ سکے گا

پریوں کا جھنڈ تھا ترے کشتے کی نعش پر
اس طرح سے جنازۂ عشاق کم اٹھا

جیتے جی ہم نے کہیں عشق کا چرچا نہ کیا
جان دی اپنی ولے یار کو رسوا نہ کیا
ایک عالم ہوا انگشت بدنداں مسرور
غم سے مرنے کا ابھی شوخ نے اصلا نہ کیا

میں کہتا تھا کہ عشق اے دلِ ناداں مت کر
گو رہی مجھ کو سُلا کر تجھے آرام آیا

کب در پئے ایذا غم ہجراں نہیں ہوتا — کس روز یہ دل مرگ کا خواہاں نہیں ہوتا

جی اُلجھے ہے دم رکتا ہے ایام جنوں ہیں
پرزے مرا جیب تک کہ گریباں نہیں ہوتا

---

مرجائیں اُس کے در پہ یہ ہے مدعائے دل — اے اضطراب یہاں سے نہ لے جا کہیں ہمیں

---

ہجر کی رات ہو تو وصل کا ساماں مانگوں — وصل کا دن ہو تو پھر شبِ ہجراں مانگوں

---

گلگشت کی ہوس ہے کسے دوستی کے ساتھ — صرفِ خیالِ رنگِ رُخِ گلرخاں ہوں میں
کیا غم ہے ناتوانی نے جو پیر کر دیا — صدمہ اُٹھانے کو تو ابھی نوجواں ہوں میں

گھبرا کے دل نکل نہیں جاتا شبِ فراق
مسرور سچ تو یہ ہے عجب سخت جاں ہوں میں

---

کوئی دیتا ہی نہیں گورِ عزیزاں سے جواب — روز ہم جا کے عزیزوں کو پکارا کرتے ہیں

---

بے چین ہوں اور نیند نہیں آتی ہے مجھ کو
کیا ہجر کی شب دیکھئے دکھلاتی ہے مجھ کو

---

کیوں نہ وہ گل کی روش باغ جہاں میں شاد ہو
خانماں برباد ہو کر جس کا پھر آباد ہو

---

داغ دل کا یوں ہے اپنے زیرِ پیراہن چراغ
جس طرح رکھتے ہیں آندھی میں تہِ دامن چراغ

شب جو آیا بام پر لے وہ بُتِ پُرفن چراغ
چرخ پر بجھنے لگا مہ کا جو تھا روشن چراغ

---

آرزو ہے کہ تری بزم میں اک دم ساقی — لڑکھڑا کر میں گروں اور تو سنبھالے مجھ کو
ایسی تقدیر یہ کہاں ہے کہ پئے عذرِ گناہ — میں پڑوں پاؤں گلے سے وہ لگا لے مجھ کو
میں اس انداز کے یہ شعر کہے ہیں مسرور — قدرداں ہو تو اُڑھا دیوے دوشالے مجھ کو

عمدہ منتخبہ صفحہ ۶۶، ریاض الفصحا صفحہ ۳۱، خوش معرکہ زیبا صفحہ ۴۹۴
گلشن بے خار صفحہ ۱۷۵، سراپا سخن صفحہ ۱۰۷ و صفحہ ۱۷۷، سخن شعرا صفحہ
طبقات الشعرا کریم الدین صفحہ ۳۸۴، سرو چراغاں قلمی

---

# کرپا دیال مضطر

دیوان بینی پرشاد کے لڑکے عام طور پر لالہ کنور سین کے نام سے معروف تھے۔ لکھنؤ کے باشندے اور کائستوں کی سکسینہ شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا چوڑامن داس دلّی میں شاہی خزانے کے دیوان و پیش کار اور پنجہزاری منصب دار تھے۔ وہ نواب سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ دہلی سے لکھنؤ آئے اور کٹرہ رائے میں بود و باش اختیار کرلی۔ منصور علی خاں اور راجہ نول رائے کے عہد میں نیابت اور پیش کاری کے فرائض انجام دے کر فوت ہوئے۔ مضطر کے والد بینی پرشاد اور چچا بھوانی پرشاد لکھنؤ میں دیوان رہے تھے۔ صاحب رائے جن کا شمار لکھنؤ کے عمائد روزگار میں ہوتا تھا ان کے بھائی اور کاشی رام بخشی شاہی ان کے بھتیجے ہوتے تھے۔ نیز منشی خیالی رام خیالی بھی جن کو نواب عاشور علی خاں سے تلمذ تھا حقیقی بھتیجے تھے۔

مصحفی نے ۱۲۱۳ھ میں مضطر کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے (عقد ثریا) اس حساب سے سنہ پیدائش ۱۱۸۸ھ قرار پاتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور نشو و نما لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ آغاز جوانی تھا کہ غالباً ۱۲۰۸ھ کے آس پاس اپنے والد کے ہمراہ محالات چاند پور وغیرہ علاقہ چکلہ بریلی کی فوجداری پر متعین ہوئے بعد کو مظفر نگر کے تحصیل دار بنائے گئے وہاں سے ضلع بلند شہر تبدیل ہوئے۔ شیفتہ کے بیان کے

مطابق تصنیف گلشن بیخار ۱۲۴۸ھ تا ۱۲۵۰ھ کے وقت وہ یہاں بارہ سال سے تحصیل داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس کے بعد ڈبائی ضلع بلند شہر چلے گئے۔

مضطر عربی بھی جانتے تھے اور حکمت سے بھی واقف تھے۔ سیاق اور انشاپردازی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ خدا ترس اور خدا پرست تھے، علما و شعرا، فصحا اور فضلا کے قدر دان تھے۔ خوشرو و خوشخو بھی تھے اور حلیم و شلیم بھی۔

مضطر کا حافظہ بہت اچھا تھا گزشتہ و معاصر اساتذہ کے سیکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے اور ان کو حسب ضرورت سند کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مصحفی کے کامیاب شاگردوں میں تھے۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ان کا کلام کافی غور و فکر کا نتیجہ ہوتا تھا۔ یہ محمد عیسیٰ تنہا کی ہمراہی میں مصحفی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور شاگردی اختیار کی تھی۔

تذکرہ نگاروں نے مضطر کی شاعرانہ کاوشوں کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ مرقع شعرا کا مصنف لکھتا ہے:

"بافقیر از راہ قرابت بل بہ سبب ہم فنی رابطے تمام دارد"

"چوں گاہے بوطن مالوف لکھنؤ معاودت می کند اوقات شبانہ روزی بہ ہم نشینی می گزارد۔"

عبد العلیم نصر اللہ خاں لکھتے ہیں:

"بہ نظر ہنرمند اشعار دل پسند و خوش آیند"

شیفتہ کا بیان ہے:۔

"معلوم می شد کہ مضامین معقول یافتہ"

مظفر حسین صبا لکھتے ہیں:۔

"اشعار دل کش موزوں می کند"

اعظم الدولہ کی رائے ہے :-

"طبعے بلند و ذہنے ارجمند داشت"

صحیح سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا لیکن قیاس یہ ہے کہ ۱۲۶۴ھ سے قبل انتقال کیا

**ایک لطیفہ** :- ڈی تاسی نے کنور سین نام سے دھوکا کھا کر ان کا ذکر "جام" تخلص کے تحت کیا ہے حالاں کہ وہ ایک اور شاعر ، بڈھاولی کے رہنے والے شرف الدین مسرور میرٹھی کے شاگرد تھے۔ مضطر نے اردو فارسی دونوں دیوان مکمل کر لئے تھے۔ مصنف مرقع شعراء کے بیان کے مطابق شعراء کا ایک تذکرہ بھی زیر تدوین تھا۔ خدا جانے مکمل ہو سکا تھا یا ناتمام رہ گیا۔

ان کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف "ریاض الشہدا" ہے جس کا تاریخی نام 'فسانۂ غم' (۱۲۳۹ھ) ہے یہ (۱۴۲۵) اشعار کا ایک قصیدہ ہے اور واقعہ کربلا کی تفصیلات میں ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

طفلان اشک لالہ گوں ہیں گرم لعب آبشار
یا اک سحاب بحر خوں گلشن پہ وارد شعلہ بار

اس قصیدے میں تشبیب کے (۳۸) اشعار کے بعد ختم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت علی اصغرؓ کے علاوہ حضرت زین العابدینؓ سے حضرت عسکریؓ تک سب کی شہادتوں کا ذکر ہے۔ اور حضرت مہدیؑ کی غیبت پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ قصیدے کا خاتمہ ان ابیات پر کیا گیا ہے :

اے خسروان خسرواں فرماں دہان انس و جاں
تم ہو کریم دو جہاں ، خلق کریم کردگار
مضطر گدا حضرت کا ہے ، بندہ در دولت کا ہے

دارین کی دولت کا ہے یہ بینوا اُمیدوار

"ریاض الشہدا" میں جنگ کی منظر کشی جس انداز سے کی گئی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے ؎

جس خصم سے مرکب بلا، شان یداللہی میں آ
پٹکا سر زیں سے اٹھا اُٹھا نہ میداں سے غبار
گھوڑے کو چمکا کر گئے جس طرف دشمن مر گئے
لاشوں سے ہر سو بھر گئے میداں کے آغوش و کنار
آئے جدھر بازو کشا، اک زلزلہ سا پڑ گیا
واقع ہوا یہ تہلکہ فوج عدو سے ایک بار

قصیدے کا آخری شعر یہ ہے ؎

ہیں "غم فسانہ" سے لئے اعداد ختم اس نظم کے
مضطرسے تا باقی رہے یہ غم فسانہ یادگار

مضطر کی یہ تصنیف بڑی اہم تھی اور اسے ان کے بھتیجے کا منشی رام کمہار نے ۱۲۹۰ھ میں پنڈت بیج ناتھ کے مطبع ثمر ہند میں چھپا تھا اس کے قطعات لکھنے والوں میں مصنف کے سوا منشی خیالی رام خیالی، منشی بنسی دھر، اور ارجن لال نظم بھی ہیں۔ یہ ارجن لال مضطر کے پوتے تھے۔

بہم رسیدہ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

جو سن کے خفا ہو نام میرا
کس طرح وہ لے سلام میرا
مکھڑا مہ چار دہ سا دکھلا
کام اس نے کیا تمام میرا

جو پڑا سینے پہ میرے گھاؤ سو کاری پڑا
دوش پر اُن کے دوپٹہ دیکھ زنگاری پڑا

اُس شمع رو کے دل میں جب تک مجھے راہ پیدا
ہونے لگا جگر سے یاں دود آہ پیدا

تاریکیٔ شب غم جی روندتی ہے میرا ۔۔۔ ہوتا نہیں نشانِ روزِ سیاہ پیدا

غلل انداز وفا کون سا غمّاز ہوا ۔۔۔ کہ جواب خطِ مضطر قلم انداز ہوا

جلوہ فرما ہے وہ مہر مرے گھر آج کی رات ۔۔۔ اے فلک کیا ہو بڑھاوے تو اگر آج کی رات

دشنہ کاری جو نہیں کرتے کسی کے مژگاں ۔۔۔ منہ کو آتا ہے چلا کیوں یہ جگر آج کی رات

کہاں ہے موت سے کہدو کہ آوے ۔۔۔ بہت دن زندگانی کر چکے ہم

جو ہونی تھی ہوئی وہ بات ناصح ۔۔۔ تری باتوں سے اب تو ڈر چکے ہم

اُس کے کوچے کی طرف جاتا ہے ۔۔۔ نامہ بر پر مجھے رحم آتا ہے

اب درِ دلدار کے اوپر گدائی کیجیے ۔۔۔ سن سکے تو کچھ دنوں بخت آزمائی کیجیے

ملنے سے تو نہ ملنا ہی اچھا تھا آپ کا ۔۔۔ چھریاں جگر میں مار چلے تم بھلے ملے

خنجر تو گلے پر مرے وہ پھیر رہا تھا ۔۔۔ میری ہی خطا تھی کہ مری چشم بھر آئی

مضطر برا کیا کام کیا آہِ رسا نے ۔۔۔ دنیا میں یہ جا کر مجھے بدنام کر آئی

ابھی سے بے قراری ہے تو ہم نے ۔۔۔ دلِ مضطر مقرر رات کاٹی

سوزِ جگر کو دیدۂ پُرنم کو دیکھئے ۔۔۔ ان آفتوں کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

ساکنِ دَیر بنے، دین سے بے دین ہوئے ۔۔۔ پر یہ بت رام نہ اپنے کسی آئین ہوئے

سیکھ کر باغ میں قد سے ترے رعنائی کو ۔۔۔ کام فرمانے لگا سرو بھی مرزائی کو

اس کے خال تہِ ابرو پہ مجھے آوے ہے رشک ۔۔۔ لے کے بیٹھا ہے وہ کیا گوشۂ تنہائی کو

دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہو اور غیر کو دوست ۔۔۔ ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو

جب سے اُس شوخ کا عاشق میں ہوا ہوں مضطر ۔۔۔ ہر کوئی دیکھ ہنستے ہے مری رسوائی کو

پھرتے ہی اُس دشمن جاں کے خدائی پھر گئی ۔۔۔ میرے نالوں کی زمانے میں دہائی پھر گئی

## فارسی

آرزوئے جانِ مضطر در دلِ غمناک ماند ۔۔۔ دانۂ ما بر نیامد از زمیں در خاک ماند

عقد ثریا ص ۵۷، تذکرہ ہندی ص ۲۲۳، عمدۂ منتخبہ ص ۷۰۹
مجموعۂ نغز دوم ص ۱۹۵، گلشن بیخار ص ۱۸۱، گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۰۸
خوش معرکہ جلد اول ص ۳۸۱، مرقع شعرا ص ۹، روز روشن ص ۶۳۲
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۸۵، رسالہ تحریہ اشاعت ص ۶ ۱۹۶۷ء

---

## لالہ درگا پرشاد مضطرؔ

ان کے والد دیوان بھوانی پرشاد قوم کائستھ سکسینہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا اور اچھی جاہ و ثروت رکھتے تھے۔ جس وقت راجہ بھگوان داس کشمیر کے صوبہ دار تھے تو بھوانی پرشاد اور اُن کے بھائی کو وہاں اختیارات کلّی حاصل تھے۔ مضطرؔ صلاحیت و قابلیت میں شہرت یافتہ تھے اور سلیقہ شعر فہمی میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ یہ شغل محض تفنن طبع کے لئے کرتے تھے۔ اور ایسا اتفاق بھی کبھی کبھی ہوتا تھا۔ جب تلک محمد عیسیٰ تنہاؔ زندہ رہے یہ اُن سے اصلاح لیتے رہے۔ تنہاؔ کے انتقال کے بعد مصحفیؔ کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ یہ کرپا دیال مضطرؔ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی ایک ہی غزل ہے جس کے منتخب اشعار مختلف تذکروں میں درج ہیں اور اسی کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

بہت بے اختیاری کر چکے ہم — نہایت آہ و زاری کر چکے ہم
کہا میں کچھ تو کیجے میری خاطر — کہا خاطر تمہاری کر چکے ہم
ترے وعدوں پہ ہے اب دم شماری — بس اب اختر شماری کر چکے ہم
اگر یاری یہی ہوتی ہے صاحب — تو بس آگے کو یاری کر چکے ہم

نہ آیا مضطرب وہ رشکِ گُل ہائے　　　　لہو آنکھوں سے جاری کرچکے ہم

---

تذکرہ ہندی صہ ۲۲۵ ، خوش معرکہ اول صہ ۳۸۱

---

## خواجہ مظفر علی خاں مظفرؔ

غلام علی خاں مولف تواریخ عالی گوہر کے بیٹے نواب بھکاری خاں صوبے دار لاہور کے پوتے اور روشن۱ الدولہ نواب ظفر خاں کے پرپوتے تھے یہ غلام علی خاں وہی ہیں جن کے ساتھ مصحفی ۱۱۹۸ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے تھے دونوں کے درمیان دوستانہ و ہمدردانہ مراسم تھے۔ اور غلام علی خاں مصحفی کے اچھے قدردانوں میں شامل تھے۔

---

۱۔ نواب روشن الدولہ ظفر خاں کا اصلی نام خواجہ مظفر تھا۔ خاندان نقشبندیہ سے تھے آپ کے دادا خواجہ محمد نصیر شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور کھجوے کی لڑائی میں جو اورنگزیب اور مرزا شجاع کے درمیان ہوئی تھی کام آئے۔ خواجہ مظفر کے باپ عبدالقادر کا تاریخی واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ درویشانہ زندگی گزارتے تھے اور فرخ سیر کے عہد میں انتقال کرگئے۔ خواجہ مظفر نے شاہ عالم بہادر شاہ کے فرزند رفیع الشان کی ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ پانزدہ صدی منصب اور پانچ صد سوار تک پہنچے اور ظفر خاں کا خطاب پایا۔ محمد شاہ کے عہد میں ہفت ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ اور رستم جنگ خطاب ملا۔ طرہ باز خاں بھی کہلاتے تھے۔ ۱۱۴۹ھ میں فوت ہوئے۔ واقعات دہلی دوم صہ ۱۳۶۔

مظفر نے فارسی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد تحصیل عربی مولوی محمد اشرف شاگرد رشید مولوی نور سے کی تھی۔ اور شرح سلّم تک پڑھا تھا طبیعت موزوں تھی اور میر تقی کی شاگردی میں فکر سخن کرتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں جب مصحفی کے مشاعروں میں تواتر کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ تو اُس معرفت کی بدولت جو اُن کے والد کو مصحفی کے ساتھ تھی اپنا کلام مصحفی کو دکھانے لگے۔ مصحفی کے تذکرہ ریاض الفصحا کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ سنہ وفات تحقیق نہ ہو سکا مگر سنہ ۱۲۹۱ھ سے قبل انتقال کر چکے تھے۔ کیونکہ محسن نے سراپا سخن میں انھیں مرحوم لکھا ہے۔ صاحب دیوان تھے مگر صرف چار شعر مصحفی نے ریاض الفصحا میں دیئے ہیں۔ اور تین شعر محسن نے سراپا سخن میں، یہ کل سات شعر ان کا دست یاب شدہ سرمایہ کلام ہے اور انھیں کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

محسن کے کلیات میں یارہ شعرا یمہ و کا انتخاب ہوا

لالی نہیں اُس کے لب پہ پان کی ۔۔۔ سُرخی ہے یہ خون عاشقاں کی

نہ گریباں پر ترے دارائی کی تحریر ہے ۔۔۔ خوں کسی عاشق کا پیارے یہ گریباں گیر ہے

زلفوں کو تیری دینا اے آفت زمانہ ۔۔۔ مشک ختن سے نسبت یہ مو بمو خطا ہے

مانع نہیں چلنے کا مرے سلسلۂ پا ۔۔۔ پہ رکھنے نہیں دیتا قدم آبلۂ پا

کیا پوچھتے ہو فرق وجود اور عدم کا ۔۔۔ گر غور سے دیکھو تو ہے اک فاصلۂ پا

پھرتا ہے لئے آٹھ پہر مجھ کو مظفر ۔۔۔ کس سے میں کروں جا کے اب اپنا گلۂ پا

---

ریاض الفصحا ص ۲۹۹ ۔ سراپا سخن ص ۲۸۱

# شاہ غلام حسین مظلوم

صحیح معلوم نہیں کہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ خواجہ عشرت نے دہلی کا شاعر لکھا ہے۔ ابن طوفان کی تحقیق کے مطابق "وطن مبارکش در قرب وجوار باہرہ" تھا اور کلب حسین خاں نادر کے خیال میں ان کا اصلی وطن متصل پنجاب۔ تھا۔ اس بات میں سب متفق ہیں کہ متوکل درویش اور جہاں دیدہ سیاح تھے۔ عام طور پہ شاہ مظلوم کہلاتے تھے۔ مدت تک لکھنؤ میں رہے اور اس دوران میں مصحفی کے سامنے زانوے تلمذ کر کے رموز شاعری سے واقفیت حاصل کی۔ ١٢٣٠ھ کے قریب لکھنؤ سے الہ آباد چلے گئے۔ نادر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہاں گیارہ سال سے مقیم ہیں۔ یہ تذکرہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھا گیا ہے۔ ناصر نے الہ آباد کے مستقل قیام اور نام کے ساتھ "شاہ" کا لفظ دیکھ کر انھیں شاہ اجمل کے خاندان کا ایک فرد قرار دے دیا ہے حالاں کہ اس خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ عنایت حسین خاں مہجور نے لکھا ہے کہ آخر میں شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہو گئے تھے لیکن یہ اطلاع قطعاً غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو کلب حسین خاں نادر اپنے تذکرے میں اس کی طرف ضرور اشارہ کرتے۔ مظلوم مصحفی کے سچے عقیدت مند شاگرد تھے اور آخر وقت تک وفاداری کے ساتھ اس پہ قائم رہے۔ جس کی شہادت ناصر کے ان فقرات سے ملتی ہے:۔

"جن روزوں میں شیخ ناسخ علیہ الرحمۃ (دائرہ اجمل الہ آباد) میں) دائرہ ساز تھے شاہ صاحب (شاہ اجمل) کی اولاد تمام و کمال، ان کی شاگردی کی مقر بلکہ شاگرد ہوئی۔ اس عزیز (مظلوم)

نے میاں مصحفی کی محنت کو ضائع نہ کیا اور دائرہ بیعت ناسخ سے خارج رہا۔"

مظلوم بہت خوش گو شاعر تھے ان کی شاعری و سخن گوئی کی تعریف اکثر تذکرہ نویسوں نے کی ہے۔

عبدالعلیم نصراللہ خاں کہتے ہیں "مرد خوش اخلاق در سخن مشہور آفاق است"

ابن طوفان کی رائے ہے "مردم کہنہ مشق و جہاں دیدہ شیریں کلام، حکیم آسا خدائے جل و علیٰ ید بیضا بسانش عطا گردانیدہ"

مہجور کے الفاظ یہ ہیں "شاعرے بود معنی سنج و سخنورے بود فصاحت گنج"

نادر کا بیان ہے۔ "درین فن کامل راقم نقوش غریبہ است و ناظم جواہر عجیبہ معنی یاب وقت آفرین است و گلدستہ بند خیالات رنگیں۔ صفائے اشعار عاشقانہ او رشک آئینہ حلب است و نظم معنی بندش از غوامض معنی و مضمون دقت طلب"

عقلا کہتے ہیں کہ شعر گوئی نتیجۂ عشق ہوتی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ الٰہ آباد میں کوئی طوائف تھی جس کا نام گلابی جان تھا۔ اُن سے محبت کرتے تھے۔ ایک پوری غزل لکھ ڈالی ہے۔ جس کی ہر بیت کے قافیہ میں ایک صنعت کے ساتھ اس کا نام نظم کر دیا ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

ہو گیا بد ظن مجھے زاہد شرابی جان کر
شیشۂ دل سنگ پہ مارا گلابی جان کر

آخر یہ بزرگ مشہور اپنے وطن سے دور ذی قعدہ ۱۲۵۶ھ میں ہیضہ میں مبتلا

ہو کر رہگزارے عالم باقی ہوئے۔ کسی نے "ہائے افسوس وائے مظلوم" سے سنہ وفات برآمد کیا ہے۔ ایک قطعہ میر علی اوسط رشک نے بھی لکھا ہے جو اُن کے دیوان دوم میں ہے ؎

در الہ آباد چوں مظلوم شاہ از ہیضہ مُرد
شاعرِ شیریں زبان خوش طبع با اخلاق وائے

حیف باد انتقال او بہ ذی قعدہ بود
بود ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے

رشک تاریخش ہمیں مصرع بعینہ یافتہ
بودہ ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے

۱۲۵۶ھ

مظلوم صاحب دیوان شاعر تھے! اور دو دیوان مرتب کئے تھے۔ دوسرے دیوان کے آغاز میں کہتے ہیں ؎

کلیمِ عصر ہوں، کشّافِ سرِ لنترانی کا
چراغ طور ہے مطلع مرے دیوان ثانی کا

اور بقول عبدالعلیم نصراللہ خاں بہار دانش کو اردو میں نظم کیا تھا۔

بعض تذکروں میں ان کے ایک شاگرد میر باسط علی محوی کا نام ملتا ہے جو بہت اچھے شاعر تھے۔

کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

کب عشق میں پڑتا ہے قدم اہلِ ہوس کا
شعلے کے مقابل ہو یہ زہرہ نہیں خس کا

آتی ہے نت آواز چلو قافلہ والو
اس رمز پہ میں شیفتہ ہوں بانگ جرس کا

اس منزل ہستی میں جو دیکھا بہ تامل
وقفہ نہیں گر ہے بھی تو ایک آدھ نفس کا

جیوں بوئے گل تر چمنستاں سے اڑا میں
ممنوں ہوا ہرگز نہ کبھی ناکس و کس کا

دیں گے یہ دعائیں تجھے پر کھول دے صیاد
اس موسم گل میں تو اسیران قفس کا

جس حسن کے شعلے سے فرشتوں کے جلیں پر
پروانہ وہاں کیوں نہ رکھے حکم مگس کا

چلاتا ہوں از بس میں شب ہجر مظلوم
دم بند کیا ہے مرے نالوں نے جرس کا

دستِ بوسی کفِ سفاکِ ستمگر کرتا　　آہ سوزاں جو ہیں زیرِ دمِ خنجر کرتا

کشتہ ہے جہاں دفن ترے فندقِ پاکا　　سبزہ کی جگہ اُگتا ہے واں نخل حنا کا

شب تصور میں جو اس کا مصحفِ رخسارہ تھا　　حافظِ قرآن میرا یہ دل سیپارہ تھا

زلفِ آشفتہ نہ چھونا، شانۂ تیرہ دروں　　جمع اسبابِ جنوں ہے، رائگاں ہو جائیگا

خال آشنا ہے دیدۂ جادو طراز کا　　ہندو بچے سے رام ہے آہو حجاز کا

پھولوں کا جو اُس گُل کے پڑا ہار کمر پہ　　اک طرفہ شگفتہ ہوا گلزار کمر پہ

اک مو، نہ ہوا وصف ترے موئے کمر کا　　کہہ کہہ کے مرے سیکڑوں اشعار کمر پہ

آئینہ خجل ہے شکم صاف سے اُس کے　　کھاتے ہیں گل اندام سدا خار کمر پہ

اللہ ری نزاکت تری، کس ناز و ادا سے　　ہاتھوں کو رکھے ہے دمِ رفتار کمر پہ

احوالِ سیہ بختیٔ مظلوم کرے ہے
وہ جعد سیہ، مو بمو اظہار کمر پر

گلچیں ملک الموت ہوا بر قفسِ گُل　　بلبل نے کیا ماتم مغفور چمن میں

دل مرا مائل زلفِ بُتِ بے پیر نہیں　　میں مسلماں ہوں مجھے خواہش تکفیر نہیں

رہا دل کو خیال ساقی و میخانہ تربت میں　　فرشتوں سے کیا ہم نے طلب پیمانہ تربت میں

ذرا[1] خواب عدم سے چونک اُٹھتا تب تماشا تھا　　اڑا دیتا کفن کی دھجیاں دیوانہ تربت میں

افاقہ ایک دم کا گر خمارِ مرگ سے ملتا　　خدا سے مانگتا ساغر ترا مستانہ تربت میں

نظر جس دم چراغ دیدۂ منکر نکیر آیا　　دل شیدا ہمارا بن گیا پروانہ تربت میں

قتیل خنجر شانہ ہوں، درد شانہ ہے مجھ کو　　روا رکھنا نہ شانہ ہے میرے شانہ تربت میں

طرف معبود کے سجدہ کیا مظلوم عاشق نے　　نہ پایا جب نشانِ کعبہ و بتخانہ تربت میں

---

[1] مرا خواب عدم سے چونک پڑنا اک تماشا تھا۔ (خوش معرکہ)

نظر افگن ہے کس کے عارضِ پرنور پہ تجلی    کہ ہے قصد گرنے کا چراغ طور پہ بجلی

سامنے آتا ہے جب موئے میاں کا مضمون    کمر شاہد نظارہ لچک جاتی ہے

آتش میں نستر انیوں کی مت جلا مجھے    اے سوزِ برقِ طور، تجلا دکھا مجھے

وہ استخواں سوختۂ سوزِ غم ہوں میں    سونگھے سگِ گرسنہ نہ کھائے ہما مجھے

درماندہ مثل گردِ پسِ کارواں ہوں میں    آوازِ شورِ حشر ہے صوتِ درا مجھے

آہوئے دشتِ وحشت یادِ عذار ہوں    دامِ بلا ہے حلقۂ زلفِ دوتا مجھے

مظلومؔ مثل برگ خزاں دیدہ بار ہوں
ننگِ چمن سمجھتی ہے بادِ صبا مجھے

فکرِ عالی بہرِ وصفِ قدِ دلبر چاہیے    عالمِ بالا پہ یاں ذکر صنوبر چاہیے

نقصِ ناقص دیکھیے اور حُسن کامل دیکھیے    داغ مہ کو دیکھیے رخسار کا تل دیکھیے

اثبات اس کے منہ سے میاں کیا مجال ہے    تقریر فلسفی ہے تو کچا خیال ہے

آہ کیونکہ مرضِ عشق یہ پنہاں ہووے    زردئ چہرہ ہی جب آپ نمایاں ہووے

کچھ خوش آتا نہیں اب سیر مویار و مجھ کو    میں ہوں وحشت ہو مری اور بیاباں ہووے

بس کہ ہمدرد کو ہمدرد کا ہوتا ہے غم    سن کے بلبل بھی مرے نالے کو نالاں ہووے

بیکلی دل کو ستاتی ہے قیامت شب و روز    یا الٰہی کہیں اس درد کا درماں ہووے

جی میں آتا ہے کہ کھچوائیے تصویر اپنی    پاس زنجیر ہو اور گوشہ زنداں ہووے

نو گرفتاری او پر اپنی کے میں یوں روتا ہوں    طفل مکتب کوئی جس طرح سے گریاں ہووے

کیا شکایت کرے صیاد سے کوئی ہمدم    دل ہی جب اپنے لئے صورت پیکاں ہووے

خاک منہ پہ ہو ملی اشک ہوں آنکھوں سے رواں    ہاتھ سینے پہ ہوں اور چاک گریباں ہووے

(ق)

آرزو ہے دلِ مظلومؔ کی شیون میں کبھی    اتنی طاقت مجھے حاصل اے عزیزاں ہووے

تحت الثریٰ سے دیکھا تا عرش لامکاں ہے　　　حیران ہوں خدایا میرا مکاں کہاں ہے

---

تذکرۂ ابن طوفاں ص ۔ ، شوکت نادری
گلشن ہمیشہ بہار ص ۳۱۹ ۔ خوش معرکہ اول ص ۴۲۹ ۔ مدائح الشعرا قلمی —
دیوان غریب ص ۵۰۴ ۔

---

# میر مہدی حسن معروفؔ

میر مہدی حسن نام لکھنؤ کے باشندے اور مصحفی کے ایک غیر معروف شاگرد تھے۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ گلدستہ گلزار سخن پونا کی نومبر ۱۹۲۴ء کی اشاعت میں ان کا کچھ کلام شائع ہوا تھا۔ یہاں اسی کو بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے ؎

جن کو ہے تکیہ خدا پر ان کو کیا تکئے سے کام
سو رہے جب نیند آئی رکھ کے نیچے سر کے ہاتھ
میں تو چھوڑوں پر نہیں چھٹتا ہے عشق سنگدل
آگیا ہے بے طرح یارب تلے پتھر کے ہاتھ[1]
باغِ گیتی میں برنگِ غنچہ اے معروفؔ اب
ہے مری عقدہ کشائی حیدر صفدر کے ہاتھ

---

جب کہ یاری زیادہ ہوتی ہے　　　پاسداری زیادہ ہوتی ہے
ہم سے آنے کا لو قرار مگر　　　بے قراری زیادہ ہوتی ہے

[1] یہ مصرع اصغر علی مغفورؔ کے کلام میں بھی موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کسی مشاعرہ کا مصرع طرح ہو۔

سچ ہے دیر آشنا کی الفت میں — پائیداری زیادہ ہوتی ہے
جبکہ رہتی ہے کم شب وعدہ — انتظاری زیادہ ہوتی ہے
دوستو مجھ کو مت دلاسا دو — آہ وزاری زیادہ ہوتی ہے
وقتِ عفوِ گناہ، مجرم کی — شرمساری زیادہ ہوتی ہے
مشقِ عشق و نیاز سے معروف
خاکساری زیادہ ہوتی ہے

---

## سیّد محمد رضا مفتون

سیّد نور الحسن بن سیّد محمد اعظم بلگرامی کے ایک لڑکے سیّد تبارک حسین تھے سیّد تبارک حسین کے آٹھ لڑکے تھے ان میں تیسرے نمبر پہ سیّد محمد رضا کا نام آتا ہے۔ سید محمد رضا نے لکھنؤ میں رہ کر شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا۔ فارسی میں رضا تخلص کرتے تھے۔ اور مرزا قتیل سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد شاہ سلامت اللہ کشفی سے مشورہ سخن رہا۔ اردو میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور مفتون تخلص کرتے تھے۔ بہت دنوں تک سعادت علی خاں نواب اودھ کی سرکار سے توسل رہا۔ آخر اپنی شادی کی وجہ سے آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں پہنچے اور پھر لکھنؤ واپس نہ آئے۔ یہاں ایک انگریز کو اردو سکھانے اور فارسی پڑھانے کا کام مل گیا۔ اسی انگریز نے انہیں گماشتہ افیون مقرر کرا دیا۔ اس ملازمت کی وجہ سے جھجوا کوٹھی پر قیام رکھتے تھے۔ آخر عمر تک وہیں رہے غدر سے ایک سال قبل ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں بیمار ہو کر آرہ آئے اور کچھ دن کے بعد انتقال کیا۔ قبر وہاں کی کربلا میں ہے ان کی شادی سید افتخار علی ذرہ بن سید خورشید علی خورشید بلگرامی کی لڑکی کے ساتھ

ہوئی تھی۔ اولاد کوئی نہیں چھوڑی۔ سید محمد رضا بڑے طبیعت دار، خوش خلق، منقح اور متین شخص تھے۔ فارسی میں ایک دیوان اور دو مثنویاں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک مثنوی عاشقانہ تھی جس کا نام دل آشوب تھا اور دوسری میں اپنے برادر سید غلام رضا بر مکان گرنے کا واقعہ نظم کیا تھا۔ اس مکان کی چھت پر برسات میں ایک پڑوسی کا مکان گر گیا تھا جس میں رضا کے بھائی اور بھاوج دب گئے تھے بھائی تو ملبے سے زندہ نکالے گئے اور اُن کی اہلیہ کی لاش نکلی تھی۔ ایک اور مثنوی جس کا نام گنجینۂ محبت تھا تصنیف کی تھی۔ اس مثنوی کا پتا نشان نہیں ملتا۔ اردو میں بہت کم کہتے تھے۔ صرف چند اوراق غزلیات کے تھے۔ تذکروں میں بھی کم اشعار ملتے ہیں۔ البتہ ان کے فارسی دیوان کا مخطوطہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں ہے یہ نستعلیق خط میں ہے اور کچھ بے پروائی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ۶×۹ سائز کے ۱۲ سطری سطر کے ۱۱۸ صفحات میں ختم ہوا ہے۔ اس میں غزلیات و رباعیات کے سوا مرزا قتیل اور شاہ کشفی کی غزلیات کے مخمس بھی ہیں۔ فہرست نگار نے اس دیوان کو میر محمد رضا دہلوی کی تصنیف ظاہر کیا ہے جن کا انتقال ۱۲۰۶ھ میں ہوا۔ یہ انتساب قطعی غلط اور سخت غلط فہمی پر مبنی ہے ظاہر ہے کہ جس شاعر کا انتقال ۱۲۰۶ھ میں ہو چکا ہے وہ مرزا قتیل متوفی ۱۲۳۳ھ اور اُن کے شاگرد کشفی متوفی ۱۲۸۱ھ کی غزلوں کی تخمیس کس طرح کر سکتا ہے۔

رضا و مفتون بلگرامی کے جو اشعار مل سکے یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

گر کرے زیب گلو وہ نوجوان سبزہ رنگ
فیض رنگ سبز سے تسبیح مرجاں سبز ہو

ہنسنے نہیں دیتی ہے انہیں تنگ دہانی
اس واسطے رغبت ہے تبسم سے زیادہ

ماہرو میں نے کہا تم کو تو عالم نے کہا
میرے ہی کہنے سے صاحب عرش کے تارے ہو

ناصح : سنیں گے لب نوشیں کی قسم ہے
شیریں سخنی تیری ہمارے لئے سم ہے

کلام فارسی

رسید خاطرم از ہرچہ ہست در عالم    بغیر یار کہ او عالم دگر دارد

---

بیابان بلا خارے ندارد    کہ از دامانِ من تارے ندارد

---

جلوہ خضر اول صہ ۱۷۲، سخن شعراء ۴۵۱، نگارستان سخن صہ ۳۲

فہرست بانکی پور جلد ۳ - صہ ۲۳۷ -

---

## نواب فصیح اللہ خاں مفتوںؔ

یہ بزرگوار نواب عبداللہ خاں عاصیؔ کے پوتے اور نواب نصراللہ خاں سلطانؔ متوفی ۱۲۲۵ھ نائب والیٔ ریاست رام پور نواب احمد علی خان رندؔ کے بیٹے تھے نشوونما اور تعلیم و تربیت رام پور میں حاصل کی اور وہیں فکر سخن کا آغاز بھی کیا۔ یہ زمانہ احمد خاں غفلتؔ کا تھا اور رام پور میں ان کی استادی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ یہ بھی اُن کے شاگرد ہو گئے۔ اتفاقاً لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس وقت میر صدرالدین صدرؔ لکھنوی شاگرد خواجہ حیدر علی آتشؔ اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ مفتوںؔ نے بھی اس مشاعرے میں شریک ہو کر غزل پڑھی۔

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی انتخاب یادگار میں تذکرہ مصحفی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"یہ صاحبزادے اخوندزادہ احمد خاں غفلتؔ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں کبھی میر صدرالدین کو اور کبھی مجھ کو کلام دکھایا ہے۔ ستر

برس کی عمر پائی ربیع الاول کی ستائیسویں تاریخ بارہ سو اناسی (۱۲۷۹ھ) ہجری میں وفات پائی۔"

انداز کلام یہ ہے

وہ کیفیت نہیں دیکھی چمن کے آب جاری میں
نظر جو لطف آیا چشم تر کی اشکباری میں
ترے مفتوںؔ کا دن تو آہ و نالہ میں گزرتا ہے
کٹے ہے رات اے رشکِ قمر اختر شماری میں

---

جب کہا، دل تم پہ دیوانہ ہوا، میں کیا کروں
یوں لگے کہنے مری جانے بلا! میں کیا کروں

---

چلمن کو اٹھا منہ جو دکھایا ہے کسی نے
جوں شمع مرے جی کو جلایا ہے کسی نے
مفتوںؔ کے تئیں دیکھ کہا میں نے کہ تو آج
غمگین ہے، کیا تجھ کو ستایا ہے کسی نے
تو بھر کے وہ اک آہ لگا کہنے کہ مت پوچھ
دل لے کے ہمیں دل سے بھلایا ہے کسی نے
عشاق کے شب خوں کا ارادہ ہے کہ مفتوںؔ
مستی پہ لکھوٹا بھی جمایا ہے کسی نے

---

ریاض الفصحا ص ۳۱۸ - انتخاب یادگار ص ۳۴۶

---

## منشی اصغر علی مفتوںؔ

ایک بزرگ شیخ فیض علی گڑھ مکٹیشر ضلع میرٹھ کے ساکن تھے جن کا انتقال ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ کو بریلی میں ہوا۔ مولوی کلّو کی لڑکی آصفہ بی بی ان سے منسوب تھیں۔ اُن کے دو لڑکے تھے جن کے نام اکبر علی اور اصغر علی تھے منشی اکبر علی بڑے تھے۔ وہ سن شعور اور حصول تعلیم کے بعد ۱۸۵۸ء تک مراد آباد، میرٹھ اور علی گڑھ کے اضلاع میں سررشتہ دار رہے۔ زمانۂ غدر میں علی گڑھ کی سررشتہ داری پر مامور تھے۔ یہاں سے سبک دوش ہو کر خانہ نشین ہوئے۔ ضیاء اللہ

بچھرایونی کی بہن مسماۃ سعیدن کے ساتھ ان کی شادی ہوئی تھی ان کے بڑے منشی صادق علی میرٹھ کی عدالت دیوانی میں وکالت کرتے تھے منشی فیض علی کے دوسرے لڑکے منشی اصغر علی نے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ جاکر میر روشن علی سے خط سلیس و نسخ اور حافظ محمد ابراہیم سے خط نستعلیق سیکھا تھا اور یہیں خط شفیعہ و گلزار میں بھی کمال بہم پہنچایا تھا۔ خاندان چشتیہ صابریہ میں مولانا شاہ عبدالرحمٰن موحد لکھنوی سے شرف بعیت حاصل کیا تھا۔ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۵۸ء تک (۳۳) سال بریلی، مراد آباد میں کلکٹری، اور میرٹھ میں فوجداری کی سررشتہ داری نیز ضلع بلند شہر میں تحصیل داری کے فرائض حسن و خوش اسلوبی سے انجام دے کر پنشن یاب ہوئے اور خانہ نشینی اختیار کر لی۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ایام میں سکندر آباد ضلع بلند شہر میں تحصیل داری کر رہے تھے۔ اتفاقاً مرزا نصیر الدین محمد علیؔ نبیرہ مولوی عبدالقادر غمگینؔ، رام پوری بھی انہیں دنوں میں اُدھر جا نکلے۔ اور منشی اصغر علی سے ملاقی ہوئے وہ لکھتے ہیں!

"منشی اصغر علی تحصیل دار سکندر آباد کو جو گڑھ مکتیشر کے ساکن اور میرے والد کے دوست تھے میں نے دیکھا میں خوش ہوا۔ ساٹھ روپے میں نے اُن سے قرض لئے اور خرچ میں لایا۔ اور جنوری ۱۸۵۸ء سے فروری ۱۸۵۹ء تک سکندر آباد میں رہا۔"

منشی اصغر علی بڑے خوش مزاج و خوش اختلاط تھے۔ سوانح عمری مولوی غلام محمد خاں جھجری کے مصنف نے لکھا ہے!

"مغفور (منشی اصغر علی) قصبۂ بچھرایونی ضلع مراد آباد کے رہنے

والے تھے ضلع میرٹھ میں سررشتہ داری کرتے تھے نہایت خلیق اور
بامروت شخص تھے۔ ان کے مکان پر رات کے وقت احباب کا
جلسہ رہا کرتا تھا!"

مولوی حامد حسن قادری مرحوم نے ایک مضمون جو رسالہ عالمگیر لاہور میں چھپا تھا منشی اصغر علی کے بارے میں لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ غدر سے قبل اپنے ضلع میں تحصیل دار تھے۔ غدر کے بعد بھی اسی عہدے پر رہے اور پنشن پائی۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد اول درجے کے آنریری مجسٹریٹ رہے۔ اردو میں مفتوںؔ اور فارسی میں مشفقیؔ تخلص کرتے تھے۔ تضمین اور تخمیس میں خاص مہارت حاصل کی تھی۔ مصحفی سے تلمذ تھا۔

لیکن ان کے معاصر منشی احمد حسین سحر نے لکھا ہے کہ "ان کو تلمذ خواجہ محمد جعفر مخمور سے تھا۔ جو مصحفی کے ایک باکمال شاگرد تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتوںؔ ابتدا میں مصحفی کے شاگرد رہے ہوں گے اور ان کے انتقال ۱۲۴۰ھ کے بعد مخمورؔ کے شاگرد ہو گئے ہوں گے۔ ان کے دونوں تخلص مشفقیؔ و مفتوںؔ بھی مصحفی و مخمور کے انتساب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سحر اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"منشی اصغر علی سررشتہ دار عدالت فوجداری ضلع میرٹھ است۔
بیشتر بہ محکمہ کمشنری بریلی بہ عہدۂ منشی گری ممتاز بودہ از فقیر
اتحاد بہ مرتبہ داشت"

"کمتر بہ فکر شعر می پرداز دو آنچہ می گوید ........ بہ مرتبۂ کمال"

"خوش مزاج و خوش اختلاط واقع شدہ"

مفتون نے حسب تحقیق مولوی حامد حسن قادری ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ کلام کا انداز یہ ہے ؎

رچ گیا عشق یہ رگ رگ میں ترے گیسو کا ۔۔۔ زلف سے بھی ہے سیہ رنگ مرے لوہو کا
بس کہ آنکھوں میں تصورِ نگہ تیز کا ہے ۔۔۔ ٹکڑے ہو جاتا ہے ہر قطرہ مرے آنسو کا

---

کیا کرے آلائشِ دنیا سے عاقل بھر کے ہاتھ ۔۔۔ جب سکندر ہی گیا دنیا سے خالی کر کے ہاتھ
ہم نہ چھوڑینگے کبھی تم لاکھ مارو ہاتھ پاؤں ۔۔۔ ہمنے پائے ہیں بڑی مشکل سے یہ مرمر کے ہاتھ
دیکھئے اُس سنگدل کے ہاتھ سے کیونکہ بچے ۔۔۔ آگیا ہے فی المثل اب تو تلے پتھر کے ہاتھ

---

کچھ تو مٹھاس آپ کے تیرِ نظر میں ہے ۔۔۔ ورنہ نزاع کیوں مرے قلب و جگر میں ہے

---

مخمس فارسی

بس کہ دائم بودمے از زہد و تقویٰ در خروش ۔۔۔ از حدیثِ مطرب و مینا و مے بودم خموش
چوں گذارم شد قضا را از سوئے میخانہ دوش ۔۔۔ مست گشتم از دو چشم ساقیٔ پیمانہ نوش
الفراق اے ننگ و ناموس الوداع اے عقل و ہوش

وے کہ بختِ تیرہ ام برگشت از برگشتگی ۔۔۔ شد نصیبِ من قضا را وصل آں سروِ سہی
از ہجوم مستی و دیوانگیٔ و بے خودی ۔۔۔ گفتمش اے جانِ من ہم جان و ہم تن خود توئی
گفت فی الواقع ولے در سترِ ایں اسرار کوش

تا رخِ آں پری رو چشمِ دل وا کردہ ام ۔۔۔ خویش را برباد، در سیلِ غم او داشتم
زاہدا از من چہ می پرسی ز دین و مذہبم ۔۔۔ زہد و تقویٰ را فگندم زیرِ پائے آں صنم
مذہبم عشق است و رندی، مشربم جوش و خروش

آں کہ حسن روئے او از ماہ باشد خوش تریں ۔۔۔ نیک بر بود است ما را از طریقِ رسم و دیں
حالِ زار خود چہ گویم با شما اے ہم نشیں ۔۔۔ اے . . . . . سبحہ خواں مسجد نشیں

هستم اکنوں بت پرست و کافر و زنّار پوش

کردہ ام مفتون تا بہ روئے ساقیٔ چشم باز ... مست و بے خود گشتہ ام، ہم بیخبر از جملہ راز
وائے بر دینم کہ با ایں کثرت صوم و نماز ... بر سرِ میخانہ نشستم بصد عجز و نیاز
گشتہ ام از بہر یک دو جام مے طاعت فروش

---

بہار بے خزاں ص۵۰ ۔ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۲۸ء ۔ سوانح مولوی غلام محمد خاں جھجھری
شجرۃ الانساب قلمی مملوکہ پروفیسر محمد ایوب قادری ۔

---

## مرزا ابراہیم بیگ مقتول

ان کے والد کا نام مرزا محمد علی بیگ تھا۔ بزرگ صفاہان کے رہنے والے اور عام طور پر قدیمی مرزایانِ دختر میں شامل تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مقتول کے بزرگوں میں سے کون ہندوستان آیا اور ابتدا میں کہاں قیام کیا۔ البتہ ان کی پیدائش اور نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ شروع شروع میں انشاء نگاری کی طرف توجہ رہی اور اس صنف میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اسی کے ساتھ کلام کے نیک و بد سمجھنے کی ایسی اہلیت پیدا ہو گئی کہ معاصرین کے نقد و تبصرہ پر محاکمہ کر سکتے تھے ۔۔۔ آخر موزونیٔ طبع کے اقتضا سے کبھی کبھی اردو اشعار بھی کہنے لگے اور جو کچھ کہا اس میں شیخ مصحفی سے اصلاح لی ۔۔ کلام میں شیرینی اور نمکینی موجود ہے۔

دہلی میں ایک زن بازاری تھی جو زینت تخلص کرتی تھی یہ مقطع اُسی کا ہے ؎

شبِ مہتاب میں تا صبح زینت  خیالِ ماہ رو ہے اور میں ہوں

مقتول کے اس زینت کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے جب وہ ترکِ دہلی کر کے لکھنؤ جانے لگے تو وفا آشنا زینت بھی اپنے دہلی کے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر ان کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی۔ مقتول خوش قسمت تھے کہ ان کو ایسی باوفا محبوبہ نصیب ہوئی ورنہ شاہدانِ بازاری میں یہ جوہر بہت کمیاب ہے۔

مقتول کے دہلی سے لکھنؤ کے آنے کا وقت کسی تذکرے سے دستیاب نہیں ہوا، اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کب اور کہاں وفات پائی مختلف تذکروں سے جو کلام دست یاب ہو سکا اُسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں  گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں
نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں  ہم اب آشیانہ جُدا باندھتے ہیں
میں یہاں خون روتا ہوں ہاتھوں سے اُنکے  جو پاؤں میں اُس کے حنا باندھتے ہیں
جفا کھینچیاں گے پر نہ ہاریں گے جی کو  یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں
گرہ دے کے سر پر جو بالوں کا جوڑا  یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں

ق

پر اک تار میں اُس کے دلہائے عشاق[1]  بہم جمع کر کے بلا باندھتے ہیں
میاں حالِ مقتول دیکھا نہیں کیا  کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں

---

دیکھا ہو جس نے اُس بتِ کافر کی گات کو  آوے نہ فرشِ گل پہ اُسے نیند رات کو
رنگِ شفق کی خاک میں مل جائے سب بہار  جس دم وہ کھولے اپنے حنا بستہ ہات کو
یا تو ہم اُس سے آٹھ پہر ہم کلام تھے  یا اب غضب ہے یہ کہ ترستے ہیں بات کو

---

[1] خوش معرکہ میں "عاشق" درج ہے۔

مقتول مصحفی سے ہوا ہے مجھے یہ فیض | حق دیدہ گاہ جگ میں رکھے اس کی ذات کو
مطلب رہا نہ کچھ ہمیں دیر و حرم کے ساتھ | اٹکا ہے دل اک ایسے ہی کافر صنم کے ساتھ
کل گھر سے جو وے سادی پوشاک پہن نکلے | سو طرح کے اس میں بھی بے ساختہ پن نکلے

---

تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۲۲ — مجموعۂ نغز حصہ دوم ص ۲۰۸
عمدۂ منتخبہ ص ۷۰ — خوش معرکۂ زیبا جلد دوم ص ۳۰
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۱۵۴ — گلشن بے خار ص ۹۳، ۱۸۶

---

## ملتمس

جہان آباد ضلع فتح پور کے رہنے والے اپنے زمانے کے جید عالم و شاعر تھے۔ راقم سطور نے پہلی مرتبہ ان کا نام مولانا حسرت موہانی کی اس فہرست میں بہ سلسلۂ تلامذۂ مصحفی دیکھا تھا جو مرحوم نے تذکرۂ شعرا کے لئے مرتب کی تھی۔ ان کا نام محمود علی خاں نے میر مہدی علی لکھا ہے۔

ملتمس مدت تک سرکاری عہدوں پر فائز رہے تھے، اور آخر عمر میں ترک ملازمت کر کے کان پور میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ محمود علی خاں لکھتے ہیں:

"میر صاحب (میر طاہر فرخ آبادی) کے والد (میر اطہر علی اطہر) کے حقیقی نانا حکیم مہدی علی جہان آبادی سررشتہ داری کے سلسلے میں کان پور میں مقیم تھے فارسی کے شاعر تھے اور ملتمس تخلص کرتے تھے۔ ان کے ہاں ہر ماہ زبردست مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک مصرع طرح فارسی کا اور ایک اردو کا رکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی شیخ امام بخش ناسخ بھی تشریف

لاتے تھے۔ آپ کی موجودگی میں مشاعرے اور بھی بارونق ہو جاتے تھے۔"

ملتمس کی شاگردی کے سلسلے میں سحر کاکوروی کے اس بیان سے کہ وہ آغا خانی نوازش کے شاگرد تھے خفیف سا احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید وہ مصحفی کے شاگرد نہ ہوں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے راوی مولانا حسرت ہیں جو خود کان پور میں تھے جہاں ملتمس نے آخری عمر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہ میر طاہر موہانی فرخ آبادی کے ہم وطن اور معاصر بھی تھے تو یہ احتمال کوئی وزن نہیں رکھتا۔ پھر خود ملتمس تخلص بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ منتظر کی طرح مصحفی کے شاگرد تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ مصحفی کی وفات کے بعد شاید نوازش سے اصلاح لینے لگے ہوں۔

ملتمس بڑے عالم فاضل بزرگ، نظم و نثر اور تمام علوم ادب میں استاد یگانہ تھے۔ سید الہ آبادی نے ان کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"منشی بلاغت نشان مہدی شعرائے آخر زمان مولوی محمد مہدی[1] سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اصلاً از کوڑہ جہان آباد است از مضافات کان پور: جامع علوم معقول و منقول، شاعر بے بدل و در نثر نویسی عدیم المثل۔ لطیفہ گو و بذلہ سنج معنی یاب طوطی خوش دہان ہندوستان است و بلبل غزلخوان ایں گلستان۔ ہنگام ورود فقیر بہ تقریبے کہ در کوڑہ وارد شدہ و قریب یک سال دراں بقعہ شریفہ ماندہ چوں با جدّ امجدم شاہ محمد اجمل قدس سرہٗ غائبانہ مراسلات داشت، الطاف بزرگانہ بیش از بیش بحال ایں دلریش مبذول فرمود گاہ گاہے بہ فرودگاہ ایں ہوا خواہ تشریف

---

[1] ان کا نام حسرت مرحوم نے میر محمد مہدی لکھا ہے اور محمود علی نے میر مہدی علی

می آورد و فقیر نیز بخدمتش مستفید می شدم باز از گردش فلکی بوطن خود رسیدم کہ ناگہاں ایشاں در اوائل ماہ شعبان ۱۲۵۷ھ در الہ آباد تشریف آوردہ در بقعۂ جدم رحمۃ اللہ علیہ فرود آمدند، محبتہائے قدیمانہ را باز تازہ کردند، فقیر مثنوی "مسلک جواہر" خود را برائے ملاحظہ بخدمت ایشاں گزرانیدم، چند جا دخل معقول کردند و بسیار پسند نمودند"

ملتمس بڑے خوش اخلاق اور کثیر الاحباب تھے۔ شاہ اجمل الہ آبادی کے ساتھ خط و کتابت کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ مصحفی کے ایک اور فارسی گو شاگرد شاہ غلام مینا ساحر کاکوروی بھی ان کے گہرے دوست تھے۔ ساحر کے کلیات میں چند مکتوبات ایسے ملتے ہیں جو ملتمس کے نام ہیں۔ اور جن سے ایک دوسرے کے پاس تبادلۂ کلام و نگارشات کا پتا چلتا ہے۔

ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ ملتمس کا انتقال کب ہوا لیکن وہ ۱۸۵۷ء کے بعد تک ضرور بقید حیات تھے کیونکہ ان برسوں میں "کارنامہ" لکھنؤ کے صفحات میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔

ملتمس کے آبا و اجداد کے بارے میں تاریخ آئینہ اودھ کے اوراق الٹ پلٹ کئے گئے لیکن کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی حالاں کہ اس تاریخ میں اودھ کے تقریباً تمام خاندان سادات آ گئے ہیں۔ ملتمس کے اعقاب میں تین لڑکے اور ایک لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے۔ محمود علی خاں نے ان کے منجھلے لڑکے کا نام حکیم محتشم علی لکھا ہے جو شاعر بھی تھے اور محتشم تخلص کرتے تھے۔ بڑے اور چھوٹے لڑکے کے نام کا پتا نہ چل سکا۔ ان لڑکوں کے سوا ایک لڑکی بھی تھی، اس لڑکی کا عقد میر مظہر علی زار[1] کے ساتھ ہوا تھا۔ زار کے لڑکے میر

---

[1] حاشیہ صہ ۱۴۱ پر ملاحظہ فرمایئے۔

اطہر علی اطہر موہانی کان پوری جو ملتمس کے نواسے ہوتے تھے کامیاب شاعر اور بہت اچھے خوش نویس تھے یہ مرزا خانی نوازش کے شاگرد تھے۔ اطہر کا کلام رسالہ معیار لکھنؤ دسمبر ۱۹۰۹ء اور رسالہ نیرنگ رام پور ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا ہے اطہر کے لڑکے میر طاہر علی طاہر تھے جو فرخ آباد میں مقیم ہو گئے تھے اور امیر و داغ و جلال کے خوش فکر معاصرین میں شامل تھے۔

ملتمس کی تصنیفات میں کوئی مستقل کتاب نگاہ سے نہیں گزری البتہ ان کی ایک بیاض مولانا حسرت کے پاس تھی جس سے کچھ اقتباسات رسالہ اردوئے معلیٰ میں شائع ہوئے تھے۔

محمود علی خاں لکھتے ہیں: کہ مہدی حسن مخلص کے مطبوعہ دیوان میں اطہر کی دو غزلوں کی تضمینیں ہیں۔

ملتمس صاحب تلامذہ بھی تھے لیکن ان کے صرف ایک شاگرد شیخ غلام سعد مجروح ابن شیخ فضل اللہ ساکن جاجمؤ کا ذکر صبح گلشن ص ۳۶۵ میں ہے یہ فارسی اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ ملتمس کا کلام یہ ہے۔

دھو دھا کے اس نے لاش مری خوں بہا دیا — گویا اسی بہانے مرا خوں بہا دیا
خطا نے ترے ہی خضر کو آب بقا دیا — نام مسیح کو ترے لب نے جلا دیا

---

(حاشیہ صفحہ ۳۱۳) میر مظہر علی زار رضوی سید تھے ان کے بزرگ نیشاپور سے ہندوستان آئے تھے اور نواب وزیر الممالک کے متوسل ہو کر قصبہ موہان ضلع اناؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ زار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فن تیر اندازی اور بانک سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ انگریزی حکومت میں ملازمت کی وجہ سے کان پور آئے اور نواب گنج میں جہاں غدر سے پہلے کچہریاں اور سرکاری دفاتر تھے مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اب تیری بے حیائی کا مانع رہا ہے کون  
پردہ تھا اک حجاب کا وہ بھی اُٹھا دیا

کی عشق نے ہزاروں کی مطلب برآریاں  
ہم کو دیا تو یہ دل بے مدعا دیا

برگشتگی نے ہم کو سرِ راہِ انتظار  
نقشِ قدم کی طرح بھر آخر بٹھا دیا

دامن کشاں چلے ہیں صبا باغ دہر سے  
ہم کو نہ روک ہم نے ترا کیا لیا دیا

لے چل جدھر کو چاہے مجھے مثل بوئے گُل  
میں نے تو اختیار تجھے اے صبا دیا

ہوں میں شہید دستِ نگارین یار کا  
جس نے کہ خوں کو رُتبۂ رنگِ حنا دیا

بوسہ جو اُس کا ہم نے لیا وقت میکشی  
اس بے تکلفی نے تو اور ہی مزا دیا

میں اور ترا خیال کہ مِل بے جذبِ شوق  
تنکے کو جس نے جاذبۂ کہربا دیا

ہوں گے وہ میرے رنگِ کدورت سے آشنا  
دل جن کو حق نے آئنہ ساں پُر صفا دیا

جتنا کہ تو وفا و مروّت سے دُور ہے  
اتنا مجھے وفاؤں نے پاسِ وفا دیا

جوہر جو آئینے کے کُھلیں عیب ہو نمود  
اظہار نے ہنر نے ہنر کو چھپا دیا

گُل جیسے کِھلکھلانے سے ہوتا ہے مضمحل  
ہنسنے نے ملتمس یہ ہمیں تیرے رُلا دیا

---

تا بمقدور مجھے ضبطِ نفس ہے ہمدم  
سانس کے ساتھ ہی جوں شمع پگھل جاؤنگا

احتیاج حرکت کیا ہے کہ مانند سپند  
گرم کرنے دو جگہ آپ اُچھل جاؤں گا

ہو چکا کام اگر بہرِ عیادت آجائے  
تو کوئی دم کے لئے اور سنبھل جاؤں گا

دیکھتے کیا ہو، خبر لیجیو کہ مانندِ نگاہ  
ہے یہ نزدیک کہ اب دور نکل جاؤں گا

میر و مرزا تو ہوئے سوز کے شاگرد تو ہیں  
ملتمس ان کو دکھانے یہ غزل جاؤں گا

---

چمن دہر میں بے برگ و نوائی اچھی  
نغمہ سنجی سے یہاں نالہ سرائی اچھی

اس میں اپنا نظر آتا ہے رُخ، اس میں رُخِ یار  
آئینے سے تو کہیں دل کی صفائی اچھی

میں اگر منہ سے کہوں اُسکو بُرا، کافر ہوں — جس کی صورت کو کہے ساری خدائی اچھی
دل[1] کو اپنے جو لگے خوب وہی اچھی ہے — ورنہ بیزار سے ہو ساری خدائی اچھی
ہے حقیقت میں وہ آزاد جو پابند رہے — یوں گرفتاری سے ظاہر میں رہائی اچھی
دولت عشق اُسے ملتی ہے دنیا میں دلا — جس کے مقسوم میں لکھی ہو کمائی اچھی
کیوں[2] کہ ہووے نہ وہ انگشت نما دنیا میں — اُنگلیاں اچھی ہیں ہاتھ اچھے کلائی اچھی
آپ کو سب سے بُرا سمجھے ہے اور اس کے سوا — ملتمس میں تو کوئی بات نہ پائی اچھی

## کلام فارسی

کُشتی چناں ز لطف کہ از رشکِ خویشتن — گُشتم ہزار بسمل در خوں تپیدہ را

از عمر بسے نماند ما را — بیش از نفسے نماند ما را
چوں شعلہ ز آہ خود دمیدم — طاقت نفسے نماند ما را
از بہر نشانِ رفتگاں ہا — جز دل جرسے نماند ما را
شد رہبر ملتمس فغانی — چوں ملتمسے نماند ما را

بر دوش آویختی زلفِ رسا را — فگندی بر سرم بارِ بلا را
ز مرگم می پسندنے حیاتم — نمیدانم چہ شد یارب قضا را

برنگ غنچہ زبانم تہ زبان من است — خموشیم گرد خاطر فغاں من است
کشاز جنبش بہائے شکریں کامم — کہ بند در گرو بوسہ دہان من است

دامانِ موئے یار چو بادِ صبا گرفت — رنگِ رُخِ بہار شکست و ہوا گرفت

---

[1] اپنے دل کو جو لگے خوب (بہار بے خزاں)
[2] ہووے وہ کیونکہ نہ انگشت نما (بہار بے خزاں)

امشب از تنہائیم اے شمع بزم دیگراں | ایں کہ می سازد کہ بسوزم شمع ایوان من است
آنکہ درماں را بجاں آورد، درد عاشقی است | واں کہ جانہا را بدرد آورد، درمانِ من است

---

شب ملتمس از سوزِ غم بیکسئ من | تنہا غم جانانہ چو شمعے بسرم سوخت

---

از راہِ ادب پیش تو آہے نتواں کرد | گاہے نتواں کرد نگاہے نتواں کرد
انصاف نباشد کہ لب خندہ کشائی | گر گریہ بہ احوال تباہے نتواں کرد

---

میزنم جام غم وزہرے بہ مینا می کنم | وز نگاہِ گرم خونِ صد تمنا می کنم
باش با من ساعتے سرگرم افغاں ملتمس | کز برائش نامۂ دردِ تو املا می کنم

---

دردمِ نزع، چہ جاں در قالبم جا کردۂ | بے تکلف جانِ من کارِ مسیحا کردۂ
چاکِ رسوائی بجیب غنچہ می دوزد صبا | تا ز شوخی در چمن بندِ قبا وا کردۂ

---

اشارۂ مژہ، سوئے دل و جگر کردی | سفارشِ رگ جانم بہ نیشتر کردی
سوالِ ملتمسِ ما، طوالتے دارد | گرہ بزلف زدہ، قصہ مختصر کردی

---

مولوی سراج الحسن موہانی منصف جہان آباد نے ملتمس کو خمیرۂ تمباکو روانہ کیا تو انہوں نے جواب میں شکریے کے طور پر یہ رباعی انشا کر کے بھیج دی ؎

نے لطف بیاں کہ مدح خوانِ تو شوم | نے تاب و تواں کہ ہمزبانِ تو شوم
لطفم کر دی خمیرۂ تمباکو | خواہم چو نے دم کشانِ تو شوم

---

رسالہ کارنامہ لکھنؤ جلد ۱ ص ۵۰، ۵۱ ۔ تذکرہ خازن الشعرا قلمی
بہار بے خزاں ص ۴۸ و ص ۱۲۶ ۔ صبح گلشن ص ۵۴۴
رسالہ اردوئے معلی علی گڑھ ۱۹۰۶ء ۔ رسالہ اردو، اپریل ۱۹۲۸ء ص ۲۲۰

---

# شیخ نور الاسلام منتظر

کاکوری ضلع لکھنؤ کے دو بزرگ شاہ محمد عاقل سبز پوش اور شاہ محمد خلیل تھے دونوں حقیقی بھائی تھے ان میں شاہ محمد عاقل بڑے تھے اور شاہ محمد خلیل چھوٹے، شاہ محمد عاقل کا ذکر مولوی علی حیدر قلندر نے ان الفاظ میں کیا ہے :

"یہ قادری الطریقت چشتی مشرب تھے۔ بیعت و اجازت شاہ ہیبت اللہ قادری جونپوری سے تھی حسب الحکم اپنے مرشد کے نقاب پوش رہا کرتے تھے۔ بعد خلافت انہوں نے ان کو صاحب جلال برقع پوش کا لقب عطا کیا تھا۔ سبز لباس پہنتے تھے اسی وجہ سے سبز پوش مشہور تھے۔ لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ وہیں وفات پائی۔ تکیہ وزیر باغ میں مزار ہے۔ مشاہیر کاکوری ص ۳۵۲

شاہ محمد خلیل کے دو لڑکے تھے۔ بڑے شاہ فیض علی جو عرف عام میں پیر غلام کہلاتے تھے اور چھوٹے شاہ بدر علی۔ شاہ بدر علی بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ صاحب تاریخ لکھنؤ لکھتے ہیں :

" پاٹا نالے پر اگلے زمانے کی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو بدے شاہ کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کے بانی کا اصلی نام بدر علی شاہ تھا یہ دار المصنفین لکھنؤ سے گزر کر بائیں ہاتھ کی گلی میں ہے (ص ۱۶۳)

اور ان کے نام سے ایک تکیہ بھی ہے جس کے بارے میں اسی تاریخ لکھنؤ میں ہے

" (یہ تکیہ) تال کٹورے سے کان پور کی راہ پر پڑتا ہے شہر کے طول و عرض اور قدیم حدود آبادی کے تحت اس مقام کا نام نظر آتا ہے (ص ۱۸۹)"

شاہ بدر علی شاہ محمد عاقل سبزپوش کے بھتیجے بھی تھے اور ان کے خلیفہ بھی (مولوی علی حیدر نے اپنی تاریخ میں انہیں بجا طور پر قرار دیا ہے۔ (مشاہیر کاکوری صفحہ ۳۵۳) ان کے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ صاحب تاریخ شاہ جہان پور نے ان کے ایک خلیفہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کا نام غلام عبدالقادر قادری تھا۔ یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے (ص۹۲)

شاہ فیض علی کے لڑکے نورالاسلام تھے جو منتظرؔ تخلص کرتے تھے اور جنہوں نے نزاع مصحفیؔ و انشاؔ کے موقع پہ اپنے استاد بھائی مرزا حیدر علی گرمؔ کی معیت میں اپنے استاد کا ایسا اندفاع کیا تھا کہ ادب کی تاریخوں میں محفوظ ہو کر رہ گیا ہے تعجب ہے کہ مولوی حیدر نے مشاہیر کاکوری میں اپنے زمانے تک قابل ذکر مقامی ارباب کمال کا ذکر کیا ہے مگر ان کی تاریخ کے صفحات منتظرؔ جیسے جوانمرد کے حالات سے خالی رہ گئے جو دوسروں کی طرح اپنے وطن عزیز کے لئے باعث ناموری تھا باعث ندامت نہ تھا۔

منتظرؔ بڑے صلاحیت شعار، وارستہ مزاج اور شوریدہ سر جوان تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۱۸۲ھ ہے۔ درسیات فارسی کی تکمیل کی تھی اور عربی سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ دس بارہ سال کی عمر ہی سے غزل گوئی کی طرف طبیعت راغب ہو گئی تھی اس پہ طرّہ یہ کہ جوانی کے آغاز نے کسی محبوب دل فریب کی محبت میں گرفتار کرا دیا پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے حسن محبوب کی دل فریبی تصور میں رہتی اور دیوانوں کی طرح فکر سخن میں مصروف نظر آتے۔ مصحفیؔ دہلی سے لکھنؤ پہنچے تو منتظرؔ نے فطری مناسبت کی بنا پر ان کی طرف رجوع کیا۔ اور مرتے دم تک استاد کے دامن عاطفت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا بعض اساتذہ وقت ان کی ذہانت طبع کے باعث انہیں اپنی طرف کھینچے

کی کوشش میں کمی نہ کرتے تھے مگر ان کی استاد پرستی میں کسی قسم کا فرق نہ آیا اس راسخ الاعتقادی کے نتیجے میں وہ سخن گوئی کے اس مقام تک پہنچ گئے کہ ان کا کلام مصحفی کے کلام کی بلندی تک جا پہنچا مصحفی کی نظر میں اپنے اس ہونہار شاگرد کی کس قدر عزت تھی اس کا اندازہ تذکرہ ہندی کی اس عبارت سے کیا جا سکتا ہے۔

از ہشت سال برائے مشورۂ کلام خویش پیش فقیر آمد و شد دارد۔ ہرگز دریں عرصہ باوجود کم ملاقاتی و فصل سال و ماہ مثل دیگراں رجوع بہ طرف دیگرے نہ کردہ اگرچہ بعض اشخاص ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ اورا بہ طریقے بہ حلقۂ بیعت خویش کنند ہرگز التفات نہ کردہ تا آں کہ بہ برکت راسخ الاعتقادی خویش بمقام والائے شاعری رسیدہ حالا برائے کلہ شکنی آنہا برابر من موجود است و کلامش از غایت لطف و صفا ہیچ از کلام مولف در پایہ کمی نیست غرض کہ از شاگردان رشید ایں خاکسار بے مقدار است۔

منتظر کو بھی اپنے استاد سے والہانہ محبت تھی اور اس محبت کا اظہار کئی موقعوں پر کیا گیا ہے اس خصوص میں چند مقطعے پیش کئے جاتے ہیں ؎

آج جلسہ مصحفی صاحب کے گھر ہے منتظر — مجلس رنداں میں چلئے شعر خوانی کیجئے

ہے منتظر استاد کے صدقے کی زمیں یہ — کچھ اور بھی شعر اس میں سنا میں ترے صدقے

منتظر پیروی حضرت استاد تو کر — تا کہ ہر شعر ترا قابل تحسین ہووے

یہ سچ تو یہ ہے کہ سو جہاں سے حاضر و غائب — میں مصحفی کا ہوں شاگرد، کوئی کچھ سمجھے

عشق خود ایک تپ محرقہ ہے جس کی گرمی دل و دماغ کو خاکستر بنا

دیتی ہے آخر جس کے لئے وہ خود بھی ایک جگہ کہہ گئے ہیں ؎

ہے عشق ہر مرض کوئی جا ہے منتظرؔ کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

آخر اس غریب کا بھی یہی حشر ہوا ابھی وہ تیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۲۱۷ھ میں سل میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ گئے۔ مصحفیؔ کو اپنے اس باوفا اور جاں نثار شاگرد کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا جس کا اظہار اُن قطعات تاریخ سے ہوتا ہے جو انہوں نے منتظرؔ کے سانحۂ وفات پر لکھے۔ ان میں سے تین قطعے درج کئے جاتے ہیں۔

سخن سنجے، فصیحے، منتظرؔ نام چو در کنجِ لحد کرد از قضا جائے
زہاتف مصحفیؔ پرسید سالش بگفتا "شاعرِ شیریں زباں ہائے"

۱۲۱۷ھ

---

چوں منتظرِ فصیحِ دوراں بگذشت ازیں خرابہ آباد
معنی طلباں کہ از فراقش گشتند بسے حزین و ناشاد
تاریخ وفاتش از سرِ درد گفتند "سخن زاوج افتاد"

۴+۱۲۱۳=۱۲۱۷ھ

---

از مجلسِ دوستان یکدل ناگہ چو نہفت منتظرؔ رو
ہاتف از غیب گفت، بے داد پیدا نشود چنیں سخن گو

۱۲۲۶-۹=۱۲۱۷ھ

منتظرؔ فارغ الاصلاح ہو چکے تو اپنے زمانے کے نوآموزوں کی اصلاح کلام کا فریضہ ادا کرنے لگے تھے۔ ان کے ایک شاگرد محمد بیگ بے خبرؔ خیرآبادی کا ذکر کئی تذکروں میں آیا ہے۔ کلیات منتظرؔ کا واحد نسخہ دارالعلوم ندوہ میں ہے یہ (۲۳۵) صفحات میں ختم ہوا ہے۔ اور ہر صفحہ میں دس اشعار ہیں ابتدا

میں غزلیات بقید ردیف لکھی گئی ہیں۔ پھر چار ورق فردیات کے ہیں۔ تین اوراق میں رباعیات ہیں۔ چار مثنویاں ہیں۔ ان میں سے ایک متا طوائف کی ہجو میں ہے، دوسری نامکمل مثنوی مرزا علی حسن کی ہجو میں ہے، اور تیسری شاہ علی نام کے ایک شخص کی مذمت میں لکھی گئی ہے چوتھی مثنوی شکار نامہ ہے جس میں طوائفوں کے اس جھگڑے کا بیان ہے جو لشکر کے ساتھ ہوتا تھا۔ چند مخمس تفضل حسین خاں، کمال الدین، ایک لطف شیطان، بہاری لال اور انشاء اللہ خاں کی ہجو میں ہیں۔ اس کی کتابت ۱۲۳۹ھ میں ہوئی ہے۔

منتظر کی شاعرانہ استعداد کو تمام تذکرہ نویسوں نے تسلیم کیا ہے بعض کی رائے یہاں نقل جاتی ہے۔

عقل سلیم اور ذہن رسا کے مالک تھے۔ (تذکرہ عشقی)

صرف و نحو خوب جانتے تھے۔ (عمدہ منتخبہ)

ان کی تقریر نہایت دردناک اور بامزہ ہوتی تھی (دستور الفصاحت)

شعر خوب کہتے تھے۔ (سخن شعرا)

منتظر کے مزاج میں تیزی کے ساتھ انصاف کا مادّہ بھی تھا اس لئے انہوں نے اپنے معاصرین کی ناواجب تعلّیوں سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ ذوقی شاہ لکھنوی نے ایک مقطع میں میر تقی کی برابری کا دعویٰ کیا اور کہا ؎

یوں ریختہ کہنے کو دنیا میں ہزاروں ہیں
بدنام پر اے ذوقیؔ اک میر ہے اور میں ہوں

منتظر نے یہ شعر سنا تو فوراً کہا۔ ؎

ہیں منتظر و تنہا کس بات میں کم اُس سے
کہتا ہے غلط ذوقیؔ اک میر ہے اور میں ہوں

اسی طرح کسی معاصر شاعر نے سوداؔ کے بارے کوئی اہانت آمیز بات کہی تو انہیں ضبط نہ ہو سکا اور ایک شعر میں اس قسم کے شاعروں کو اس طرح ڈانٹا ؎

منتظرؔ ہے ان کے منہ میں خاک جو کم حوصلہ
دو غزل کہہ کر یہ کہتے ہیں کہ سودا گرد تھا

منتظرؔ کی خوش فکری و راست خیالی کا اندازہ اس شعر سے کیا جا سکتا ہے. جو زبان زد خاص و عام ہے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے منتظرؔ کے مندرجہ فوق شعر کو فسانۂ عجائب کے آغاز داستان میں لکھا ہے۔ یہ شعر مرزا غالبؔ کو بھی بہت پسند تھا وہ تفتہؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"رجب علی بیگ سرورؔ نے جو فسانۂ عجائب لکھا ہے آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزا دیتا ہے مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور "یاد رکھنا" فسانہ کے واسطے کتنا مناسب ہے."

سعادت خاں ناصرؔ کی تحقیق کے مطابق منتظرؔ نواب آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ-۱۲۱۲ھ) کی سرکار میں توپخانے کی خدمت پر مامور تھے۔ نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو چار مہینے نواب وزیر علی خاں تخت نشین رہے۔ بعد میں سر جان شور گورنر جنرل ہند نے خفیہ طور پر تفضل حسین خاں سے ساز باز کر کے پہلے انہیں معزول کرایا اور اس کے بعد قید کر دیا جہاں کس مپرسی کی حالت میں ۱۷ ، ۱۸ سال گزار کر انہوں نے جون ۱۸۱۷ء (م ۱۲۳۶ھ) میں بخار سے وفات پائی۔

منتظر ایک حساس طبیعت کے مالک تھے۔ تفضل حسین خاں کے اس طرز عمل سے وہ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی مذمت میں ۲۹ بند کا ایک قصیدہ تصنیف کیا۔ یہ بڑی دلیری کی بات تھی کیونکہ انہیں اس کے بعد بھی اسی شہر میں رہنا تھا جہاں تفضل حسین خاں حکومت وقت کے ذی اقتدار امرا میں شامل تھے۔

یہ مخمس بھی اُن کے کلیات میں موجود ہے اس کا مطلع یہ ہے ؎

یوں نائب وزیر بنا او نمک حرام — یوں جا فرنگیوں سے ملا او نمکحرام
آئی ذرا نہ تجھ کو حیا او نمک حرام — آقا سے اپنے کیا یہ کیا او نمک حرام
نازل ہو تجھ پہ قہر خدا او نمک حرام

اور آخری بند یہ ہے ؎

نواب وہ کہ خلق ہے جس کا محمدی — اس کی نکوئی اور نصلوا کی یہ بدی
لائی ہے رنگ ایک نیا تیرھویں صدی — کیا دیکھیں ان کے حق میں کرے قہر ایزدی
ہے جن کو یہ خطاب ملا او نمک حرام

نزاع انشا و مصحفی میں منتظر نے جو کردار ادا کیا اُسے درج کرنا باعث طوالت ہے۔ اس واقعہ کی غلط صحیح تفصیلات آب حیات۔ اور خوش معرکہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اب انتخاب کلام کی سیر کیجئے ؎

اُسی کی حمد کی خاطر ہوئی منہ میں زباں پیدا
کیا اک حرف کن ہی جس نے یہ کون و مکاں پیدا
نہ پہنچیں منزل عرفاں کو اُس کی عارفاں ہرگز
کریں گر خضر کے مانند عمر جاودانی پیدا

کعبۂ دل کو ڈھا دیا اے بُت — کچھ خدا کا نہ تجھ کو ڈر آیا
منتظر میں وہ نخل ہوں جس میں — غیر شعلہ نہ کچھ ثمر آیا

---

خفا ہم سے وہ بے سبب ہو گیا — غضب ہو گیا کیا غضب ہو گیا
میں آگے تو دیوانہ اتنا نہ تھا — خدا جانے کیا مجھ کو اب ہو گیا
یہ آئینہ رو دیکھے یاں منتظر — کہ دل اپنا رشکِ حلب ہو گیا

---

آہ ہم کس سے دردِ دل کہتے — کوئی دنیا میں اپنا یار بھی تھا
تم کو دیتے نہ جی تو کیا کرتے — دل پہ اپنا کچھ اختیار بھی تھا
تھا عجب رنگِ گلشنِ ہستی — ساتھ ہر گُل کے ایک خار بھی تھا

---

سرو زمیں میں گڑ گئے غنچوں نے سر جھکا دیا — خندۂ گُل جو دیکھ کر یار نے سر جھکا دیا

---

ہر دم خیالِ یار جو پیشِ نظر رہا — ہجراں میں بھی وصال ہمیں بیشتر رہا
گر یوں ہی منتظر سے خفا تم رہو گے تم — سُن لوگے ایک دن کہ وہ کچھ کھا کے مر رہا

---

چُست و چالاک چاہیئے رہنا — زندگانی کی سست ہے بنیاد
اُس کے قامت کے آگے یوں ہے سرو — جیسے بے قدر بندۂ آزاد
چشم ہے یا کہ ترکِ مست ہے یہ — نیزہ ہے یا کہ خنجرِ فولاد
بوالہوس منتظر کو کیا جانے — ہے وہ شخص اپنے کام کا استاد

---

آئے ہیں تیری گلی میں اک زمانا چھوڑ کر
جا دیں اب پیارے کہاں ہم یہ ٹھکانا چھوڑ کر
آرزو ہیں سجدے کے سر دے دے مارا منتظر
سر پہ کیا آفت ہوئی وہ آستانا چھوڑ کر

---

یوں لے گئی دل زلفِ سیہ فام لگا کر — جوں صید کو کھینچے ہے کوئی دام لگا کر

---

کیوں گردشِ دوراں کا نہ کیجے گلہ ہر روز ... پڑتا ہے نیا پاؤں میں اک آبلہ ہر روز
ہرگز نہ ہوا طے یہ بیابانِ محبت ... درپیش رہا مجھ کو نیا مرحلہ ہر روز
وحشت نے یہ گھیرا ہے کہ دیوانے کے تیرے ... پڑتا ہے نیا پاؤں میں ایک سلسلہ ہر روز

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ ... سُن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ
لاکھ صورت ہیں جلوہ گر ہم میں ... شکل آئینہ خانہ ہیں ہم لوگ
خلق سے ہو گئے ہیں بیگانے ... شاید اس کے یگانہ ہیں ہم لوگ
سب کے مخدوم ہیں وہ تیرے ... خادمِ آستانہ ہیں ہم لوگ
منتظر شکلِ بلبلِ دشتی
دشمنِ آشیانہ ہیں ہم لوگ

داغ اک تحفہ لے کے ہستی میں ... سوئے ملکِ عدم سدھارے ہم

لگی اس یار کی جب خاک پا ہاتھ ... تو ہم سمجھے کہ آئی کیمیا ہاتھ
عجب ڈھب سے بسر کی ہے شبِ غم ... کبھی سر پہ کبھی زانو پہ تھا ہاتھ
قیامت میں قیامت ہوگی برپا ... ترا جب ہوگا دامن اور مرا ہاتھ
دیا دل منتظر تو پاؤں پڑ کے ... ارے دیوانے اب ملتا ہے کیا ہاتھ

چاہت مرے دل کی آزما دیکھ ... ظالم کبھی تو بھی دل لگا دیکھ

طرفِ چمن نہ جا نہ سوئے لالہ زار دیکھ ... تو آپ باغِ حسن ہے، اپنی بہار دیکھ
ہے روزِ حشر دیکھنے کا شوق اگر تجھے ... اے منتظر تو اپنی شبِ انتظار دیکھ

جہاں سے ہم دلِ خانہ خراب لے کے چلے ... عدم کو ساتھ ہی اپنے، عذاب لے کے چلے
یہ بعزوشت میں تھی جائے راہ میں مارا ... وہاں سے خط کا جو قاصد جواب لے کے چلے

کچھ نہ پایا جب نثارِ عیدِ قرباں کے لئے ... لے چلے تب جاں بکف ہم نذرِ جاناں کے لئے
اے صبا یہ ہم صفیروں سے مرا کہیو سلام ... کوئی تڑپے ہے قفس میں سیرِ بستاں کے لئے

چاہت کی بات مجھ سے نہ دم دے کے پوچھئے
اپنے ہی جی سے آپ قسم دے کے پوچھئے

جب کہ اس کا نام لوں پہلے منہ سے نام خدا نکلتا ہے
منتظر مرد ہے فقیر مزاج سب کو دیتا دعا نکلتا ہے

---

تذکرۂ ہندی گویاں ص ۲۳۴ ۔ مجموعہ نغز حصہ دوم ص ۲۱۶
گلشن بے خار ص ۱۹۲ ۔ خوش معرکہ زیبا ج ۱۔ ص ۳۸۲
طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۸۹ ۔ سخن شعرا ص ۴۵۷
تذکرۂ عشقی ص ۲۶۰ ۔ عمدہ منتخبہ ص ۶۶۸
گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۹۸ ۔ دستور الفصاحت ص ۱۱۵
دیوان عزیب ص ۴۵۲

---

## لالہ موجی رام موجی

دیوان چھترپت کے صاحبزادے ۔ سانڈی ضلع ہردوئی کے ساکن اور کائستھوں کی شاخ سریواستو سے تعلق رکھتے تھے ۔ ۱۲۰۴ھ میں وطن میں پیدا ہوئے ۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی ۔ اور تمام عمر بہاء الدولہ امیر الملک نواب حسین علی خان بہادر ولد یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں والیٔ اودھ کی ملازمت میں گزاری ۔ شیخ محمد عیسیٰ تنہاؔ کی معرفت غلام ہمدانی مصحفیؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اُن کے اچھے شاگردوں میں شمار ہونے لگے ۔ فارسی اور اُردو ۔ دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے ۔ بہت پر گو تھے ۔ اُردو فارسی کے

سات دیوان ان سے یادگار ہیں۔

موجیؔ کے ساتھ معاصرانہ چشمک کا ایک واقعہ سعادت خاں ناصرؔ نے لکھا ہے اُسے اُنہیں کے الفاظ میں یہاں لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تذکرہ نگار موجیؔ کے یہ تین شعر ؂

گیا نہانے جو وہ بے نقاب تہہ آب — تو رنگِ رُخ سے کھلا اک گلاب تہہ آب

ہیں رو دیا پاس کی حالت میں تشنگی سے جب — تو آگئی وہیں موج سراب در تہہ آب

بہے ہیں دیدۂ گریاں سے اس طرح آنسو — رواں ہو چشمے سے جس طرح آب در تہہ آب

درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”یہ طرح مرزا جعفر صاحب کے مشاعرے کی تھی۔ مرزا حاجی قمرؔ اور میر مظفر حسین ضمیرؔ کو یہ منظور ہوا کہ موجی رام کو مرزا قتیلؔ کی زبان سے ذلت دلوائیے۔ مرزا صاحب نے سر مشاعرہ یہ اعتراض اُس پہ کئے کہ گُل کو گلاب کہنا غیر مستعمل اور چشمہ بیرون آب ہے اور سراب محض ریگستان ہے۔ ریگ سے اور موج سے کیا نسبت ۔“

مرزا صاحب نے سر مشاعرہ اُس پہ یہ اعتراض کئے۔ شیخ امام بخش ناسخؔ کو دلیری مرزا صاحب کی نہایت ناگوار گزری۔ موجی رام میاں مصحفیؔ کے پاس التجا لے گیا۔ میاں صاحب نے کہا۔ شاگرد کے واسطے آشنا سے بگڑنا نہ چاہئے۔ ایسے بہت بن سکتے ہیں۔ جب ناسخؔ نے سُنا کہ مصحفیؔ حمایت موجی کی نہیں کرتے۔ تو اُسے پاس بُلا بھیجا اور یہ سوال و جواب بند کاغذ پہ لکھ کر اُسے دیئے۔ دوسری صحبت میں سر مشاعرہ اُس نے پڑھے۔

”افصح الفصحا مرزا قتیل صاحب! آپ نے جو مجھ ہیچمدان کی غزل پر اعتراض کئے ہیں کہ گلاب بمعنی گُل گلاب مستعمل

نہیں اور اُردو میں نہیں آیا۔ ایسا کلام لایعنی آپ سا شاعر فخر زمانہ کہے بہت عجیب ہے۔ نہیں جانتے ہو کہ محاورہ اہل ہند میں "گلابی جاڑا" اُسے کہتے ہیں کہ موسم گلاب میں ہو اور گلابی رنگ کہ منسوب بہ گلاب ہو۔ قطع نظر میر محمد تقی کہ زبان ریختہ میں سہیم و عدیل نہیں رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

تازگی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مرزا مظہر جان جاناں فرماتے ہیں ؎

عالم ہے پسینہ کا اُس مست خواب پہ
پڑتی ہے اوس جیسے سحر کو گلاب پہ

میاں مصحفی :۔

سُرخ ہے مے سے وہ چشم نیمخواب نرگسی
یا یہ باغ حسن میں پھولا گلاب نرگسی

دیگر :

دلّی بھی طرفہ جا ہے کہ ہر اک گلی کے بیچ
بکتے ہیں کوڑی کوڑی کٹورے گلاب کے

آپ نے جو فرمایا ہے کہ "چشمہ بیرون آب ہے" فی الحقیقت سعدیؔ نے گلستاں میں غلطی فرمائی ہے۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل
چو پُر شد نہ شاید گزشتن بہ پیل

اور آپ نے جو کہا کہ سراب محض ریگستان ہے موج سے کیا نسبت ناصر علی کہتا ہے ؎

نمی دانم کُدا ہیں شہسوار آمد دریں وادی
کہ از صد جا گریباں خاک شد موج سرابش را

جواب آپ کے ہر اعتراض کا یہ ہے۔ زبان اُردو کے جاننے والے

فی زمانا میاں مصحفی اور انشاء اللہ خاں ہیں۔ آپ عبث دخل در معقولات دیتے ہیں۔ فارسی آپ کی البتہ مشہور اس کو اصفہانی جانیں زیادہ والسلام والاکرام"

اس واقعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول یہ کہ شیخ ناسخ کو اپنے ایک خواجہ تاش کی جانب سے دوسرے خواجہ تاش پر اعتراض کرانا اور اُس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ دوم یہ کہ مصحفی کی دوست نوازی اور تعلقات کے پاس و لحاظ کا ثبوت پہنچا کہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد کی صحیح طرف داری کر کے اپنے دیرینہ رفیق سے بگاڑ کرنے کو نامناسب سمجھا۔ تنیل کے اس طرزِ عمل کے باوجود موجی ان کے شاگرد قاضی محمد صادق اختر سے دوستی رکھتے تھے۔

ناصر نے اپنے تذکرے میں موجی کے ان شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ منشی دیا کرشن ریحان، لالہ رام دیال شباب لکھنوی، لالہ لالتا پرشاد مجرم برادر و شاگرد نواب محمد حسن خاں نیر اور لالہ لچھمی پرشاد واثق۔ سر لوا ستو لکھنوی ان میں ریحان صاحب دیوان بھی تھے اور شہرت یافتہ بھی۔

موجی کا کلام یہ ہے ؎

روئے صنم پہ کاکل پیچیدہ دیکھنا — خورشید حشر شام میں پوشیدہ دیکھنا
اس ضعف پر اُٹھا ہی لیا میں نے کوہ غم — اے عشق ہمت تن کاہیدہ دیکھنا

واں حنا بندی تھی اور زلف کو سلجھانا تھا — یاں پریشانی تھی اور خونِ جگر کھانا تھا

دلا کس منہ سے میں شکوہ کروں ان گلعذاروں کا — یہ ظالم اک نگاہ میں خون کرتے ہیں ہزاروں کا

تھے گرد سے بھرے جو غریب الوطن کے پاؤں
شبنم دھلا رہی ہے نسیم چمن کے پاؤں

آیا نہ ٹھیک بر میں ہمارے کوئی لباس

مرنے کے بعد بھی رہے باہر کفن کے پاؤں
کھولی جو اُس نے زلفِ گرہ گیر کی رسن
زاہد کے ہاتھ باندھ لئے، برہمن کے پاؤں
محشر کے دن وسیلہ شفاعت کا ہو مجھے
موجی جو ہاتھ آئیں حسینؓ و حسنؓ کے پاؤں

---

جو آہ گردنِ تاثیر کی کمند نہ ہو
کبھی وہ عاشقِ ناکام کے پسند نہ ہو

مرا صنم ہے وہ مہ وش کہ جس کے مجبر کا
بغیر خال رُخِ گُل رخاں پسند نہ ہو

ایسے عارض کے مقابل اے مہِ کامل نہ ہو
مہر کو جُز زردیِ رُو جس سے کچھ حاصل نہ ہو

کعبۂ دل کو مرے تو مت جلا اے سوزِ عشق
یہ مقامِ یار ہے، تجھ پہ بلا نازل نہ ہو

الفت نے کیا جان سے برباد ہمیں بھی
کیا دور کہیں لوگ جو فرہاد ہمیں بھی

انکار کریں عشق کا کس واسطے موجی
ہے الفتِ طفلاں پہ ہی زاد ہمیں بھی

پیشِ محمل اس لئے روتا چلا جاتا ہے قیس
تا نہ گردِ دشت، پائے ناقہ راں سے اُٹھ سکے

آوے جو صبا باغ میں گاہے ترے کُو سے
بُلبل کو ہو نفرت، گُلِ نوخیز کی بُو سے

کیا کہوں تجھ سے، جو حالت ترے بیمار کی ہے
تا دمِ مرگ تمنّا اُسے دیدار کی ہے

ہم ابرِ گریہ، صرصرِ نالہ سے بارہا
دریا کو دشت، دشت کو دریا بنا چکے

خط کو جو کھویا نامہ بر نے خوبیِ تقدیر ہے
یوں ہی تھا لکھا ہوا، اُس کی کیا تقصیر ہے

---

## فارسی

خنجر بکف چو آئنہ ابرو کماں گزشت
خلقے ز دل گزشت و جہانے ز جاں گزشت

بہرِ طوافِ کشتۂ تیغِ ادائے خویش
آں سرو ناز آمد و دامن کشاں گزشت

اے سنگدل ز رحم نگاہے بسوئے او
موجی ز شوق کوئے تو از خانماں گزشت

نسیم صبح شاید واز سر کوئے تو می آید | زہر گل در مشام جان من، بوئے تو می آید
ازاں بر طالع زلف رسایت رشکہا دارم | کہ تا از شانہ می اُفتد بہ پہلوئے تو می آید

فغاں کم کن، خمُش مومن، قیامت می شود برپا
صدائے صورِ اسرافیل از سوئے تو می آید

اے صبا سوئے قفس گاہے گزر می کردہ باش | بلبل شوریدہ را از گل خبر می کردہ باش
در ہوایت گفتمش چوں باد سرگرداں شدم | گفت تا خاکت نخورد خاکے بسر می کردہ باش
منّتِ ساقی مکش از بہر یک جام شراب | جام دل لبریز از خونِ جگر می کردہ باش

گرم جوشیہائے محبوباں بود نقشے بہ آب
مومنا زیں سرد مہراں الحذری کردہ باش

شُد دلِ دیوانہ من، رام ہندو زادۂ | کافرے آتش پرستے دیں بدنیا دادۂ

---

ریاض الفصحا ص ۳۰۴ | خوش معرکہ ۔ جلد اول ص ۵۱۴
سراپا سخن ص ۳۴۸ | صبح گلشن ص ۴۶۸

---

## شیخ مومن علی مومن

یہ بزرگوار امیٹھی ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ وطن ہی میں پیدا ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علمی کی۔ نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے لکھا ہے کہ شیخ الشعرا غلام ہمدانی مصحفی کے تلامذہ میں شامل تھے فارسی لکھتے تھے اور حق یہ ہے کہ شاعر عالی قدر تھے۔ صرف ایک مطلع اور تین اشعار کی ایک غزل دستیاب ہوئی۔ ان چار اشعار کے سوا نہ ان کا اور کلام دستیاب

ہوا، اور نہ تفصیلی حالات مل سکے ۔۔۔

نقش بر لوحۂ دل صورتِ دلبر دارم
من دریں آئنہ تصویر سکندر دارم

دل گم گشتہ باگم کردگی ہا بس کہ خو دارد
پریرو از من پروانہ عشق آرزو دارد

زبس آتش درون سینہ جا کرد از دم گرمم
مگر ہمچو کباب روئے آتش دیدہ خو دارد

حریفاں من دریں محفل چہ کوشم بہر سامانے
چراغ من چو شمع کشتہ مردن آرزو دارد

---

مدائح الشعرا ص

---

## میر شیر علی ناداں

مصحفی ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں کہ ناداں نے فیض آباد میں نشوونما پائی۔ لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے لڑکے نواب صفدر علی خاں کی سرکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائے شاعری میں جب زیادہ وقوف حاصل نہ تھا۔ شیخ محمد عیسیٰ تنہا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اسی مناسبت سے انہوں نے ناداں تخلص تجویز کیا۔ تنہا کی وفات، (۱۲۲۲ھ) کے بعد ان کا کلام اصلاح کے لیے مصحفی کے پاس آنے لگا۔ ریاض الفصحا کی تصنیف، (۱۲۲۱ھ؟ - ۱۲۳۶ھ) کے وقت ان کی عمر تیس ۳۰ سال کے قریب تھی۔

کلام یہ ہے

جب اُس کا مصر میں دیدارِ عام ہوتا ہے — تو ماہِ مصر بہ منّت غلام ہوتا ہے
رکھا ہے ہاتھ پہ میں نے بھی سر کو بسم اللہ — جو میرے قتل میں قاتل کا نام ہوتا ہے
نگاہِ شوق سے دیکھوں ہوں اسکے منہ کی طرف — کبھو جو ہاتھ میں ساقی کے جام ہوتا ہے
میں وہ اسیر ہوں جس کا بہ حسرتِ پرواز — پھڑک پھڑک کے قفس ہی میں کام ہوتا ہے

چمن میں جاتا ہوں ناداںؔ جو یادِ گیسو میں
تو عشق پیچہ مرے دل کو دام ہوتا ہے

---

غرفے سے جو اُس شوخ کی صورت نظر آئی — اک کوندسی بجلی کی مری جان پہ آئی
عاشق ترا روتا ہے ذرا چل کے خبر لے — یہ بات نہ کہنی تجھے اے نامہ بر آئی
میں کس کو دکھاؤں شبِ ہجراں کی درازی — بڑھتی ہی گئی یہ نہ قریب سحر آئی
تو حشر کے دن بھی دلِ کم بخت نہ چونکا — سرخاک پہ رکھتے تجھے نیند اس قدر آئی

سُنتے ہی رہے ہوش کسی کے نہ ٹھکانے
اُس شوخ کے آنے کی جو ناداںؔ خبر آئی

---

# شیخ امام بخش ناسخؔ

ناسخؔ کے تلمیذ مصحفیؔ یا شعرائے سلسلۂ مصحفیؔ ہونے کے بارے میں کچھ اصحاب شک وشبہ میں مبتلا ہیں ان میں ہمارے بعض اہلِ وطن بھی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں جب پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفرؔ مرحوم نے ناسخؔ کی ایک مثنوی مرتّب کی تو اس میں ناسخؔ کے شاگردِ مصحفیؔ ہونے کا ذکر تو درکنار شاگرد تنہا ہونا بھی تسلیم نہیں کیا۔ لکھتے ہیں :

"آغاز مشق شاعری میں محمد عیسیٰ تنہاؔ سے دوستانہ مشورہ کیا کرتے تھے ان سے تلمذ نہ تھا۔" [1]

اور کچھ دن ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "تذکرہ بہارِ بےخزاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے جس میں ناسخ کو شاگردِ مصحفی لکھا گیا تھا، لکھا ہے کہ

"اس کے اکثر واقعات غلط ہیں اور ان اکثر غلط واقعات کی مثال میں صرف مصحفی و ناسخ کی استادی و شاگردی کا واقعہ پیش کیا ہے۔"

اس مسئلہ کو تو ہم بعد میں زیرِ غور لائیں گے۔ آیئے پہلے ناسخ کے آغاز شاعری پر نظر ڈالتے چلیں۔ آزادؔ نے یہ داستان خود ان کی زبانی اس طرح بیان کی ہے:

"میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ انہوں نے اصلاح نہ دی۔ میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا اور دل میں کہا میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ تو نہیں۔ اپنے کام (کلام) کو آپ ہی اصلاح دوں گا چنانچہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا جو سمجھ میں آتا اصلاح کرتا، اور رکھ دیتا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر فرصت میں نظرِ ثانی کرتا اور رہنا تا۔ غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن کسی کو سناتا نہ تھا جب تک خوب اطمینان نہ ہوا مشاعرے میں غزل نہ پڑھی اور نہ کسی کو سنائی ـــ جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔"

---

[1] مثنوی ناسخ صـ۳۲ ـ مطبوعہ کتابستان الہ آباد۔ ۱۹۳۱ء

سارے ورق الٹنے کا اشارہ اس عہد کے اساتذہ کے انتقال کی طرف ہے اور ان میں مصحفی سب سے آخر میں یعنی ۱۲۴۰ھ میں فوت ہوئے گویا ناسخ نے اس کے بعد مشاعروں میں آمد و رفت شروع کی اور بحیثیت شاعر معروف ہوئے۔ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے اس سے برسوں پہلے اعظم الدولہ سرور عمدۂ منتخبہ میں ان کا ذکر کر چکے ہیں۔ دراصل آزاد نے مصحفی اور تنہا کے سانحہ ناسخ کے ربط و ضبط کو پوشیدہ رکھنے کے لئے یہ داستان وضع کی ہے۔

آزاد کی لفاظی اپنی جگہ مسلّم جس نے اب تک اچھے اچھے محققوں کو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے سے روک رکھا ہے۔ ناسخ اور ان کے عقیدت مندوں کو شاگردی مصحفی و تنہا سے انکار ہو تو ہو حقیقت آشنا نگاہ رکھنے والے حضرات کو اس دعوے پر سند قبول عطا کرنا مشکل ہے۔ خود آزاد نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے بعد یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"بعض سن رسیدہ اشخاص سے سُنا گیا کہ ابتدا میں شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر کسی شعر پر ایسی تکرار ہوئی کہ انہوں (مصحفی) نے ان کا آنا بند کر دیا یہ بطور خود غزلیں کہتے رہے اور تنہا تخلص ایک شخص تھے ان سے تنہائی میں مشورت کرتے رہے۔"

خواجہ عبدالرؤف عشرت نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"ناسخ سب سے پہلے میر تقی میر کی خدمت میں اصلاح کے لئے غزل لے گئے انہوں نے بے توجہی کی۔ اصلاح دینے سے انکار کیا تو ناسخ نے مصحفی سے اصلاح لی اور محمد عیسیٰ تنہا سے بھی مصحفی نے ایک مرتبہ ان کی غزل اپنے شاگرد بیتاب کو اصلاح کے لئے

دے دی تھی اسی روز سے خفا ہو گئے اور اصلاح لینا ترک کر دی۔

(آب بقا صـ ۱۱۳)

اکیلے آزاد کا بے بنیاد بیان ایک طرف اور دوسری طرف سچی بات کہنے والوں کا جمِّ غفیر ہے جو اس معاملے کو اس کے حقیقی پس منظر میں دیکھتا ہے۔ حکیم عبدالحی فرماتے ہیں :-

"اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمالِ فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استادان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے اور سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کو گو انکار ہو مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ انہیں کے مائدہ سخن کے ریزہ چین تھے۔"

ایک اور منصف مزاج محقق مولانا حسرت موہانی یوں رقم طراز ہیں :-

"لکھنؤ میں شاعری کا سلسلہ آتش و ناسخ کی ذات سے قائم ہوا اور اب تک قائم ہے ان میں آتش تو علانیہ مصحفی کے شاگرد تھے اور ناسخ نے اگرچہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تاہم وہ بھی مصحفی سے تعلقات رکھتے تھے اور مصحفی کے تلامذہ میں محمد عیسیٰ تنہا سے ان کو خاص طور پر ربط تھا۔ مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان (۱۲۲۴ھ) کے دیباچے میں ان کو یکے از دوستان تنہا لکھا ہے اور ہمارے قدیم تذکرہ نویس یار دوست اور رفیق کا لفظ شاگرد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

خود مصحفی نے بھی ریاض الفصحا میں مرزا محمد رضا شکوہ کو جو مرزا قتیل کے شاگرد تھے از آشنایانِ مرزا قتیل لکھا ہے (صـ ۱۳۶)

تنہاؔ مصحفی کے قدیم شاگردوں میں شامل ہیں اور اُن کے پہلے تذکرہ کی تکمیل کے وقت وہ ۲۷ سال کی عمر کے تھے۔ یہ تذکرہ ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوا اس کے بعد جتنی جتنی مشقِ سخن ترقی کرتی گئی لکھنؤ کے نومشق شعرا اُن کی طرف متوجہ ہوتے گئے ان میں میر دوست علی زلالؔ، لالہ کنور سین مضطرؔ اور درگا پرشاد مضطرب وغیرہ شامل ہیں یہ تینوں حضرات بعد میں مصحفی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ناسخؔ نے بھی فیض آباد سے لکھنؤ آنے کے بعد تنہاؔ کی دوستی اختیار کی اور یہ دوستی ترقی کرتے کرتے مشورت کی حد تک پہنچ گئی۔ ۱۲۲۲ھ میں تنہاؔ کا انتقال ہو گیا تو ناسخؔ نے ایک اور اُستاد کی طرح ان کی وفات پر بھی یہ قطعہ تاریخ لکھ کر حقِ دوستی و شاگردی ادا کیا اور مونسِ جانِ حزیں لکھ کر درپردہ تعلقات کی توثیق کر دی

مونسِ جانِ حزیں دشتِ بلاخیز میں آہ — اُٹھ گیا سوئے عدم چھوڑ کے ہم کو تنہا
کلکِ ناسخؔ نے لکھا مصرعِ تاریخِ وفات — آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا
۱۲۲۲ھ

---

یہ قطعہ تاریخ یار دوستوں نے ناسخؔ کی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہونے دیا۔ اگر سعادت خاں ناصرؔ کا تذکرہ موجود نہ ہوتا جس میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے تو کسی کو ان دونوں کے وسیع تعلقات کا پتا بھی چلتا جو تنہاؔ کے آخری وقت تک قائم رہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہاؔ کی حیات میں جب کہ ناسخؔ کو شاعری میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وہ تنہاؔ کی دوستی یا تلمذ سے انکار کی ہمت نہ کر سکے لیکن ان کی وفات کے بعد ناسخؔ اور اُن کے لگے بندھوں نے اس سے برملا انکار شروع کر دیا اور اس انکار کی لے اس قدر اونچی ہوئی کہ نہ صرف تنہاؔ بلکہ اُن کے استاد کے فیضانِ صحبت سے بھی انکار کر دیا گیا۔ عبداللہ خاں ضیغمؔ کے تذکرے کی یہ عبارت اس کی تصدیق کرتی ہے:

"بحد تواتر سنا گیا ہے کہ ابتدا میں جو کلام شیخ ناسخ نے کہا وہ محمد عیسیٰ تنہا
مرحوم کو جو زمرۂ تلامذہ میاں مصحفی ہمدانی مغفور سے تھے دکھایا بعد چندے
میاں تنہا سے تنہا نہیں بلکہ اُن کے استاد سے بھی بگڑ گئے تھے اور کہتے تھے
کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں اور میرا فن شعر قبیل علم لدنی سے ہے۔"

اس اختلاف کی تصدیق ایک اور واقعے سے بھی ہوتی ہے۔

آزاد نے آب حیات میں مرزا دبیر کا ایک واقعہ لکھا ہے جس کے الفاظ ہیں

"ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر استاد کی اصلاح مرزا دبیر کو پسند نہ آئی شیخ
ناسخ کے پاس گئے۔ انہوں نے کہہ دیا استاد نے ٹھیک اصلاح دی۔ انہوں
نے کہا کتاب میں تو یوں لکھا ہے یہ ملاحظہ فرمائیے۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا
کر کہا ارے تو کتاب کو کیا جانے ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے ہم
کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔"

سید افضل حسین ثابت اپنی تصنیف حیات دبیر میں اس کی تردید کرتے ہوئے
اپنے نانا میر ظہیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یہ بہتان عظیم ہے خود یہ عبارت پیر بخارا کے پاک شہدوں کی بولیوں
کا سماں دکھاتی ہے اخلاق ذمیمہ کی بو آتی ہے مرزا صاحب کبھی شیخ ناسخ
کے پاس نہیں گئے۔ حالاں کہ اُن (ناسخ) کو حسرت رہی۔ نہ شیخ ناسخ
مرحوم کے اخلاق کی شان کے یہ حکایت شایاں ہے اور شیخ ناسخ کے مرزا
صاحب کے پاس جانے کی وجہ تھی کہ میر ضمیر صاحب اور شیخ صاحب سے چشمک
تھی کہ میر ضمیر صاحب مصحفی کے شاگرد تھے اور شاگردان مصحفی شیخ صاحب
کو تنہا شاگرد مصحفی کا تعلیم یافتہ بتاتے تھے۔ شیخ صاحب اور ان کے تمام
شاگردوں کو اس سے انکار تھا۔ ایسی ایسی رکاوٹیں مانع تھیں۔" (۳۹)

نامناسب نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات بھی درج کر دیئے جائیں۔ سعادت خاں ناصر کہتے ہیں :-

میاں مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مشورہ شعر کا اس (ناسخ) کو محمد عیسیٰ تنہا سے تھا اور وہ تربیت یافتہ میرا (خوش معرکہ زیبا)

گوکل پرشاد رسا لکھتے ہیں :-

شاگرد محمد عیسیٰ تنہا و مصحفی لیکن مصحفی سے تھوڑے دنوں اصلاح لینے کے بعد تلمذ سے گریز فرمایا۔

عبدالغفور خاں نساخ اور نفیس بدایونی کا بیان ہے :-

مشہور ہے کہ کچھ روزوں محمد عیسیٰ تنہا شاگرد مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوگئے تھے۔ (سخن شعرا و تمیم سخن)

نواب نورالحسن خاں تصدیق کرتے ہیں :-

گویند روزے چند از محمد عیسیٰ المتخلص بہ تنہا اصلاح گرفتہ سپس انحراف ورزید

نواب علی حسن خاں کا بھی یہی خیال ہے

آوردہ اند کہ از محمد عیسیٰ تنہا اصلاح میگرفت باز انحراف ورزیدہ خود مصلح گفتار دیگراں گردید

حکیم مومن سجاد مشاق کان پوری کے یہ الفاظ ہیں :-

"اور کلام جناب ناسخ کا جن کو سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں شاگرد تنہا کا بیان کیا ہے جو فارسی میں شاگرد میاں مصحفی کے تھے اور شیخ صاحب (ناسخ) کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ دفتر اوّل بالکل فکر تنہا کی ہے۔"

اتنے حوالوں کے ہوتے ہوئے ناسخ کا انکار بجائے خود ایک اقرار کی حیثیت رکھتا ہے جیسے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے مصحفی کے مسلم الثبوت استاد ہونے کے ثبوت میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

" منہ زوری کی اور بات ہے کہ سیکھ کر انکار کر جائیں مگر حقیقت چھپی نہیں رہتی لوگ خدا کا انکار کرنے سے کیا بندگی سے نکل سکتے ہیں لطیفہ تو یہ ہے کہ انکار وہی کرتا ہے جہاں پانی مرتا ہے آج تک نہیں سنا کہ کسی نے جھوٹوں کسی کو اپنا شاگرد کہا ہو اور وہ بگڑا ہو بلکہ ہنس کر ٹال دیا ہوگا یا چپ رہا ہوگا ۔ یہ وہی کرتا ہے جس کو تعلق واقعی ہوتا ہے ۔ مصحفی بیچارے بھی اسی بلا میں مبتلا ہوئے تھے آخر دودھ کا دودھ ، پانی کا پانی ہو گیا اور مصحفی کی استادی مسلم الثبوت ٹھہر گئی "

یہاں تک کی تحریر کا ماحصل تو یہ تھا کہ ناسخ کو تنہا کا شاگرد قرار دے کر شاگردان مصحفی کے زمرہ سے خارج کر دیا جاتا لیکن دو وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا اول یہ کہ تنہا کے جو شاگرد وفات تنہا کے بعد مصحفی کے شاگرد ہو گئے تھے انہیں تلامذہ مصحفی میں شامل کیا گیا ہے تلامذہ تنہا میں نہیں رکھا گیا ۔ دوسرے یہ کہ منشی احمد حسین سحر کاکوروی نے جو ناسخ کے دیکھنے والوں میں تھے اپنے تذکرے میں انہیں

"تلمیذ مصحفی سحر بیاں استاد نزاکت بنداں جہاں بود"

کہہ کر یاد کیا ہے یہ اس بات کے مستحق ہیں کہ شاگردان مصحفی کے زمرے میں شامل کر لئے جائیں

ناسخ کے حالات کے سلسلے میں بعض اور اختلافات بھی پائے جاتے ہیں ۔ آزاد، مولوی عظیم اللہ رقمی کی زبانی لکھتے ہیں کہ

(ناسخ) کے والد لاہور سے گئے تھے بنفشہ اور زعفران وغیرہ اشیائے قیمتی کابل و کشمیر کی تجارت کرتے تھے ۔ شیخ مرحوم بعالم خورد سالی ہمراہ تھے ۔

اس بیان میں اگرچہ ان کے والد کا نام نہیں ہے لیکن یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ناسخ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن مصحفی کہتے ہیں :-

"خلف الرشید شیخ خدا بخش مرحوم وطن بزرگانش دار السلطنت لاہور و خودش در فیض آباد تولد شدہ و بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ[1]"

عشرت کا بیان ہے :-

۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ نے لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا اس کے دو چار برس بعد ناسخ لکھنؤ آئے۔

فیض آباد سے لکھنؤ آنے کے بارے میں حکیم عبد الحی فرماتے ہیں :-

نواب محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز رئیس فیض آباد انہیں نوکر رکھ کر لکھنؤ لائے۔

اور یہاں بقول مصحفی :-

"اجدادش تجارت پیشہ بودند و خودش نیز بہمیں وتیرہ بسر می برد"

یہ حالات ریاض الفصحا کی تصنیف کے وقت تک کے ہیں جس کا آغاز ۱۲۲۱ھ میں اور اختتام ۱۲۳۶ھ میں ہوا ـــــ مولوی عبد الغنی کہتے ہیں کہ :

"لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے انہوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامہ کی رو سے ان کو مل گئی اب آسودہ

---

[1] آزاد کا بیان ہے کہ بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس دولت مند لاولد (خدا بخش) نے متبنٰی کیا تھا اصل والد عالم غربت میں مغرب سے مشرق کو گئے فیض آباد میں ان کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا کہ فلک نظم کا آفتاب ہوا ـــــ اس دولت مند سوداگر نے کہ لاولد تھا بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش "ناسخ" ہو گئے۔

حال ہو گئے (گو یا پہلے آسودہ حال نہ تھے) اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کر لی۔ اُس زمانے میں مرزا حاجی ایک امیرزادے تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے۔ اور ان کی سرکار میں مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر اور بہت سے اہل کمال جمع رہتے تھے۔ شیخ امام بخش ناسخ کو خوش قسمتی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی ان کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا چسکا پڑا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا رفتہ رفتہ دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش بڑھ گیا۔ مرزا حاجی کی ہم نشینی نے ان کی شخصیت بڑھا دی۔ اہل فہم اور اہل کمال ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آئے اور اپنی مطلب برآری کا ذریعہ سمجھنے لگے غرض کہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور ان کو لکھنؤ میں رشد و فروغ قبل از وقت حاصل ہو گیا۔

سیاست میں حصہ لینے کی بنا پر دو مرتبہ انہیں لکھنؤ سے نکلنا پڑا اور کان پور و الہ آباد میں مختلف اوقات میں قیام کرنے پر مجبور ہوئے۔

آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا لیکن بقول مولوی عبدالحئی

قیصر التواریخ میں سید محمد میر زائر نے لکھا ہے کہ بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی حکیم زین العابدین ان کا بیٹا مرزا محمد علی کا شاگرد طبابت کرتا اور خوش چلنی سے بسر کرتا تھا۔" ص ۳۵۲

ناسخ نے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی ان کے شاگرد سید علی اوسط رشک نے تاریخ وفات کا بہت اچھا قطعہ لکھا تھا جس میں "دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" تاریخی مادّہ تھا۔

ایک تاریخ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی نے بھی لکھی ہے جو لکھنؤ میں قیام رکھتے تھے۔ اور ان کی تصنیف ملہم تاریخ میں شائع ہوئی ہے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سفر چو سوئے عدم کرد ناسخ از ہستی
بگوش پیر و جواں گفت پیر چرخ کہن
شدند بے سروپا از برائے تاریخش
لطیفہ، نکتہ، کنایہ، اداء شعر و سخن

۶۰۰ + ۷۰ + ۴۴ + ۶۱ + ۴۲۰ + ۹۹

= ۱۲۵۴ھ

تین دیوان مرتب کئے اور ایک مثنوی سراج نظم جس کا نام آزاد نے نظم سراج لکھا ہے ان سے یادگار ہیں۔ تاریخ گو بہت اچھے تھے، مطبوعہ کلیات میں متعدد تاریخیں درج ہیں جو اپنی جگہ پر خوب ہیں۔

شاگردوں کی تعداد کافی تھی جن میں سے کچھ طلب فن کے لئے اور کچھ طلب منفعت کے لئے شاگرد ہو گئے تھے۔ ان میں خواجہ محمد وزیر وزیرؔ، سید علی اوسطؔ رشک کپتان مقبول الدولہ قبولؔ، خواجہ اسد اللہ قلقؔ، حاتم علی بیگ مہرؔ، کلب حسین خان نادرؔ اور حفیظ حیدر آبادی زیادہ مشہور ہیں۔ آخر الذکر پہلے شیر محمد خاں ایمانؔ دکنی کے شاگرد تھے۔ ایک پوری غزل ناسخ کی تعریف میں ان کے دیوان قلمی میں موجود ہے ناسخ کا رنگ کلام مصحفی اور اُن کے قدیم شاگردوں کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ان کے یہاں دور از کار تشبیہات کی بہتات ہے۔ غریب اور قلیل الاستعمال الفاظ کا استعمال موجود ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فارسی شعرا کے اکثر اشعار کے ترجمے ہیں۔ ان سب کی مثالیں آزاد نے آب حیات میں درج کر دی ہیں۔ البتہ ان کا سب سے عظیم کارنامہ اصلاح زبان ہے جس کے ذریعہ سے انہوں نے بعض قدیم الفاظ اور ترکیبوں کو منسوخ قرار دیا اور اُن کی جدید

صورتوں کو رواج دیا۔ اگرچہ اس سے زبان کا دائرہ کسی قدر تنگ ہو گیا مگر متانت و سنجیدگی پیدا ہو گئی اور بقول صفیر مرحوم اصلاح زبان کا یہ کارنامہ اس کمیٹی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جس کے صدر شیخ غلام ہمدانی مصحفی تھے۔

اب چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

یہ ساعدوں کا ہے اُس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا
———
مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا
آفتاب اونچا ہوا اتنا کہ تارا ہو گیا
———
اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا
———
دور سے دیگی دکھائی روشنی جائے سواد
یاد رکھ قاصد نشاں ہے یہ دیارِ یار کا
———
دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جو نہی سن سے نکل گیا
———
بس میں ہوتا نہ پرائے کے کبھی اے ناسخ
آہ میرا مرے قابو میں اگر دل ہوتا
———
تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک رقیب
میں نے کیونکر تری الفت میں زمانہ چھوڑا
———
ہاتھ میں تیرے نہ ٹھہریگا وہاں مکتوبِ شوق
یاد رکھ قاصد یہی ہے بس نشانِ کوئے دوست
———
شب جو اُلٹی اُس نے روئے حیرت افزا سے نقاب
چاندنی مثل سفیدی رہ گئی دیوار پر
———
سرِ گرگڑ دں آستانِ بُتِ نازنیں سے میں
ہے جی میں داغ سجدہ مٹاؤں جبیں سے میں
———
پیشتر نشۂ ایجاد سے بیہوش ہوں میں
خُمِ گردوں بھی نہ تھا جب کہ مے نوش ہوں میں
———
صبح فرقت تیرگی میں شام سے کچھ کم نہیں
چاند نکلا ہے اُفق سے نیّر اعظم نہیں
———
رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں
———
دو شبِ تار سے تشبیہ ہمارے دن کو
تیرگی سے نظر آتے ہیں ستارے دن کو
———
آئی شبِ وصال ہوئی صبح شام سے
قسمت نے آفتاب کیا ماہتاب کو
———
یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
دگر نہ ماہ کو یک شب کمال رہتا ہے
———

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول — کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

فصلِ گُل ہے چار دن، ایام تو یہ ہیں مدام — عمر بھر اے مے کشو باب اجابت باز ہے

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے ہوتا ہے

شوقِ مے نے کر دیا اس درجہ مجھ کو بدحواس — محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

رنج اُٹھائے ہیں حسینوں سے جہاں میں اس قدر — بعد مردن بھی نہ آنکھ اپنی پڑے گی حور پر

ہوا اگرچہ سبک دشمنوں کی نظروں میں — پر اپنے دوست کے دل پہ ہنوز بار ہوں میں

صبحِ محشر سے سوا صبحِ شبِ وصل ہے شیخ — آج ہے تجھ سے زیادہ غمِ فردا مجھ کو

داغ فرقت زیست بھر سوزِ جہنم بعد مرگ — ان بتوں کو کس توقع پہ خدایا چاہیے

باد کے مانند ساقی لے اُڑا پانی مجھے — کشتیٔ مے ہو گئی تختِ سلیمانی مجھے

دو چار حریص پہنچے اگر اور بھی ہم سے — ہستی کی طرف منہ نہ کرے کوئی عدم سے

ڈر تھا اثر کا اُس کو سو وہ بھی نکل گیا — نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالہ نکال کے

میرے لاشے کے وہ ہمراہ لحد تک ہووے — اے اجل تیرا قدم مجھ کو مبارک ہووے

---

عمدۂ منتخبہ ص ۸۲۷ ، ریاض الفصحا ص ۲۳۴ ، ابن طوفان ص ۵

گلشنِ بیخار ص ۲۲۲ ، گلشنِ ہمیشہ بہار ص ۳۱۲ ، خوش معرکۂ دوم ص ۲۰۱، ۳۶۶

بہارِ بے خزاں ص ۱۱۲ ، سراپا سخن ص ۹۵، ۹۹ ، سخن شعرا ص ۴۹۱

شمیم سخن ص ۷۶ ، جلوۂ خضر اول ص ۱۵۶ ، طور کلیم ص ۱۰۸

یادگار ضیغم ص ، گل رعنا ص ۳۴۳ ، ارمغان ادب ص ۵۵

آب حیات ص ۳۴۳ ، دیوان غریب ص ۴۷۳ ، ملہم تاریخ ص ۳۴۲

# مولوی سید رمضان علی ناطق

جدّ راقم الحروف مولوی رحیم بخش کو پرانے لوگوں کی طرح اپنی پسند کی کتابیں نقل کر کے محفوظ کرنے کی عادت تھی ان کی قلمی کتابوں کا ذخیرہ میرے چچا منشی محمد داؤد کے تصرف میں تھا مجھے اس ذخیرے میں سے ایک مجلد کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں کئی کتابیں تھیں۔ درمیان میں بعض خالی مقامات پہ کچھ شعرا کا کلام نقل کیا گیا تھا جس میں ناطق مذکور کی ایک غزل بھی تھی۔ یہ اب سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اُس وقت نہ مجھے حیات مصحفی لکھنے کا خیال تھا نہ تلامذہ مصحفی کی تصنیف میرے پروگرام میں تھی۔ البتہ کچھ شعرائے امروہہ کے حالات جمع کئے تھے۔ ناطق صاحب کی اس غزل کے دو شعر میں نے اپنی یادداشت میں لکھ لئے تھے۔ اب و دانہ وطن سے کراچی کھینچ لایا وہاں رہتا تو کچھ اور معلومات فراہم کرتا اور کلام حاصل کرنے کی کوشش کرتا اب جو کچھ ہے وہی نذر قارئین ہے۔ ہاں یہ لکھنا بھول گیا کہ مخطوطے میں ناطق کے نام ساتھ تلمیذ مصحفی بھی درج تھا۔

مولوی ناطق۔ مولوی سید بشارت علی نقوی کے لڑکے امروہے کے ساکن اور حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت کے اعقاب میں تھے۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور علم عروض و قوافی کے لاثانی استاد تھے۔ ایک سرکاری اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے شہر میں ان کے علم و فضل کی شہرت تھی سینکڑوں طلبہ علم ان کے مائدۂ فیض کی زلہ کشی سے مستفید ہوئے۔ وطن کے اس گوہر بے بہا نے خاصی عمر پاکر ۱۲۹۳ھ میں اس دار فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی۔ سید اعظم علی اعظم ان کے فرزند ارجمند اور قابل قدر یادگار تھے۔ جنھوں نے اپنے پدر والا قدر کے سانحۂ وفات پہ دو قطعۂ تاریخ لکھے تھے

ان میں سے ایک قطعہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

کرد چوں مولوی رمضان علی زیں جا رحلت ۔۔۔ فادخل الباب بفرمود مقیم جنّت
زاہد و متقی و عابد بے رو و ریا ۔۔۔ بود انساں دلے داشت فرشتہ سیرت
شاعر و نکتہ رس و عالم و عامل ہم بود ۔۔۔ ہر یکے وصف چو گفتم ہمہ دارد شہرت
فیض بخش طلبہ، خلق مجسّم سیّد ۔۔۔ باندش بہ لحد پاک نزول رحمت
خوش بر آمد دم افکار زنا مش اعظم
یعنی از "مولوی رمضان علی" سال رحلت

وہ منتخب دو اشعار جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں

اس مطلع انوار نے جلباب خفا میں ۔۔۔ جلوہ وہ دکھایا کہ دکھایا نہ کسی نے
وہ طالع بیدار سرہانے مرے آیا ۔۔۔ کیوں خواب سے غفلت کے جگایا نہ کسی نے

---

## مرزا محمد حسن عسکری نالاںؔ

دہلی کے باشندے تھے۔ تقریباً ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد شعر گوئی کی ابتدا کی۔ میر حسن نے انہیں شاہ حاتم کا شاگرد لکھا ہے۔ اور اعظم الدولہ سرور غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ کا شاگرد بتاتے ہیں ممکن ہے ان بزرگوں سے ابتدا میں اصلاح لی ہو لیکن جب ۱۱۸۶ھ میں مصحفی دہلی پہنچے اور اپنے مکان پر بزم مشاعرہ ترتیب دی تو نالاںؔ نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ یہ دہلی میں انکے پہلے شاگرد تھے مصحفی لکھتے ہیں

"اول کسے کہ در شاہ جہاں آباد بحلقہ شاگردی نقیر در آمدہ ایں است میر حسن صاحب او را در تذکرہ خود شاگرد شاہ حاتم نوشتہ اند محض غلط"

نالاںؔ اپنے استاد کے ہر مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ البتہ ان کے دہلی چھوڑ دینے

کے بعد جیسا کہ حکیم قاسم نے لکھا ہے یہ [illegible] اللہ خاں فراق کے شاگرد ہو گئے تھے نالاں بڑے نیک خو اور خوش اختلاط تھے کلام میں سادگی اور کشش ہے شیفتہ کی تحریر کے مطابق گلشن بے خار کی تصنیف (۱۲۴۸ھ - ۱۲۵۰ھ) سے پہلے تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

نالاں کے ایک لڑکے مرزا طالب حسین تھے۔ یہ شاعر تھے طالب تخلص کرتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں سے اصلاح لیتے تھے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم تھے۔

نالاں کا قلمی دیوان ریاست رام پور کے کتب خانے میں ہے۔ اس میں ۲۴۴ صفحات ہیں کاتب کا نام میر چراغ علی دہلوی ہے اور تاریخ کتابت ۳ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ روز پنج شنبہ درج ہے اسی سے یہ کلام انتخاب کیا گیا ہے ؎

مقدور نہیں مجھ کو تری حمد و ثنا کا
اس جائے سر عجز بجا طبع رسا کا

دل ہو گیا میرا تو ترے عکس سے روشن
یہ آئنہ ہرگز نہیں محتاج صفا کا

لولاک لما خلقت الافلاک کو حق ہیں
جس کے کہا ہے نور وہی ارض و سما کا

یا احمد مرسل مجھے دیدار دکھاؤ
مشتاق تمہارے ہوں میں فرخندہ لقا کا

اور اس کے سوا پوچھ نہ کچھ مجھ سے تو نالاں
بندہ ہوں دل و جان سے میں شیر خدا کا

بے طرح دلبر ہے عنم کیا کیجئے
چشم اب رہتے ہیں نم کیا کیجئے

اے مرے اللہ اب میں کیا کروں
پھر گیا مجھ سے صنم کیا کیجئے

قتل ہے نالاں کا اس کے ہاتھ سے
اس قدر ابرو میں خم کیا کیجئے

---

جب وہ صاحب جمال گزرے ہے
جی میں کیا کیا خیال گزرے ہے

تو ہی جانے ہے تو تو کیا جانے
جو کچھ اب میرا حال گزرے ہے

دن تو کٹتا ہے جوں توں جھپ کر — رات مجھ پہ وبال گزرے ہے
کیا کروں حیف ہے کہ اب مجھ پہ — غم علی الاتصال گزرے ہے
ہر کوئی دیکھ مجھ کو کہتا ہے — دکھ تو اس پہ کمال گزرے ہے
رات دن اس کی یاد میں نالاںؔ
ہر گھڑی ماہ و سال گزرے ہے

اُٹھ کے آیا ہے وہ سوتے سے خمار آلودہ — کوئی مت دیکھیو ہے زور بہار آلودہ
آ دل زار پہ کر اب تو ترحم کی نگاہ — کیوں کہ زخموں سے ہے یہ سینہ فگار آلودہ
آتش غم میں تری جلتا ہوں ہر شب پیارے — شمع کی طرح مرا تن ہے شرار آلودہ
کیوں نہ سوراخ کرے دل میں وہ ہر دم جس کے — نوک مژگاں سے رہیں دامن خار آلودہ
کبھی پوچھا بھی نہ تو نے کہ ہے کیونکر نالاںؔ
خاک کوچے میں ترے گرد و غبار آلودہ

---

نالاںؔ کا ذرا میں قصہ عشق — فرہاد تو پیارے اب کہوں میں
رو رو کے ہر اک سے پوچھتا ہے — کس طرح سے اُس سے جا ملوں میں
اُس ظالم بے وفا کے پیچھے — کس کس جگہ خوار اب پھروں میں
چھٹ جاؤں عذاب دیکھنے سے — اس جینے سے کاش کہ مروں میں
قسمت ہی کو کہیے اپنی ہمدم
ہر ایک پہ دوش کیوں دھروں میں

اس دل کو دیا سب سے تجھے میں نے چھپا کر — تو رکھیو مری جان اسے جی سے لگا کر
کیا نرگس بیمار کا اپنی ہے معالج — گاہے تو دل خستہ کی میرے بھی دوا کر
خوباں کی محبت پہ تو مت جائیو نادان — لے جاتے ہیں اک آن میں یہ دل کو پھنسا کر
پہنچا تو نہ ہرگز مری فریاد کو ظالم — جاتا ہوں میں اب در سے ترے تجھ کو دعا کر

خوباں کے لئے رشک سے بگڑا تھا یہ نالاں
لاتا ہوں میں منت سے اُسے اب تو منا کر

یہ اشعار مختلف تذکروں سے نقل کئے گئے ہیں۔

نہ مروت نہ وفا اور نہ محبت نہ سلوک — چشم بد دور عجب آنکھ بچپرا بیٹھا ہے
سحر کے ہونے کا ازبس خیال رہتا ہے — شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سائے پر بھی مجھے — رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

کانوں پہ جب رکھتا ہے گل ایک اس طرف ایک اس طرف
شمس و قمر رہتے ہیں تُل ایک اس طرف ایک اس طرف

روزِ محشر میں ساقیٔ کوثر — تو ہی پشت و پناہ ہے میرا
قاصد نہ کہا تو نے بھی پیغام ہمارا — اب دیکھیے کیا ہوتا ہے انجام ہمارا
شب اُسے قصۂ غم آہ سنانے نہ دیا — طپش دل نے مجھے ہوش میں آنے نہ دیا
نے خواہش چمن ہے نہ گلزار کی ہوس — رکھتا ہوں ایک ہی ترے دیدار کی ہوس
کتاب حسن پر یہ پرکار کا خط — نہ دیکھا ہو تو دیکھو یار کا خط
یہ نگر اور یہ جو کھیڑا ہے — زندگانی کا سب بکھیڑا ہے
درد پہلوئے جاں سے اُٹھتا ہے — کس لئے کیوں کہاں سے اُٹھتا ہے
اس کا ہر موئے زلف دیکھو تو — مجھ سے کیا پیچ و تاب کرتا ہے

---

تذکرہ میر حسن ص ۱۸۳، تذکرہ ہندی ص ۲۶۰، عمدہ منتخبہ ص ۶۷۶
مجموعہ نغز ص ۲۶۳، گلشن بیخار ص ۲۲، گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۱
شمیم سخن ص ۲۳۳، طبقات الشعرا کریم الدین ص ۳۹۱

# مرزا محمد جان خاں نالاںؔ

مظفر الدولہ ممتاز الملک مرزا حسین علی خاں فتح جنگ اور مرزا مہدی علی خاں دو حقیقی بھائی جو ترکمانوں کے قبیلہ قراقر نیلو سے تھے۔ علامہ تفضل حسین خاں کے دست گرفتہ تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ۱۲۱۲ھ میں نواب آصف الدولہ کی وفات کے بعد نواب سعادت علی خاں والیٔ سلطنت اودھ ہوئے تو علامہ تفضل حسین خاں کی سفارش سے چکلہ بانس بریلی ان دونوں بھائیوں کے سپرد ہوا۔ طلسم ہند کے مصنف کا بیان ہے کہ محاصل ریاست کی بقایا کی بنا پہ مرزا مہدی علی خاں نے قید ہو کر زندان حیات سے بواسطۂ اجل رہائی پائی اور مرزا حسین علی خاں معزول ہو کر لکھنؤ میں آئے ان کے لڑکے کے ساتھ مرزا جعفر کی دختر منسوب تھی اور وہ خود (مرزا جعفر) جان بیلی کے ساتھ متوسل تھے ایام خانہ نشینی بسر کئے۔ ص ۳۵

مرزا حسین علی خاں کے لڑکے مرزا باقر علی خاں وحشتؔ کو میر تقی سے تلمذ تھا، اور مرزا مہدی علی خاں کے لڑکے یہ مرزا محمد جان خاں تھے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔"

نالاںؔ کو عنفوان شباب میں شوق شاعری دامن گیر ہوا، اوّل اوّل لالہ موجی رام موجیؔ سے اصلاح لیتے رہے چند روز کے بعد موجی کے استاد مصحفیؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا لکھنؤ میں اپنے مکان پر محفل مشاعرہ ترتیب دیتے تھے جس کا سلسلہ تقریباً دو سال قائم رہا۔

بہم رسیدہ کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

وصل کی شب مجھے کیا یار نے سونے نہ دیا ۔۔۔ دیدۂ طالب دیدار نے سونے نہ دیا
گرچہ افسانے سے نیند آتی ہے لیکن مجھ کو ۔۔۔ قصۂ عشق دل زار نے سونے نہ دیا
شدتِ درد سے کرتا جو رہا نالہ و آہ ۔۔۔ قبر میں بھی دل بیمار نے سونے نہ دیا

گرچہ ہوں ساکنِ گلکدۂ یار دلِ نرگس وار
یادِ یارانِ گرفتار نے سونے نہ دیا
چشمِ انجم کی طرح وا رہے نت دیدۂ عشق
ایک شب آرزوئے یار نے سونے نہ دیا

---

چھیڑنے کو مرے تصویرِ خیالی بھیجی
خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا

کیا نازکی سے رکھے وہ صمصام دوش پر
ہو بار جس کو زلفِ سیہ فام دوش پر

عاشق مزاج کہتے ہیں طفلی سے مجھ کو لوگ
آتا نہ تھا کبھی مجھے آرام دوش پر

پھرتے ہیں تیرے عشق میں اے برہمن پسر
زنار رکھ کے صاحبِ اسلام دوش پر

کیوں نہ گُل کردوں شبِ وصل اے پُرفن چراغ
بُت تو مہر جب نکلے نہیں رکھتا کوئی روشن چراغ

سحر کے ہونے کا ازبس خیال رہتا ہے
شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے

وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سائے پر بھی مجھے
رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے۔

عمدۂ منتخبہ ص۷۹، ریاض الفصحا ص۲۲۷، خوش معرکہ اول ص۱۷۴، سرودِ چراغاں قلمی ص، طلسم ہند ص۳۳۹

---

## شیخ عبدالکریم نجف

مصحفی نے ان کو رنبیر پور کا ساکن لکھا ہے اور علی حسن خاں باشندہ لکھنؤ کہتے ہیں سال ولادت تقریباً ۱۲۰۶ھ ہے۔ فرد کامل اور مرد ذی فہم تھے۔ طبیعت کو نظم سخن کے ساتھ بڑی مناسبت تھی اور درد و دل گزینی کی خاصیت ان کے اشعار کا سرمایۂ ناز۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے اور شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھتے بہت کم تھے۔

مگر جو لکھتے تھے وہ اہل نظر کے لئے موجب انبساط اور اہل دل کے واسطے باعث دلچسپی ہوتا تھا۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

وصف اُس کے نورِ تن کا جب سے آیا دھیان میں | بالکل اشعار مرصّع ہیں مرے دیوان میں
نجش افزائے دلِ بلبل ہے رونا شمع کا | خندہ گل آفت پروانہ ہے بستان میں
زلف و عارض کے علاقے سے ہمارا روز و شب | دل پریشاں ہیں ہے گر تو جاں ہے ہندستان میں
سنگلاخ آشنا زمین شعر کو مت کر نجف[1]
چل جناب مصحفی کے پیچھے اس میدان میں

اُن لبوں نے کی مسیحائی نہیں تو اپنا کام | تیغ ابرو کر چکی ہی تھی تمام اک آن میں
کیا حرم کیا دَیر کس کا شیخ کیسا برہمن | بے نشاں دیکھا تجھی کو جلوہ گر ہر شان میں
یہاں ہوا وعدہ برابر واں وہی وعدہ رہا | عمر آخر ہو گئی پیمان ہی پیمان میں
کیا کرے بیچارہ دل اس کا مداوا واں تو ہے | دلفریبی ہر ادا میں دلبری ہر آن میں
مر گئے پہ پھیر یہ مٹی ہے بقولِ خاں نجف
دم کا سارا کھیل ہے اور کچھ نہیں انساں میں

اب کے موسم میں مرے ہاتھوں سے اے وحشتِ عشق | دیکھئے کیا ستم ایجاد نیا ہوتا ہے
کیا خطرناک رہِ عشق ہے یاں پیاسے کا | آپ خنجر ہی سے سیراب گلا ہوتا ہے
کفر ہے دخل مشیت میں نجفؔ بندے کا | جو ہوا خوب جو ہوتا ہے بجا ہوتا ہے

خون مرجاں کا ہے دل تیرے لبِ خنداں سے | سینۂ دُر بھی مُشَبّک ہے دُرِ دنداں سے
اشک نے دل میں مرے آہ سے دی آگ لگا | شعلۂ برق فرو ہو نہ سکا باراں سے
تیر پر تیر لگے یار کے یہاں تک کہ نجفؔ | دل مرا خانۂ زنبور ہوا پیکاں سے

---

[1] ریاض الفصحا میں ان کا تخلص نحیفؔ غلط لکھا گیا ہے۔

(فارسی)

نالہ خیزد ز دلم گاہے و آہے گاہے ۔۔۔ چوں بخاطر گزرد یاد نگاہے گاہے
کو نصیبے کہ نشینم بر اُو ہمچو رقیب ۔۔۔ ایں قدر بس کہ بہ بینم سر راہے گاہے
رُخ برافروختہ و جلوہ کناں می آئی ۔۔۔ از کجا راست بگو آفتِ جاں می آئی
گذر افتاد بکویش مگر امروز نجف ۔۔۔ کہ سراسیمہ چو آفت زدگاں می آئی

---

ریاض الفصحا ص ۳۲۹ ۔۔۔ صبح گلشن ص ۵۰۴

---

## سیّد قاسم علی نزار

میر احمد علی کے لڑکے اور میر علی حسین کے پوتے تھے۔ بزرگوں کا وطن مشہد مقدس تھا۔ وہاں سے فردوس آرام گاہ کے وقت دہلی آئے اور حضور پُرنور سے بیوتات نویسی صرف خاص کی داروغگی کا منصب پایا۔ نزار فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں پائی۔ ۳۳-۱۲۳۴ھ کے قریب شاعری کا شوق ہوا۔ چار چھ مہینے بطور خود کہتے رہے اس کے بعد مصحفی کے دائرہ اطاعت میں داخل ہو گئے۔ اور اسی تھوڑی مدت میں دیوان مکمل کر لیا۔ اپنے استاد سے بہت عقیدت رکھتے تھے کلام میں جا بجا تلمذ پہ فخر کیا ہے ؎

صحبت ہے مصحفی سے تجھے روز و شب نزار ۔۔۔ اہل سخن میں کیوں نہ ہو رنگیں سخن ترا
ہے مصحفی سے فیض سخن تجھ کو اے نزار ۔۔۔ خاقانی سے غرض ہے نہ کچھ انوری سے کام

غزل گوئی کے علاوہ مرثیہ گوئی بھی کرتے تھے اور اس میں قائم تخلص نظم کیا جاتا تھا۔ ایک سلام کا یہ مقطع اس کا شاہد ہے ؎

کیا عجیب ہے کہ اسے سُن کے ہو پتھر ٹکڑے　　ایسا تُو درد سلام تو نے کہا اے قائم

معلوم ہوتا ہے کہ نزار کو منتظم الدولہ تاج الدین حسین خاں بہادر ثابت جنگ کی سرکار سے تعلق تھا کیوں کہ اُن کے قلمی دیوان میں ایک قصیدہ نواب صاحب کی شان میں موجود ہے۔ بعد میں اس مصرعے کو جس میں نواب تاج الدین حسین خاں کا نام تھا تبدیل کر دیا ہے اور اس کی جگہ نواب شمس الدولہ کا نام موزوں کر دیا گیا ہے۔

نزار کا قلمی دیوان جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں ریاست رام پور کے کتب خانے میں ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ اور کاتب کا نام سید کاظم علی ہے لیکن منتظم الدولہ کی تعریف میں جو قصیدہ ہے اُس کے آخر میں ۲ جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ تحریر ہے مصحفی نے ۱۲۳۶ھ میں ان کی عمر ۳۸ سال بتائی ہے۔ اس حساب سے سال پیدائش ۱۱۹۸ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۲۶۱ھ سے قبل وفات پائی۔

پاس عزت ہے نہ کچھ دھیان ہے رسوائی کا　　حال پہنچا ہے یہاں تک ترے سودائی کا

ٹھوکریں کھاتے ہیں اس کوچے میں سر اُن کے مدام　　جن کو دعویٰ تھا ترے در پہ جبیں سائی کا

بیٹھے بیٹھے کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے　　قابل سیر ہے عالم ترے سودائی کا

بھیجا اُس شوخ نے تب وصل کا پیغام نزار　　کام آخر ہوا جب زور و توانائی کا

---

جاتے نہ اُس کے کوچے میں گر ہم قضائے دل　　آتی نہیں یہ سر پہ ہمارے بلائے دل

دینے کا دل کیا ہے وہ دیتے ہیں گالیاں　　جب مانگتا ہوں اُن سے میں جا کر بہائے دل

دیر و حرم میں برسوں رہے روز و شب خراب　　کوچے میں اُن کے جاتے ہی ہم ڈھونڈ لائے دل

آئی نہ اُس کی جب رسن زلف ہاتھ میں　　چاہ ذقن میں کیونکہ پھر ڈوب جائے دل

دل دے تو میں اُس بُت بے مہر کو نزار
پھر کیوں پکارتے ہو یہ ہر دم کہ ہائے دل

---

حالِ دل کیا نہیں معلوم ہے میرا تجھ کو　　ناتوانی مری اور عشق کے آزار کو دیکھ

کر جائے سفر جلد کہیں جان بھی تن سے
چھوٹ جاؤں میں تا روز کے اس رنج و محن سے

خواہش وصل میں تدبیر نہ کچھ کام آئی
اس کی فرقت تو لئے موت کا پیغام آئی

اس کے گھر جانا جو چھٹنے کا نہیں تجھ سے نزارؔ
یہ سمجھ لے کہ قضا صبح نہیں شام آئی

جب اس کے چہرے پہ وا زلف مشکبار ہوئی
چمن پہ حسن کی چھائی گھٹا بہار ہوئی

---

## نوحہ کے دو شعر

تاریک ہوا ارض و سماء کی نظر میں
نیزے پہ سر سرور دیں جب نظر آیا

قائم ہوا اک حشر عیاں اہل حرم میں
جب خوں میں تر رخش شہ بحر و بر آیا

اس مقطع میں پہلے تخلص نزارؔ تھا اور مصرع یوں تھا

اس وقت تلاطم تھا نزارؔ اہل حرم میں

اس طرح مقطع کو اس تخلص میں تبدیل کیا گیا جو مراثی کے لئے مخصوص تھا

---

ریاض الفصحا۔ ص ۳۲۹۔ سراپا سخن ص ــــ

---

## مولوی محمد برہان الدین نزہتؔ

ولد سرفراز علی۔ دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ساکن تھے۔ یہ مولانا عبد السلام دیوی شاگرد مولانا عبد السلام لاہوری کے اعقاب میں تھے۔ مولوی عبد السلام دیوی مشہور و معروف استاد گزرے ہیں۔ نزہتؔ نے اپنے عم محترم مولوی ذوالفقار علی سے علوم متعارفہ کی تحصیل کی۔ علوم منقول و معقول میں فرد اور جمیع فروع و اصول میں بے مثال تھے۔ ظاہر و باطن صلاح و تقویٰ سے آراستہ تھا۔ تمام عمر مخلوق خدا کی ہدایت و رہنمائی میں گزاری۔

سینکڑوں گمراہوں نے ان کے ارشاد و ہدایت سے متاثر ہو کر راہ راست اختیار کی۔ مولوی رحمان علی خاں کہتے ہیں کہ میں اپنی نوجوانی کے زمانے سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور اس وقت تک کہ میری عمر ۶۱ سال کی ہو چکی ہے میں نے ان کا سا صاحب علم نہیں پایا۔ الٰہ آباد میں وقتاً فوقتاً جاتے رہتے تھے کیوں کہ وہاں کچھ معافی داری تھی۔ اور کچھ محاصل وصول کرنے ہوتے تھے۔ ناصر نے ان کو صدر آرائے مجلس فصحا اور سرخروئے معرکۂ شعرا لکھا ہے۔

۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو علمائے دہلی کے درمیان بعض اختلافی مسائل پر ایک مباحثہ ہوا تھا۔ ایک فریق کے سرگروہ مولوی رشید الدین خاں تھے اور دوسرے فریق کے سرگروہ مولانا عبدالحئی تھے۔ مباحثہ ختم ہو گیا تو فریقین کی تقریریں اور تحریریں مولوی برہان الدین کے سامنے پیش ہوئیں تو انہوں نے اپنے نظریات ایک رسالے میں تحریر کئے اس رسالہ کا نام "رسالہ محاکمہ" ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف تحقیق الاوزان ہے جسے ۱۲۴۶ھ میں تصنیف کیا۔ یہ بڑا کارآمد رسالہ ہے جس سے صدقہ و زکوٰۃ و مہر کی ادائیگی میں صحیح رہنمائی ہوتی ہے۔ اس تصنیف کے بعد بعض علمائے احمد آباد کی استدعا پر دو رسالے اور تحریر کئے ان میں سے ایک کا نام احکام عید الفطر اور دوسرے کا نام احکام عید الاضحیٰ ہے۔ یہ دونوں رسالے ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہیں۔ رسالہ نکاح، رسالہ منع اشارۂ تشہد، رسالہ نذر و ذبیحہ۔ رسالہ تحقیق ربوٰ اور رسالہ کفارہ میت بھی ان کی تصنیف ہیں۔ مولوی برہان الدین باقاعدہ شاعر نہ تھے۔ اور نہ اپنے قیمتی لمحات حیات کو تسلسل شعرگوئی کے فضول کام میں صرف کرنے کو اچھا سمجھتے تھے۔ وہ صرف احیاناً فکر شعر کرتے تھے اور جو کچھ ذہن میں آتا بے کم و کاست، صحت و سقم سے قطع نظر کر کے ضبط تحریر میں لے آتے تھے جس زمانے میں وہ لکھنؤ کے محلہ کھتیا ٹولہ میں مقیم تھے ان کے پڑوس میں مصحفی رہتے تھے اس لئے مولوی برہان الدین کے کلام کی اصلاح مصحفی

کے سپرد تھی اور فارسی میں بقول مصنف خازن الشعرا مرزا قتیل سے اصلاح لیتے تھے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ وہ طبعزاد شاعر تھے اسی بنا پر کپتان حسینی خان نادر نے اپنے تذکرے میں ان کو "ملیح استاد ازل است و طوطی بے بدل" تحریر کر دیا ہے۔

مولوی برہان الدین نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور سید محمد عدل نقشبندی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ہم یہاں تذکرہ خازن الشعرا قلمی کی وہ عبارت بجنسہ نقل کر دینے کو مناسب خیال کرتے ہیں جو مولوی برہان الدین کے بارے میں ہے۔

"استادنا و مولانا برہان الدین محمد ن الفضیلۃ الاعظم است وے برادر زادہ حقیقی مولی الافاضل مولوی ذوالفقار علی الفقیہ الحنفی ساکن قصبہ دیوا من مضافات معمورۂ لکھنو است۔ روح اللہ و رحمہا از حاشیہ محفل عم بزرگوار خود فیوض ظاہری و باطنی حاصل کردہ و از بدائے بسم اللہ تا تائے تحت بخدمت ایشاں گزرانیدہ در یکے از شہور سنہ یکہزار و دوصد و پنجاہ و یک ہجری در موضع ابھینی کہ از الہ آباد شش کردہ جانب غرب است داعی حق لبیک اجابت گفت در علم فقہ یگانہ زماں و درفن ریاضی و منطق علامہ دوران بودہ صاحب تصانیف کثیرہ است۔ ازانجملہ حاشیہ بر شرح تہذیب ملا عبداللہ یزدی کہ متعارف درمیان مردم است و رسالہ در فرائض و رسالہ در فقہ و کتابے ضخیم در ابطال رسالہ متعہ علامہ اوحد مولوی سید محمد مجتہد مذہب امامیہ و رسالہ در شہادت حسن و حسین رضوان اللہ علیہم و رسالہ در رحلت و حرمت گاؤ سید احمد کبیر وغیرہ و مولانا باد اللہ مرحوم ایں معموم ارتباط کلی داشت اکثر بہ الہ آباد تشریف می آورد در دائرہ متبرکہ حضرت جدی شاہ محمد اجمل الہ آبادی قدس سرہٗ در خانقاہ والد مرحوم فرود می آمد و چہار چہار ماہ اینجا تشریف می داشت

کاتب الاوراق عفیت عنہ سیاہہ کتاب خلاصۃ الحساب بخدمت وے گزرانیدہ دگاہے گاہے مشورہ سخن ہم بوے کردہ و مثنوی نان وکباب خود راکہ بخد متش برائے اصلاح گزرانیدم بعد ملاحظہ بہ ظہر آں عبارت بدستخط خاص قلمی فرمودند (ایں نان وکباب کہ برائے نمک چشی از مطبخ الطاف بہ فقیر عنایت شدہ ملاحت افزائے شوق سلیم گردید الہی ذایقہ افزائے قبول اذہان یاراں باد والسلام

ملاحت بخش کام دوستاں باد)

اواخر عمر بہ تقلید مرزا قتیل سمند تیز گام فکر را در وادی شعر و شاعری جولاں می داد و مشورہ ہم از مرزا میکرد و سخن معانی و طبع وانی آنقدر داشت کہ روزے والد مرحوم در مجلس خود بہ تقریبے ایں قطعہ مولانا جامی قدس اللہ سرہ السامی می خواندند ؎

علی یابی بہر طفلے معین ‌ ‌ ‌ ‌ بکن شش چند امدادش دریں فن
بیفزا یک بکن در عشر مضروب ‌ ‌ ‌ ‌ بطرح بست دہ یا یازدہ زن

ہماندم مولانا ایں قطعہ نظم فرمودہ ؎

بہر لفظے کہ جوئی ‌ ‌ ‌ ‌ بہ پنج اعداد او کن ضرب اے یار
فزوں کن واحد در دہ بکن ضرب ‌ ‌ ‌ ‌ پس افگن زانیہمہ پنجاہ ہر بار
تو باقی ماندہ را کن ضرب در نہ ‌ ‌ ‌ ‌ پس افزا دو درست آید ترا کار

بعد ازاں بخدمت والدم خطاب کردہ فرمودند کہ بنام آں صاحب ہم معمہ میگویم و بعد ساعتے ایں قطعہ نظم فرمودند ؎

ز ہر لفظے علی خود چو خواہی — تو اعدادش مضاعف ساز اے یار
بیفزا واحد و در عشرہ کن ضرب — ازاں مطروح فرما بیست ہر بار
بزن آں عشرہ را در چل و شش — پر آں سہ را بیفزا اے نکو کار

القصہ مولانا صاحب علوم کثیرہ بود در عصر خود عدیل نداشت صاحب ورع و تقویٰ مثل او نظر ایں تا کام نیامدہ در ہر امر یکہ التزام می کرد ہرگز فوت نمی شد از مدت سی سال التزام نماز تہجد کردہ بود تا دم واپسیں فوت نشد و بعد ادائے نماز تہجد انتقال کرد اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

فارسی و اُردو کلام کا انتخاب یہ ہے —

گو تم دمِ مُردن مری بالین پر آئے — کیا ظلم کہ اس وقت بھی منہ ڈھانپ کر آئے
اک قامتِ رعنا کا تصور رہا مجھے صبح — ہنگامۂ محشر کے تماشے نظر آئے
یاد آیا مجھے کون بتِ شعلۂ نو خیز — جو اشک شرر بار رہ چشم تر آئے
بے ساختہ پھر جائے گا ناقہ طرفِ نجد — تاثیر پہ نالے ترے مجنوں اگر آئے

پہنچی نہیں افغاں شبِ غم ہونٹوں پہ نزہت
نوکِ مژہ پہ لختِ جگر بیشتر آئے

بمقصد کے رسی زاہد بہ ہر خشک حیرانم — نمی یابد گہر غوّاص تا باشد بساحلہا
گُلِ نعماں دمد ہر صبح دم از مرقد وامق — ہنوز اندر جگر دارد ہمانا داغ عذرا را
نگنجد معنی بیتابیم در شعر پروردن — کجا در کوزہ آوردن توانم موج دریا را
نسازی تا کہ ہمچوں شانہ دل را چاک چاک از غم — تو کے در پنجہ خود آوری زلفِ چلیپا را

زمینِ ایں غزل رشکِ چمن نزہت تواں کردن
ہنوز از معنی رنگیں بود جوشِ دلِ ما را

سخنِ یار بگو با منِ غمگیں قاصد — دارُوے دردِ دل زار و پیام تو یکیست

فتنہ را بیخوابیٔ، از نرگسِ فتاں اوست | شعلہ افروز بلاہا دامنِ مژگانِ اوست
از قیامت، قامت آں سرو پایہ می دہد | گردۂ دامانِ محشر، گردشِ دامان اوست
نرگس گلزار چشم نیم خوابش گر ندید | محوِ دیدار کہ یارب دیدۂ حیراں اوست

صحّتِ بیماریٔ نزہت بسے مشکل بود
کز تفِ عشقِ نہاں، سوزِ دل بریاں اوست

نے ہمیں سینہ و دل آتشِ پنہانم سوخت | کو تفِ شمع رخت دیدۂ گریانم سوخت
ماتم تازہ شد از مردنِ مجنوں در نجد | بے کسی ہائے غزالانِ بیابانم سوخت
چہ تواں کرد ہمہ مایۂ دیں داریٔ دل | نگہ نازِ بتِ دشمن ایمانم سوخت
چند روز است کہ خونِ دل عاشق نچشید | جگر از تشنگیٔ آہن پیکانم سوخت

یک زماں ہم ندہد فرصتِ خوابم نزہت
شیون و نالہ دگر در شبِ ہجرانم سوخت

شب سوئے من میا تو اگر پاک دامنی | نبود دریں زمانہ مرا اعتبارِ خویش

ترا من خوش ادا دانستہ بودم | نہ با جور و جفا دانستہ بودم
تو از من بے سبب گشتی مکدر | درت را با صفا دانستہ بودم
تبسم شد نمک بر زخم من حیف | لب شیریں ادا دانستہ بودم
تو خواہم ریخت خون عالمے را | من او رنگ حنا دانستہ بودم

جواب نظم واقف از تو آید
من اے نزہت ترا دانستہ بودم

---

ریاض الفصحا ص ۳۱۲، تذکرہ علمائے ہند ص ۳۲، خازن الشعرا ص ۱۶۳
تذکرہ شوکت، نادار، قلمی، صبح گلشن ص ۵۱۵، نزہت الخواطر ہفتم ص ۹۷

# مرزا علی بیگ نظرؔ

خلف میرزا محمد زماں، مالک اشتر کی اولاد میں تھے۔ آبا و اجداد مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے اور ان کے ننہال کا رشتہ دشت قبچاق کے ساکن مرزا عبدالواحد خاں ولد خدمت طلب خاں سے ملتا ہے جو اپنی ولایت میں قراقم نیلوی کے خطاب سے مشہور تھے اور جنت آرام گاہ کی سرکار میں مستوفی گری کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ دہلی آگئے تھے۔ نظرؔ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی ابتدائے عمر سے بہت ذہین طباع تھے اور جو کچھ لکھتے تھے شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ بائیس سال کی عمر (تصنیف ریاض الفصحا کے) ایسی ہی شاعر مسلم الثبوت بن گئے تھے ان کا کلام اغلاط سے پاک اور قانون شاعری کے مطابق ہوتا تھا۔ اپنے استاد کے سیدھے سادھے عاشقانہ طرز میں بھی خوب لکھتے تھے۔ اور معنی بندی میں بھی اعلیٰ معیار قائم کرلیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود راسخ الاعتقادی کے ساتھ اپنے استاد کے گرویدہ تھے۔ استاد بھی ان کی روز افزوں قابلیت شاعرانہ کی بہت قدر کرتے تھے انتہا یہ ہے کہ اپنے تذکرے میں ان کے کلام کا اتنا طویل انتخاب درج کیا ہے کہ پورے (۹) صفحات میں آیا ہے۔

نظرؔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ لکھنؤ میں یمین الدولہ نواب سعادت علیخاں کے لڑکے جلال الدولہ نواب مہدی علی خاں کی سرکار سے توسل تھا اور بہ اطمینان و فراغت سے بسر کرتے تھے۔ صحیح سن انتقال کا علم نہ ہو سکا لیکن ۱۲۶۱ھ سے قبل انتقال کرچکے تھے کیونکہ محسن علی نے اپنے تذکرے میں ان کو مرحوم لکھا ہے۔ نظرؔ کے کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

| | |
|---|---|
| ضعف ہی مانع نہیں ہے کچھ مری رفتار کا | سر پہ ہے کوہ گراں سایہ تری دیوار کا |
| دل ہی جب ہارے تو پھر کس کام کے عبرد شکیب | فوج کو دیتا ہے ذلت بھاگنا سردار کا |
| دامن صحرا کو یکسر موتیوں سے بھر دیا | واہوا دست سخا جب چشم گوہر بار کا |

آخر کار بہ حسرت نے کیا کام اپنا / اُس نے پوچھا تو ہمیں بھول گیا نام اپنا
صورتِ دائرہ اس صفحۂ ایجاد کے بیچ / آخر آغاز سے مل جاتا ہے انجام اپنا

روح کو جسم سے بے وجہ نہیں ہے الفت / کیوں مسافر نہ کرے سایۂ دیوار پسند

اثر تو دیکھ مرے دل کے داغِ سوزاں کا / کہ تار شمع ہے جو تار ہے گریباں کا
میں بے نصیب ہوں اس پہ بھی بے نصیب نہیں / زمینِ شور سے اُگتا ہے نخلِ حرماں کا
دلیلِ عالمِ نیرنگ ہے یہی تو نظرؔ / نہ ایک طور پہ دیکھا مزاج انساں کا

دعویٰ حسن کرے اُس سے بھلا کیا خورشید / نقشِ پا جس کا حریفِ یدِ بیضا ہووے
وہ پرِ کاہ ہوں میں گلشنِ ہستی میں نظرؔ / قطرۂ شبنم کا جسے لطمۂ دریا ہووے

صدمہ دستِ جنوں سے کوئی ٹل جاتا ہوں / ہوں میں وہ چاک کہ دامن سے نکل جاتا ہوں
وہ شناور ہوں کہ دریائے تعلق سے نظرؔ / ہاتھ دو مار کے میں صاف نکل جاتا ہوں

بدگمانی سے میں ناچار ہوں اپنی ورنہ / دوستی کس سے تو اے دشمنِ جاں رکھتا ہوں

مجھے ہے رشک اسی بات کا نظرؔ کہ وہ شوخ / دو چار آئینہ کیوں صبح و شام ہوتا ہے

دیکھا جہاں نے تجھے چشمِ قبول سے / عاشق کی آنکھ تھی کہ گنہگار ہو گئی

آسماں تیری سی بیداد گری کیا جانے / کج خرامی کے سوا کج نظری کیا جانے
دل پہ جو صدمہ ہے وہ آنکھوں کو معلوم نہیں / حالتِ خانہ نشیں رہگذری کیا جانے

نظمِ سخن میں طرزِ نظرؔ سب سے ہے جُدا / کیونکر کسی کی اُس کی زباں سے زباں ملے

رحم کھا کر اس نے آخر آپ پوچھا حالِ دل / اپنا چپ رہنا ہی اپنے درد کا درماں ہوا

ہم نہ سمجھے تھے کہ دل ہم سے خفا ہو جائیگا / آشنا یوں یک بیک نا آشنا ہو جائیگا

دیکھے گر مرغِ چمن اُس کی بہارِ عارض / لالہ و گل کو کرے لا کے نثارِ عارض
نصب ہو آئینہ مری قبر پہ کرنا پسِ مرگ / جانے تا وہ بھی، یہ تھا عاشقِ زارِ عارض
حیف ہے ہم تو نظرؔ ایک جھلک کو ترسیں / آئینہ لوٹے سدا اُس کی بہارِ عارض

آہ کی شورش سے دل کا کب ہے روشن چراغ
ٹھہرے بادِ تند میں کیونکر تہہ دامن چراغ

کون اُٹھائے گا ترے جور و جفا میرے بعد
دخل کیا ہے جو کوئی نام وفا میرے بعد

(فارسی)

نالہا مثل جرس درد زباں نتواں کرد
ہست پاس ادب عشق، فغاں نتواں کرد

نونہالان گلستان جہاں بسیار اند
ایں قدر سرکشی اے سرو رواں نتواں کرد

خط بر آورد رخش فکر دگر کن تو نظر
سیر ایں باغ در ایام خزاں نتواں کرد

---

گہے بسوئے من آں مہ جبیں نمی آید
اثر ہنوز ز آہ حزیں نمی آید

چناں بہ ہجر تو خو کردہ ام کہ در برِ من
نشستی و دلم را یقیں نمی آید

دمے بیا کہ مریضِ ترا بغیر از تو
بروں ز لب نفس واپسیں نمی آید

بخاکِ سوختۂ عشق ہر کجا دفن است
ہنوز سبزہ بروں زاں زمیں نمی آید

## قطعہ تاریخ وفات مرزا محمد تقی خاں ترقی

محمد تقی خاں بہادر کہ بود
بہ جود و شجاعت عدیم المثال

بحکم خدا زیں سرائے سپنج
سوئے باغ فردوس کرد انتقال

پئے سالِ تاریخ آں ذی شکوہ
چو کردم نظر از دلِ خود سوال

ہماں دم خرد از سرِ حلم گفت
برفت از زماں قدر دانِ کمال

۸

۱۲۳۸ + ۸ = ۱۲۴۶ھ

(دیوان نظر قلمی)

---

ریاض الفصحا ص ۳۴۰، عمدۂ منتخبہ ص ۸۰، سراپا سخن ص ۱۲۶، خوش معرکۂ دل ص ۴۵۵
سخن شعرا ص ، صبح گلشن ص ۵۴۳، سرو چراغاں قلمی۔

# شیخ حیدر علی نگاہ

حیدر علی نام شیخ نوازش علی قریشی لاہوری کے لڑکے تھے۔ ان کے بزرگ گھوڑوں کے سوداگر تھے اور پشمینہ کی تجارت بھی کرتے تھے۔ نگاہ کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔ آغاز شباب میں اُردو شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور مصحفی سے اصلاح لینے لگے۔ کلام یہ ہے

اعجازِ خضر ہے سخن اپنا تو اے نگاہ
آگے مرے کلیم کے منہ میں زباں نہ ہو

روزِ اوّل سے مقدر میں گرفتاری ہے
ہنسلی گردن کی مجھے طوق سے بھی بھاری ہے

ہے بڑا فرق مرے یار میں اور یوسف میں
سخت بے قدر ہے جو چیز کہ بازاری ہے

لاکھ آنکھوں میں زمانے کی سبک ہو جاؤں
دوش پہ یاروں کے مُردہ بھی مرا بھاری ہے

منزلِ خوف جہانِ گزراں ہے یہ نگاہ
چل بسے یار، مرے کوچ کی تیاری ہے

---

ریاض الفصحا صہ ۳۲۱

---

# شیخ محمد بخش واجد

خلف شیخ شاہ محمد۔ ان کے بزرگوں کا وطن امیٹھی تھا لیکن واجد کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں نشو و نما پا کر حسب ضرورت علم حاصل کیا۔ ابتدائے شاعری ہی سے مصحفی کی خدمت میں پہنچے اور اپنے کلام کی اصلاح اُن کے سپرد کر دی۔ نہایت مہذب الاخلاق اور سعادت مند تھے۔ اوّل اوّل اپنے زمانے کے اسلوب شاعری کے دلدادہ رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ شوکت بخاری کے انداز میں کہنے لگے، اور عنان طبیعت معنی بندی اور

نازک خیالی کی طرف موڑ دی یہ رنگ شاعری مصحفیؔ کے انداز سخن سے جدا اور ان کے زمانے کے رواج کے مطابق تھا گو مصحفی ذہن و دماغ کی اس بے نتیجہ کاوش کو درست نہ سمجھتے تھے پھر بھی شاگرد کی ہمت شکنی گوارا نہ کی اور حسب ضرورت اصلاح دیتے رہے واجدؔ لکھنؤ میں تمباکو فروشی کرتے تھے۔ اور ان کی دکان پہ اکثر معاصر شعرا جمع ہوتے رہتے تھے جن میں خود مصحفی بھی شامل تھے۔ میر افضل حسین ثابتؔ لکھتے ہیں کہ

"انھوں (واجد) نے غزل کے علاوہ نوحے اور مرثیے بھی کہے تھے میر شرف الدین صاحب (شاگرد مرزا دبیرؔ) سے کہا کہ میاں ایک مرثیہ بندہ کا بھی پڑھ دو تو مجھے بھی عزت حاصل ہو جائے۔ میر شرف الدین صاحب نے ان کا وہ مرثیہ لیا جس میں یہ روایت ہے کہ ایک درویش عاشقِ خدا، خدا سے اس بات پر خفا ہو گیا تھا کہ جب تیرا نام رحمٰن ہے تو دوزخ کیوں بنایا۔ حضرت موسیٰؑ اس کی ہدایت پہ مامور ہوئے اور جناب باری سے حکم ہوا۔

دکھلا دو اسے مقتلِ شبیرؑ کی تصویر سینے پہ تو بیٹھا ہوا جلاد کو دیکھے
گردن پہ رواں خنجر فولاد کو دیکھے

حضرت موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔ درویش نے جب یہ مرقعِ ماتم دیکھا، اور رویا پیٹا تو کلیم اللہ نے فرمایا" اب بتاؤ ایسے ظالموں کی کیا سزا ہے؟"

وہ بولا جہنم ہے جہنم ہے جہنم

یہ مرثیہ میر شرف الدین کے پڑھنے سے ایسا مقبول ہو گیا تھا کہ لکھنؤ میں سیکڑوں آدمیوں کو اس کے بند کے بند یاد تھے۔ نول کشوری جلدوں میں یہ مرثیہ بھی مرزا دبیر مرحوم کے نام سے چھپ گیا ہے"۔

واجدؔ نے کچھ شاگرد بھی بنا لئے تھے چنانچہ ان کے دو شاگردوں مرزا مغل کیواںؔ، اور شیخ امین احمد اظہرؔ سرہندی کا ذکر سعادت خاں ناصرؔ نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

ناصرؔ نے واجدؔ کے کلام کا تعارف جن الفاظ میں پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ یہاں درج کر دیئے جائیں۔ وہ کہتے ہیں:

"طبیعت چُست، خمیرہ اس کے سخن کا درست۔ مردِ خوش عقائد طرزِ ایہام اس کی ہمدم اور استاد کو اس سے رغبت کم۔ یہ چند دھواں دھار اشعار اُس سے یادگار۔"

کلام کا انداز یہ ہے ؎

لکھا ہے ہر غزل میں میں نے مضمون چشمِ گریاں کا / بجا ہے گر ہو تارِ اشک سے شیرازہ دیواں کا
عیاں کر پنجۂ غم، آفتابِ داغِ سینہ کو / کہ ہووے صرف چاکِ صبح تا اپنے گریباں کا
حذر مینائے دل کو کیوں نہ ہو ان نرم رویوں سے / رگِ سنگِ صنم ہر تار ہے زلفِ پریشاں کا
تڑپ کر کاٹتا ہے شب جو تیغِ یار کا زخمی / بیاضِ صبح کرتی ہے اثر پیدا نمکداں کا
میری زنجیر میں موجِ رمِ آہو کا عالم ہے / نگہبانِ اسیری ہو گیا رہبر بیاباں کا

گدا واجدؔ ہوں اُس نورِ نگاہِ مرتضےٰ کا میں
ہوئی خاکِ کفِ پا جس کی سرمہ چشمِ شاہاں کا

---

مرا شہرہ ہے طورِ چرخ پہ آتش زبانی کا / صریرِ کلک کو دعویٰ ہے بانگِ لن ترانی کا
جنوں اک طفلِ مکتب ہے میں وہ شوریدہ شاعر ہوں / رمِ آہو ہے مضموں میرے صحرائے معانی کا
تصورِ یار کا میری نگہبانی میں ہے ہر دم / یہاں تک مرتبہ پہنچا ہے اس کی بدگمانی کا

---

اُس بت کو غم ہوا نہ مرے دل کے داغ کا / کافر کو کب ہے پاس حرم کے چراغ کا

---

نغمہ سنجی نے مری پھیلائی بوئے بیخودی / ہم صفیروں کو ملا ساغر لبِ خاموش کا
عشق نے مجھ کو کیا واجدؔ شہِ دیوانگی / افسرِ مجنوں ہوا رتبہ مری پاپوش کا

---

دل جو مجھ وحشی کا پابندِ بتاں ہو جائے گا / دیدۂ آہو چراغِ کارواں ہو جائے گا
دل سعادتمند ہے ٹھہرا جو زلفِ یار میں / سنبلستاں میں ہما کا آشیاں ہو جائے گا

لاغری سے ہوں گے مرتے یہ نہ ہم ممنونِ خلق　　لاشہ اپنا چشمِ عالم سے نہاں ہو جائے گا

یوں ہی گر مضمون بہار آمیز اے واجد لکھے
اپنا یہ دیوان رنگیں بوستاں ہو جائے گا

ہے صفائی سے نہ تنہا گردن جانانہ شمع　　ہاتھ بھی ہے ساعدِ سیمیں سے لے تا شانہ شمع
یہاں تلک محو جمالِ یار پروانے ہوئے　　رات بھر تنہا جلا کی صورتِ بیگانہ شمع
چاک کر ڈالے ابھی پیراہنِ فانوس کو　　تیرے مجنوں کا اگر دل سے سنے افسانہ شمع
عشق کی آتش بجھی، راحت ضعیفی بن گئی　　صبح کے ہوتے ہی محفل کر گئی ویرانہ شمع
رحم معشوقوں میں گر ہوتا تو کیوں مرتے پتنگ　　بازیٔ عاشق کو سمجھی بازیٔ طفلانہ شمع

کشتۂ واجد شعلہ رو ڈں کا ہوں گر بودے کوئی
خاکِ تربت سے مری بن کر اُگے پروانہ شمع

---

ریاض الفصحا ص۳۵۸ ، خوش معرکہ اوّل ص۲۹۱ ۔ انتخاب یادگار حصہ دوم ص۲۶
دربار حسین ص۱۸۵ ؛

---

## سیّد بہادر علی واثق ترمذی

ان کے مورث اعلیٰ سیّد زین العابدین مدینے سے ہجرت کر کے ترمذ چلے آئے تھے۔ ان کے اعقاب میں سیّد کمال نے ہندوستان ہی آکر لاہور میں سکونت اختیار کی۔ سید کمال کے لڑکے سید علی احمد نے بعض وجوہ سے یہاں سے بھی ترک سکونت کیا۔ اور ضلع فرخ آباد کے ایک قصبہ چھپرامؤ میں جا کر رہنے لگے۔ سید علی احمد کے اخلاف میں میر غلام حسین نام کے ایک بزرگ تھے جن کے دو بیٹے میر حشمت علی اور میر چراغ علی

ہوئے۔ یہ میر چراغ علی جن کی وفات ۱۲۴۷ھ میں ہوئی میر بہادر علی واثق کے والد تھے۔ میر حشمت علی لکھنؤ میں رہتے تھے اور لچھمن سنگھ اور بدھ سنگھ کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

واثق ۲۰ شوال ۱۱۹۵ھ مطابق ۹ اکتوبر ۱۷۸۱ء کو پیدا ہوئے ۲ سال کے ہوئے تو ان کے دادا میر غلام حسین چھبرامؤ سے فرخ آباد لے آئے یہاں میر بکھو نام کے ایک استاد سے خوش نویسی سیکھی۔ ۱۲۰۷ھ میں میر حشمت علی لکھنؤ سے فرخ آباد آئے تو اپنے بھتیجے کو واپسی میں لکھنؤ لے گئے۔ لکھنؤ آنے کے بعد واثق نے مولوی کمال الدین شاہ جہان پوری سے تحصیل علم کی اسی زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا تو نور تخلص اختیار کیا اور مولوی غلام محمد فائق کے شاگرد ہوئے کچھ دن بعد حشمت علی کے ایک کرم فرما میر ساجد علی نے انہیں مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل کرا دیا۔ اس درس گاہ ادب میں پہنچنے کے بعد واثق نے فارسی اردو دونوں زبانوں میں موزونی طبع کے جوہر دکھائے لیکن آخر میں اردو کہنا قریب قریب ترک کر دیا اور صرف فارسی گوئی میں منہمک رہے۔

۱۲۱۷ھ میں جب کہ ان کی عمر بائیس سال کی ہو چکی تھی لکھنؤ سے فرخ آباد واپس آئے اور ترواضلع فرخ آباد کے ایک رئیس ٹھاکر جسونت سنگھ بھگیلا کے یہاں مدرسی کر لی۔ پھر انہیں کی سفارش سے چھبرامؤ کے تھانیدار بن گئے۔ جسونت سنگھ کے انتقال کے بعد واثق نے پھر لکھنؤ کا رُخ کیا اور کچھ مدت دریاآباد میں تھانیداری کی آخر ملازمت سے دل اچاٹ ہو گیا تو دوبارہ فرخ آباد پہنچے اور ذاتی مکتب جاری کر لیا۔ جہاں ہندو مسلم طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔

واثق کی شادی ۷ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ سے پہلی مرتبہ واپس آنے کے بعد شمس آباد کے شیخ اکرام اللہ کی لڑکی سے ہوئی تھی آخر

عمر کی ۷۵ منزلیں طے کر کے اس کامیاب سخنور نے ۲۳ شعبان ۱۲۷۰ھ کو وطن میں وفات پائی۔ آل اولاد کا علم نہ ہو سکا۔

وامق بہت خلیق، متواضع اور صلاحیت شعار تھے انہوں نے پہلے سید پھر گردش اور آخر میں وامق تخلص اختیار کیا۔ بھاکا بھی لکھتے تھے اور اس میں ہندی تخلص تھا۔ اردو فارسی دواوین کا تو کوئی علم نہیں البتہ ان کی تصنیف لوح تاریخ اور قصر اللطائف کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ قصر اللطائف میں شعرائے لطائف جمع کئے گئے ہیں یہ تصنیف خیراتی لال بیجگر کی نگاہ سے گزری تھی اور اُس نے اس کے چند لطیفے اپنے تذکرے میں نقل کئے ہیں۔

وامق کا اردو کلام نایاب ہے البتہ فارسی کلام سے جو مصحفی نے اپنے تذکرہ میں شامل کیا ہے چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

محبت پیشگاں را صبر ہم یک گونہ می باید — چرا رسوائے عالم میکنی اے چشم تر ما را
ہر عاشق دل خستہ کہ پا بوسیِ تو خواہد — از خونِ جگر دامن کند رنگِ حنا را
مکن آزردہ دل ظالم چو من آزردہ جانے را — کند یک نالۂ آزردہ دل درہم جہانے را
دہد یک رشتۂ شیرازۂ جمعیت بصد اجزا — بچشم کم مبیں تا می توانی ناتوانے را
و لبس در سر ہوائے عالم ایجاد بود او را — ز دود آہ برپا کرد سیرے آسمانے را
امشب بکوئے دوست گزر کردہ ایم ما — خود را ز دیر و کعبہ بدر کردہ ایم ما
بر ما بسانِ روزِ قیامت گزشتہ است — دور از رخش شبے کہ سحر کردہ ایم ما
ہمہ جا چرخ کماندار نشانم کردہ است — تیرہا می رسد از ثابت و سیارہ مرا
ہر دو را در سر زلف تو بہم باید بست — دل گنہگار تو و دیدہ گنہگار من است
از در دیر سوئے کعبہ نخواہم رفتن — رشتۂ زلف بتاں رشتۂ زنار من است
آہ من ترجمۂ حال پریشانے ہست — نالہ ام مصرع برجستۂ دیوانے ہست

داغداران تو در زیر زمیں مدفون اند — برتہ خاک نظر کن کہ چراغانے ہست
ایں ملاحت بہ گل لالہ و ریحاں مفروش — زخم دل ہیں کہ سوا دار نمکدانے ہست

زمن نیاز و ازو، ہر زماں جفائے ہست — میانۂ من و او طرفہ ماجرائے ہست
برہنہ پا بہ بیابان عشق میگردم — چو گرد باد مرا تا بسر ہوائے ہست
ورنج کس نہ رسد گر وم وصیت من — مرا کہ بر لب خاموش داستانے ہست
زلکھنو چہ سفر می کنی، مرد و آسق — دریں دیار زمینے و آسمانے ہست

جلوۂ روئے تو دیدم چمن از یادم رفت — بوئے زلف تو ختن از یادم رفت
آنچناں محوِ تماشائے تو گشتم صیاد — کہ دریں کنج قفس پر زدن از یادم رفت

نہ تنہا چشم حیرانم رُخ او در نظر دارد — کہ چوں طاؤس ہر موئے تنم چشم دگر دارد
گریباں کردہ ام نذر جنون عالم مستی — نمی خواہم دمے، عشق تو از من دست بردارد
مست مے محبتم دیر و حرم مرا یکیست — پائے خم و سبو بود سجدہ گہ نماز من

---

ریاض الفصحا، ص ۳۶۰ ۔ رسالہ نقوش اکتوبر ۱۹۵۶ء
صبح گلشن ص ۲۱۳ ۔

---

## شیخ کرم علی وحشتی

شیخ فرحت اللہ باشندہ لکھنو کے لڑکے ایک شوریدہ مزاج غریب طبیعت اور حسن پرست جوان تھے تعلیم و تربیت کے بعد ذوق شعرگوئی پیدا ہوا تو پہلے اپنے کلام میں منور خاں غافل سے مشورہ کیا اس کے بعد غلام ہمدانی مصحفی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ بیدھا سادہ کلام ہے اور جو کچھ کہا ہے اپنے زمانے کی روش سے

ہٹ کر کہا ہے ۔ کلام یہ ہے

پردۂ غفلت پڑا ہووے تو کیا معلوم ہو
جب اُٹھے آنکھوں سے بت نورِ خدا معلوم ہو

کیونکہ زلفوں سے رُخِ انور ترا معلوم ہو
چاند بدلی میں جو چھپ جائے تو کیا معلوم ہو[1]

قافلے والوں سے کیونکر جاملے وہ ناتواں
جس کو کوسوں تک نہ آوازِ درا معلوم ہو

باعث تزئین معشوقاں ہے ظلم و جور بھی
خوں ملیں ہاتھوں میں تو رنگِ حنا معلوم ہو

جس نے دیکھی ہو ترے کوچے کی سیر اے حور وش
باغِ جنّت میں اُسے پھر کیا فضا معلوم ہو

شعر فہمی فی الحقیقت کارِ مشکل ہے بہت
اہلِ معنی کے سوا، جاہل کو کیا معلوم ہو

دل سے وحشی کے اگر ہو جائے حک حرفِ دوئی
تب اُسے کچھ منزلِ شاہ و گدا معلوم ہو

---

آلودہ گردِ خط سے رُوئے بتاں نہ ہووے
اس باغ میں الٰہی دخلِ خزاں نہ ہووے

بن دیکھے ان کی صورت آتا نہیں ہے آرام
اتنا بھی دل کسی کا محوِ بتاں نہ ہووے

کس منہ سے مدح اُس کی وحشی بیاں کروں میں
جس کی ثنا کے قابل کوئی زباں نہ ہووے

---

ریاض الفصحا صہ ۳۵۵ ۔ خوش معرکہ جلد اوّل صہ ۵۲۴

---

# مظہر علی خاں عرف مرزا لطف علی خاں ولاؔ

خلف سلیمان علی خاں ۔ ولاؔ کے جدِّ امجد آقا محمد حسین المخاطب بہ علی قلی خاں اور جدِّ اعلیٰ آقا محمد صادق دونوں ہمعناں اصفہاں سے شاہ جہاں آباد میں آئے ۔ آقا محمد حسین ۱۱۳۱ھ میں نواب سعدالدین خاں بہادر میر آتش کی سفارش پر زرِ دوستی

---

[1] خوش معرکہ شہ ان مطلع کے مصرعے مقدم و موخر درج کئے گئے ہیں

آرام گاہ محمد شاہ کی خدمت میں سرفراز ہوئے اور اپنی ذاتی استعداد و قابلیت سے یہ اثر جمایا کہ قلیل مدت میں خاصہ، کچہری اور کرناٹکی پیادوں کے داروغہ بن گئے اس کے علاوہ کچھ اور خدمات بھی ان کو تفویض ہوئیں اور علی قلی خاں خطاب عطا کیا گیا ان کے بڑے لڑکے بمخاطب سلیمان علی خاں جن کا اصلی نام مرزا محمد زماں اور تخلص وداد تھا اپنے کمالات حمیدہ کی بنا پر اول نجم الدولہ نواب محمد اسحاق خاں کے توسل سے حکومت کے منصب داروں میں شامل ہوئے۔ اور بقول مصنف صبح گلشن احمد شاہ (۱۱۶۱ھ — ۱۱۶۷ھ) کے دور میں نواب موسوی خاں کی رفاقت میں معزز و محترم تھے، ثانیاً شاہ عالم کے عہد سلطنت ( تا ۱۲۲۱ھ ) میں عزت الدولہ نواب صولت جنگ کے رفیق قرار پائے۔ اور اسی منصب پر رہتے ہوئے ۱۵ جمادی الاول ۱۱۸۱ھ کو قضا کی۔ ولا دہلی میں پیدا ہوئے۔ جوان ہونے کے بعد شاہزادہ جہاندار شاہ کی ملازمت میں داخل ہوئے اور انہیں کے ساتھ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ جہاندار شاہ کے بنارس چلے جانے کے بعد سرکار نواب آصف الدولہ میں ملازمت مل گئی اور مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی ہمراہی میں سات سال گزارے۔ ٹکیٹ رائے کا اقتدار ختم ہوا تو کچھ روز بیروزگار رہے۔ خدا جانے یہ بے روزگاری کب تک رہتی کہ مرزا فخرالدین احمد عرف مرزا جعفر کی ہمدردی نے دستگیری کی اور اُن کی معرفت مسٹر اسکاٹ کی منشی میں رکھ لئے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ کلکتے میں ۳ جولائی ۱۸۰۱ء مطابق ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ کو فورٹ ولیم کالج قائم ہو چکا تھا اور شیر علی افسوس اور بہادر علی حسینی مقرر ہو چکے تھے مگر چند ادیب اور درکار تھے۔ ولا کی قسمت نے یاوری کی۔ یہ جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتے پہنچ چکے تھے وہاں رکھ لئے گئے۔ ان کو بھی مرزا کاظم علی جواں کے برابر یعنی اسی روپے ماہانہ تنخواہ ملنے لگی۔

ولا کو شاعری کا شوق دہلی میں پیدا ہو گیا تھا اور ابتدا میں مرزا جان تپش

سے اصلاح بھی لیتے رہتے تھے۔ اس کے بعد شیخ مصحفی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا بعد میں نظام الدین ممنون کی شاگردی اختیار کی۔ مصحفی نے انہیں جوان حلیم وسلیم لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اردو کے اشعار لکھ کر اپنے باپ کے نام سے پڑھتا پھرتا ہے۔ سرور جوان کے ہم محلہ بھی تھے اور دوست بھی مرد حریف وظریف بتاتے ہیں۔ قاضی محمد صادق اختر اور ذوالفقار علی مست کیساتھ بھی اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ اور فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ صحیح سن وفات معلوم نہ ہو سکا۔

ولا کی تصنیفات ہیں دو دیوان ہیں ایک فارسی جس کا ذکر مست نے کیا ہے اور ایک اردو جس کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے شعبہ مخطوطات میں ہے یہ دیوان ۱۸۱۰ء میں خود ولا نے کالج لائبریری کو دیا تھا۔ غزلوں کی تعداد (۳۷۸) اور قصائد کی تعداد (۶۵) ہے اس میں زیادہ تر قصیدے ائمہ اطہار کی منقبت میں ہیں۔ قطعات کی تعداد (۶۵) ہے جن میں میر شیر علی افسوس کی وفات کا قطعہ تاریخ بھی ہے۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ایک قلمی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ولا کی دوسری تصنیفات کے ساتھ زبان ریختہ ہندی کا مخطوطہ بھی ہے جو دو مقالوں میں ہے اور ہر مقالے میں تین بحثیں اور ہر بحث میں تقریباً چار باب ہیں ہر باب میں تین انواع اور فصول ہیں۔

دواوین کے علاوہ بیتال پچیسی، قصہ مادھونل، تاریخ شیر شاہی، ترجمہ پندنامہ سعدی، اخلاق ہندی اور ترجمہ ہفت گلشن بھی ان کی یادگار ہیں۔ تاریخ شیر شاہی جو عباس خاں شیروانی کی تصنیف ہے اور اس کا ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ رسالہ بصائر کراچی جنوری ۱۹۶۲ء میں چھپ چکا ہے۔ انکے چند منتخب اشعار یہ ہیں ؎

نے غنچہ کا ہوں عاشق نے ہوں گل چمن کا ۔۔۔ دل دادہ ہوں کسی کے رخسار اور دہن کا

کیسے پہاڑ اُس نے اندوہ کے اُٹھائے ۔۔۔ پتھر کی سل تھی یا رب یا سینہ کوہکن کا

ہستی کو خوب دیکھا جاتے ہیں اب عدم کو
در پیش ان دنوں میں یہاں عزم ہے وطن کا

کروں کیا وصف میں اُس خوبرو کا
نہیں یارا مجھے کچھ گفتگو کا

طعنہ مت دے تو مجھے بادیہ پیمائی کا
پوچھ مجنوں سے مزا آبلہ فرسائی کا

تُرکِ غمزہ کو بھلا کس پہ ہے قصدِ یغما
ہو چکا کام یہاں صبر و شکیبائی کا

دیا ہے ناز کو رتبہ یہ خود نمائی کا
ہر ایک بت کو یہاں لاف ہے خدائی کا

ہاتھ اُس کے تو یہ نسخہ بہ از اکسیر لگا
خاکسارانِ جہاں کرنے جو تسخیر لگا

مرغِ دل تڑپے ہے جوں طائرِ ناوک خوردہ
کس کے مژگاں کا مرے سینے میں ہے تیر لگا

مسکن اپنا نہ کبھی یہ دل ناشاد کیا
تم نے اس خانۂ ویراں کو نہ آباد کیا

یوسف کا جو نقشہ در و دیوار پہ کھینچا
کیوں تو نے زلیخا نہ دلِ زار پہ کھینچا

سینے سے مرے جب تیرے پیکاں کو نکالا
پیکاں کو نہیں بلکہ مری جاں کو نکالا

فوجِ اشک و شکرِ داغ اور علم ہے آہ کا
دھوم سے آنا ہوا ہے عشق عالیجاہ کا

ایک سے ایک یہاں میں ہے صنم خوب سے خوب
نظر آیا کوئی لیک اپنے نہ محبوب سے خوب

قطرۂ اشک رہے یوں سرِ مژگاں سے لپٹ
جس طرح اوس رہے خارِ مغیلاں سے لپٹ

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا ہے یہ مرے دیدۂ گریاں کے بیچ

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سُنے
ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پہ

مرتے ہی مرے آہ عزیزوں کا خدایا
کس واسطے جیوں سنگ ہوا دل، نہیں معلوم

نہ حاجت کے لئے دستِ دعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے سچ تو یہ ہے ہاتھ اُٹھاتا ہوں

قتل سے میرے نہ منکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیری سراسر آستیں

عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں وَلا
رنگ زرد و آہِ سرد اور اشک سے تر آستیں

ازبس کہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے گرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

اک پل میں گزر جاوے نہ چرخِ بریں سے بھی
ہوتی ہے بُری ظالم آہِ اثر آلودہ

بخش اپنے ولا کو بھی از راہِ کرم یا رب ___ ہر چند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

فارسی

بگزاشتم تصورِ زلفِ نگار خویش ___ دادم تسلّیٔ بہ دل بیقرار خویش

---

تذکرہ ہندی گویاں صـ۲۶۱ ۔ ریاض الوفاق قلمی، مجموعہ نغز صـ۳۱۲
عمدہ منتخبہ صـ۸۰۹ ۔ گلشن بیخار صـ۲۳۷ ۔ طبقات الشعرا کریم الدین صـ۲۳۸
صبح گلشن صـ۵۸۹ و صـ۶۰۰

---

# نواب محسن علی خان عرف آغا جو، ہندی

خلف اصغر نواب محمد علی خاں ۔ نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ کے پوتے، نواب حسن علی خاں عبرت و نواب عاشور علی خاں شاگردان مصحفی کے چھوٹے بھائی تھے۔

علم معقول خاندان اجتہاد میں مولوی عرف میرن صاحب سے حاصل کیا۔ علم منقول میں مولوی یاد علی شاگرد مولوی ظہور اللہ عفا فرنگی محلی اور مولوی معین الدین کڑوی شاگرد مولوی تراب علی زبیری کے شاگرد ہوئے۔ علم تجوید سے بھی واقف تھے اور اس میں آقا محمد قاری شیرازی سے فیض پایا تھا۔ سخن گوئی کا شوق ہوا تو اپنے دوسرے برادران مکرم کی تقلید میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ اُن کی مختصر المیعاد استادانہ شفقت اور اپنی خداداد استعداد سے اس قدر ترقی کی کہ اس فن میں یگانہ اور اپنے حسنِ ذوق و فکر سخن کے باعث یادگار زمانہ ہوئے۔ نثر نگاری میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے اُن کا ترجمہ بوستان خیال جس کی متعدد جلدیں مطبع نول کشور سے چھپی تھیں اس کی شاہد عادل ہیں۔ بعض مقامات پہ محسن تخلص بھی

نظم کیا ہے۔ مدت تک ریاست رام پور میں بعہد نواب کلب علی خاں والی ریاست باریاب ملازمت رہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے وہیں ۱۳۰۰ھ میں وفات پائی۔

حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی نے یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے ؎

اے آہ نبیرۂ شجاع الدولہ — کیا جلد کیا ترک جہاں کو صد وائے
تاریخ جلالؔ نے لکھی رحلت کی — آغا حجو گئے جناں کو صد وائے

۱۳۰۰ھ

فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ کوئی دیوان شائع ہوا یا نہیں اس کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ دوسری تصانیف میں بوستان خیال کی سات جلدوں کا ترجمہ، ترجمہ شرح وقایہ، رسالہ صرف و نحو اردو اور علم تجوید میں ایک رسالہ موسومہ بذل المجودین اُن سے یادگار ہیں ایک کتاب اعجاز محسنی جس میں معانی و بیان عروض و قوافی اور محاورات و تلمیحات کا بیان ہے ۱۲۹۷ھ میں نواب عالمگیر خاں کے حکم سے مطبع مدار المہام بھوپال سے شائع ہوئی تھی۔

ہندیؔ کے تلامذہ میں یوں تو کثیر تعداد تھی لیکن سب سے زیادہ شہرت سید محمد جعفر اُسیدؔ نے پائی۔ ہندیؔ کا کلام خواہ مخواہ کی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہات سے بڑی حد تک خالی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن پر ناسخؔ اور شاگردانِ ناسخؔ کی بے روح شاعری نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اب کلام دیکھئے ؎

طرح موزوں دکھا کے قامت کی — سرو قد نے مرے قیامت کی
اور سب خوبیاں ہیں اُس گل میں — نام کو بو نہیں محبت کی
کوئے جاناں میں چلتے ہیں اے دل — سیر کرنی ہے باغ جنت کی
بولے شوخی سے وہ کہ ہندیؔ نے — بے وفائی کی ہم پہ تہمت کی
ہم تو رہتے ہیں اس کے دل میں سدا — اور کیا شکل ہے محبت کی

نہ حجاب تو طالبِ دید سے کرا رخ برق مثال ہے پردہ اُٹھا
اُسے یار فقط ہے ہوس ہی ہوس اُسے دیکھے گا کیا نہ نظر ہی نہیں

نہ چمن میں کھلا کوئی لالہ و گُل ترے رُخ سے ملائے جو رنگ کو وہ
نکل آئے مشابہ سیبِ ذقن اکسی باغ میں ایسا ثمر ہی نہیں

اُس نے وعدہ گھر میں آنے کا کیا
آپ سے باہر ہوئے جاتے ہیں ہم

پہنچ جائے نہ کیونکر سلسلہ روزِ قیامت تک
لگی ہے زلفِ جاناں کی طرح شبہائے ہجراں میں

اڑا کے ایک نہ ہندی کو لے گیا اس تک
سرائے دہر میں جھونکے بہت ہوا کے چلے

میرے رونے پہ اُن کو رقت ہے
کچھ تو آنسو تجھے غنیمت ہے
پسلیوں کا شمار ہوتا ہے
ناتوانی نہیں قیامت ہے

تمہیں قدر اس گھڑی ہوگی ہمارے دردِ فرقت کی
دکھا کر آئینے کو سامنے سے جب ہٹائیں گے

جاتے رہے جہاں سے ادب کے کلام بھی
اعلیٰ کے ساتھ آتا ہے سفلوں کا نام بھی

اے گیتی دو رنگ کہاں تک عداوتیں
بدلے گی ایک روز سحر سے یہ شام بھی

آخر خدا سے شرم کر اے چرخ بدتمیز
ذی عزتوں کا چاہیئے کچھ احترام بھی

رہتا ہے رات دن مجھے یارب اسی کا دھیان
ہوں گے یہ غم نصیب کبھی شاد کام بھی

نافہم کے کلام میں ہندی مزا نہیں
پختہ کہیں ہوئے ہیں خیالاتِ خام بھی

موت ہے پیری میں جینا زندگانی پھر کہاں
رات دن ہشیار رہ غافل! جوانی پھر کہاں

ذوق والوں کو جو سننا ہے تو سُن لے چند روز
لفظ و معنی کی یہ بندش یہ روانی پھر کہاں

ناز ہے معشوق کا جب تک ہے عاشق کا نیاز
دیکھنے والا نہ ہو تو لن ترانی پھر کہاں

کون معنی رس طلسمِ دہر میں ہے اپنے بعد
شعبدے رہ جائیں گے جادو بیانی پھر کہاں

ڈھونڈتی اہلِ ولا کو جب زمیں پہ آ چکی
پھر کے جاتی ہے بلائے آسمانی پھر کہاں

جان لے لیں ایک دم کے چہچہے فردِ بشر
نوحہ خوانی ہوگی ہندی نغمہ خوانی پھر کہاں

## کلامِ فارسی

اے کہ شد ذاتِ تو در دیر و حرم مسجودِ ما — مطلب و مقصود ما و شاہد و مشہودِ ما
شکلِ دل ہستی بہ پہلوے دل و جانم نہاں — مثلِ جاں پوشیدۂ اندر وجود و بودِ ما
سوزِ غم داریم از چشمِ جہاں در دل نہاں — ہست اندر سینہ مخفی آتشِ بیدودِ ما
رہبری کن رہبری اے رہنمائے گمرہاں — می نماید دور زینجا منزلِ مقصودِ ما

حمدِ حق گوئیم ہندی در زبانِ فارسی
ہست گرچہ کشورِ ہندوستاں مولودِ ما

ہندی کو تاریخ گوئی میں بھی قابلِ قدر مہارت تھی یہ قطعاتِ تاریخ اس کا ثبوت ہیں۔

### قطعہ دیوانِ چہارم نواب کلبِ علی خاں بہادر

کیا خیال جو تاریخِ طبعِ دیواں کا — صدائے عالمِ بالا سے یوں ہوا مسموع
یہ نظمِ تاج سے اقبال کے مزین ہو — کلامِ خسروِ عالی ہمم ہوا مطبوع

۱۲۹۲ھ

### قطعہ تاریخ دیوانِ پنجم نواب مغفور

ز فکرِ طبعِ خاقانِ معانی — مرتب گشت چوں گلدستہ دیواں
چو جستم سالِ ختم از بلبلِ غیب — ندا آمد "گلِ باغِ ارم خواں"

۱۲۹۵ھ

---

انتخابِ یادگار ص — یہ — گل کدہ ریاض۔ جون ۱۸۷۹ء
خزینۃ الاسرار ص ۱۰۹ — مشرق الآثار ص

## ہلال

بہت ہی غیر معروف شاعر ہیں صرف سعادت خاں ناصر نے ان کا ذکر کیا ہے اور نام و حالات سے ان کا تذکرہ بھی خالی ہے مصنف کا بیان ہے کہ یہ اول میر دوست علی زلال کے شاگرد تھے ۔ بعد میں غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے ۔ غالباً یہ تذکرہ ریاض الفصحا کی تکمیل ۱۲۳۶ھ کے بعد کے شاعر ہیں ۔ صرف دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

تم جو سحر جلوہ نما ہو گئے　　آئینہ خانے کی جلا ہو گئے
مانگ کا مضموں جو لگا سوچنے　　بال مرے حق میں بلا ہو گئے

---

خوش معرکہ زیبا جلد اوّل ص ۴۵۲ ، گلشن ہمیشہ بہار ص ۲۴۸

---

## مرزا مغل بیگ ہنر

مرزا علی بیگ ثمر کے چھوٹے بھائی تھے صورت و شان خوب اور عادات و اطوار مرغوب رکھتے تھے ۔ عدیم الفرصتی کے باعث شعر گوئی کی طرف توجہ زیادہ نہیں تھی ۔ کبھی کبھی لکھتے تھے ۔ اور اس میں اکثر اپنے بھائی ثمر سے مشورہ کرتے تھے لیکن لگتا ہے کہ وہ ان کا کلام اپنے استاد سے بھی درست کرا کرلے جاتے تھے ۔ اس لئے انہیں دونوں کا شاگرد سمجھنا چاہیئے ۔ ناصر نے صرف مصحفی کا شاگرد ظاہر کیا ہے ۔ کلام کا انتخاب یہ ہے

شب رقص کی محفل میں لیا چھین دل اس نے　　تھی گات غضب جس کی او راندازِ ستم تھا
اک تیرے نہ آنے سے مری جاں پہ ظالم　　میں کیا کہوں جو کچھ کہ قلق نزع کے دم تھا

بلبل کو کب لگے ہے بُرا رنگ و بوئے گُل ۔ گو سیلئ خزاں سے ہوا زرد روئے گُل
کیا تازہ گلبدن پہ تو عاشق ہوا ہنر ۔ آنکھوں پہ ہر زباں پہ جو ہے گفتگوئے گُل

---

دنداں در یکتا ہے لب لعل بدخشاں ہے ۔ قد رشکِ صنوبر ہے چہرہ مہ تاباں ہے

---

ریاض الفصحا ص۲۶۶ - خوش معرکہ اول ص۵۰۳

---

## سیّد محمد سعید خاں ہنر

جون پور کے خاندان سادات کے ایک فرد تھے مفتی محلہ میں مکان تھا۔ عدالت دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔ شاعری میں مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ آخر وقت میں بصارت جاتی رہی تھی لکھنا پڑھنا متروک ہو گیا تھا۔ مشاعروں میں سب سے آخر منبر پہ آتے تھے اور مصرع طرح دریافت کر کے فی البدیہہ پانچ سات شعر پڑھ کر اُتر آتے تھے۔ سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ قبر مفتی محلہ جون پور میں ہے۔ سید ذو الفقار حسنین ذو الفقار ظفر آبادی متوفی ۱۹۵۰ء ان کے بھانجے بھی تھے اور شاگرد بھی۔

صاحب شیرازۂ ہند نے ہنر کا یہ شعر اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے ؎

مرنے کے بعد بھی یہ مرا احترام ہے ۔ آگے مرا جنازہ ہے پیچھے امام ہے

---

شیرازۂ ہند

---

# مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ

افتخار الدولہ مرزا علی خاں دلاور جنگ کے بیٹے اور موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری متوفی ۱۱۵۳ھ کے پوتے تھے۔ موتمن الدولہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ محمد اسحاق خان ابن غلام علی خاں ابن مرزا حسن خاں ابن محمد رضا خاں ابن مظفر علی خاں ابن مرتضیٰ علی خاں ابن نادر خاں ابن مرزا شاکر علی خاں بن محمود علی خاں، اس طرح یہ سلسلہ مالک اشتر پر ختم ہوتا ہے۔ مرزا حسن خاں یا مرزا علی حسن اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں شوستر سے ہندوستان آئے۔ اور یہاں بادشاہ وقت اور ان کے بیٹے شاہزادہ محمد اعظم کے متوسل ہوئے۔ شاہی مطبخ کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ مرزا غلام علی خاں ان کے بیٹے اور محمد اسحاق خاں ان کے پوتے عمدۃ الملک نواب امیر خاں انجام کی مصاحبت میں رہے اور انہیں کی وساطت سے دربار شاہی تک پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نادر شاہ ہندوستان پر حملہ کر چکا تھا۔ اس کی واپسی کے بعد عمدۃ الملک امیر خاں کی ترقی کے ساتھ انہیں بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اور دیوان خالصہ کا عہدہ اور موتمن الدولہ کا خطاب پایا۔ ان کے تین لڑکے اور ان لڑکوں سے چھوٹی ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کی شادی نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے ساتھ ہوئی تھی۔

تذکرہ نگاروں نے مرزا ہوسؔ کے حالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ اعظم الدولہ نے ان کا ذکر دو جگہ کیا ہے ایک مقام پر لکھا ہے:۔

" مرزا تقی خاں از امیر زادہ ہائے سرکار لکھنؤ است قرابت قریبہ بہ نواب وزیر الممالک مغفور دارد شخصے قابل و عمدہ معاش و با مروت است قصہ لیلیٰ مجنوں بزبان ریختہ بہ پاکیزگی موزوں نمودہ ص ۲۸۳

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"ہوس تخلص مرزا تقی خاں از امیر زادہائے لکھنؤ شخصے خوش اختلاط،
قابل و ظریف معاش بہ عمدگی بسر می برد ۔ ص ۸۲۴

شیفتہ نے ان کا نام مرزا رضی خاں منجم اور تخلص رضی لکھا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی
لکھا ہے کہ نواب وزیر الممالک سے قرابت رکھتے ہیں امرائے لکھنؤ سے ہیں ۔
اور مثنوی لیلیٰ مجنوں بزبان ریختہ تصنیف کی ہے "
لیکن دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"ہوس ۔ مرزا محمد تقی خاں از کلانیانِ لکھنؤ است مظہر مکارم
پسندیدہ و مصدر اوصاف حمیدہ ہوس شعر بسیار دارد و گفتارش
در نظر مصحفی در آوردہ " ص ۲۴۱

عبد الغفور خاں نساخ نے بھی شیفتہ کی تقلید کی ہے ۔ عبد العلیم نصر اللہ خاں نے
ان الفاظ میں ان کا تعارف پیش کیا ہے :

"ہوس تخلص مرزا محمد تقی خاں نام لکھنؤ مقام است معدن مکارم محمودہ
مصدر نعوت مسعودہ در اہل سخن برگزیدہ ہوس شعر بسیار دارد و گفتارش
پرکار ۔ بدربار آغا تقی کہ از امرائے نامدار عالی نہاد فیض آباد بود لوح و
وقار روزگار گزراندے "۔

خواجہ عبد الرؤف عشرت کا بیان ہے کہ :

" ہوس دلی کے مشہور شاعر تھے ابتدائے شاعری میں لکھنؤ چلے آئے یہیں
نام پایا ۔ مفتی گنج میں رہتے تھے ۔ ہوس بڑے صاحب فضل و کمال تھے ۔
فیض آباد اور لکھنؤ دونوں جگہ بعض شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے
جن میں میر حسن اور طالب علی خاں عیشی خاص طور پر مشہور ہیں "۔

ہوس آغاز ریعان جوانی ہی سے شعر و سخن کی طرف متوجہ تھے اور میر حسن سے اصلاح لیتے

تھے۔ ۱۲۰۱ھ میں ان کے انتقال کے بعد مصحفی کے شاگرد ہوئے مصحفی نے اپنے دوسرے قدیم شاگردوں گرم، منتظر، خلیق وغیرہ کے ساتھ ان کا ذکر اپنے تذکرہ اول ہندی گویاں میں نہیں کیا بلکہ دوسرے تذکرے "ریاض الفصحا" میں کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے:

"چوں در تذکرۂ اول بہ سبب سہولت طرفین مرفوع القلم ماندہ بودند، لہذا بتلافی آں پرداختم تا حق نمک تلف نہ شود۔"

اس سہولت طرفین کی تشریح ناصر کے تذکرے میں اس طرح ہے:

"یہ معما شرح طلب ہے وہ سہو یہ تھا کہ میاں مصحفی کی تنخواہ بہت سی چڑھ گئی تھی۔ ایک روز اپنی عسرت اُن سے بہ طریق شکایت بیان کی۔ نواب صاحب نے فرمایا" مجھ سے چندے مدد خرچ نہ ہو سکے گی۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ میری زبان نہ رہ سکے گی۔ نواب صاحب نے حق استادی کو بالائے طاق رکھا اور امیری کو کام فرمایا۔

بہرحال یہ کش مکش ۱۲۱۷ھ تک جاری تھی اس سال منتظر کا انتقال ہو گیا اور چند روز بعد مرزا حیدر علی گرم اپنے کسی دوست کے ساتھ لکھنؤ سے کالپی کی طرف چلے گئے تھے مصحفی اپنے دو ہونہار شاگردوں کی جدائی سے بہت افسردہ خاطر تھے۔ کہ ایک روز راستے میں مرزا محمد تقی خاں ہوس کا سامنا ہو گیا۔ ہوس نے اپنے ہاتھی کو ٹھہرایا، مزاج پرسی کی اور رخصتہ وعدہ اپنے مکان پہ آنے کا لے کر روانہ ہو گئے۔ گرم کے کالپی سے واپس آ جانے کے بعد انہیں ساتھ لے کر یہ ہوس کے دولت خانے پر پہنچے۔ ہوس نے بڑے ہمدردانہ برتاؤ سے کام لیا اور کافی عذر و معذرت کی مصحفی نے کمال توجہ و مہربانی اور خوش اخلاقی دیکھی تو ان کی رفاقت و ملازمت اختیار کر لی اور ہوس نے از سرِ نو مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مصحفی کہتے ہیں:-

مرا باُستادی بر داشتہ ہمیشہ مشورہ سخن از من میگیرند و آنچہ مقسوم من است از دستِ عطا و مہربانی ایشاں می رسد، مشاعرہ تیز می کنند حق تعالےٰ سلامت دارد۔

ہوسؔ نواب غازی الدین حیدر کے زمانے تک حیات رہے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کی مدح میں ان کے قصائد موجود ہیں۔ ان کا ایک قلمی دیوان نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں ہے۔ ۱۲۳۹ھ کے قریب انتقال کیا۔

نواب احمد علی خاں شوکت جنگ ان کے لڑکے تھے۔ تلامذہ میں اقبال الدولہ اقبالؔ اور منشی انبا پرشاد رساؔ لکھنوی کے نام ملتے ہیں[1]

ہوسؔ بڑے خوش گو اور کامل فن شاعر تھے ان کا کلام دل پر اثر انداز ہوتا ہے، منتخب اشعار درج ہیں ؎

شب ہجر میں دم واپسیں دلِ مضطرب کا یہ حال تھا
کہ جو سانس ہونٹوں تک آتی تھی سو نکلنا اس کا محال تھا

جدھر وہ نور مجسم تھا مثل قبلہ نما — اسی طرف کو رُخ انجمن نظر آیا

دل وہ دیں جس کے غم ہجر میں برباد کیا — ہائے بھولے سے بھی اُس نے نہ ہمیں یاد کیا
نزع میں ہم نے عجب طور سے دل شاد کیا — آئی ہچکی تو کہا اُس نے ہمیں یاد کیا

---

[1] لالہ چندی پرشاد لکھنوی کے لڑکے تھے۔ داستان گوئی میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ نواب کلب علی خاں والئ ریاست رام پور کے دربار سے تعلق تھا۔ ان کا تقرر ۱۳ مارچ ۱۸۵۸ء کو پچاس روپے ماہانہ پر ہوا تھا آخر میں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلامی نام عبدالرحمن رکھا گیا تھا۔ کئی داستانوں کے مصنف ہیں۔ ان کے لڑکے کا نام غلام رضا تھا جو شاعر بھی تھے اور داستان گو بھی۔ ان کا تخلص رضا تھا۔

شوقِ خراشِ خار مرے دل میں رہ گیا　　پائے تلاش پہلی ہی منزل میں رہ گیا

دی دردِ عشق نے مجھے غم میں بھی اک خوشی　　رونے پہ میرے دیر تلک وہ ہنسا کیا

محفل میں ساتھ لے نہ گیا کیوں نشانِ یار　　سینے سے میں نکال کے پیکاں خجل ہوا

بُلبُل نے کڑھایا غمِ گل نے رُلایا　　مجھ کو تو فقط اُس کے تغافل نے رُلایا

مجھے کیا اگلے زمانے کی خبر سچ تو یہ ہے　　کہ ترے عہد میں تجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم گئے تھے اُس سے کرنے شکوۂ دردِ فراق　　مسکرا کر اُس نے دیکھا سب گلا جاتا رہا

بالیں پہ دمِ نزع وہ گلفام نہ آیا　　مرنا بھی مرا ہائے مرے کام نہ آیا

بید کے پتوں کا سایہ یوں تنِ مجنوں پہ ہے　　جیسے کوئی ناتواں گھِر جائے تلواروں کے بیچ

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں　　شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے　　کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے　　یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

اب تو کرتے ہو بہت لطف و کرم تم لیکن　　بھول جانا نہ مجھے بہرِ خدا میرے بعد

اُٹھ گیا میں جو جہانِ گزراں سے تو ہوسؔ

خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد

---

ہوسؔ جب ذکر آ جاتا ہے اُس کا　　زباں ہوتی نہیں دو دو پہر بند

---

نہیں ہوسؔ وقتِ جوشِ مستی قدِ خمیدہ سے ٹک حیا کر

بتوں کا بندہ رہے گا کب تک خدا خدا کر خدا خدا کر

کہاں کی نیند آ گئی ہے ایسی مسافرانِ رہِ عدم کو

کچھ ایسے سوئے کہ پھر نہ چونکے تھکے انہیں ہم جگا جگا کر

سجودِ محرابِ تیغِ قاتل عبادتِ رندِ مشرباں ہے
جو ہو سکے تو قضائے عمری بس ایک سجدے میں تو ادا کر

کہاں سلیماں کہاں سکندر کہاں ہے جم اور کہاں ہے دارا
یہ سب کے سب خاک کے تھے پتلے بگاڑ ڈالے بنا بنا کر

ہے منہ پہ بیداریوں کی زردی ہوس اگر نیند اُچٹ گئی ہے
تصور اس کے ہیں سو رہو تم، بغل کے تکیے گلے لگا کر

دردِ دل سے تو کسی کو ہوسؔ آگاہ نہ کر — شرطِ الفت تو یہ ہے جان دے اور آہ نہ کر

آتشِ گل نے دمِ آخر کیا روشن چراغ — ہو گیا پیکانِ تیرِ یار کا روغن چراغ

قفس پہ برگِ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل — گزشتہ صحبتوں کا اب دلانا یاد، کیا حاصل

کرو کچھ شکل ایسی جس میں راہِ عشق طے ہووے — ہوسؔ گر لاکھ فن کے تم ہوئے استاد کیا حاصل

رنجش کا انہوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے — مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنورتے ہیں

ہو جہاں عاشق و معشوق کا یکجا ہو حشر — قیدِ محشر کی نہیں، داورِ محشر مجھ کو

آندھیاں آئیں، گھٹائیں برسیں، اُٹھے گرد ہا
فتنے کیا کیا برسرِ گورِ غریباں ہو گئے

ہوئے عازمِ ملکِ عدم جو ہوسؔ تو خوشی یہ ہوئی تھی کہ غم سے چھٹے
یہ فراغ الم سے نہ واں بھی ملا وہاں غم یہ رہا کہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی دَیر میں تھے کسی بُت پہ فدا کبھی کرتے تھے کعبہ میں جا کے دعا
ترے کوچے میں بیٹھے تو خوب ہوا کہ کشاکشِ دَیر و حرم سے چھٹے

نغمہ سنجانِ چمن، طرزِ فغاں بھول گئے — سنتے ہی میری زباں اپنی زباں بھول گئے

بعد مُردن ابھی کوئی نعش کے ہمرہ نہ ہوا — جی سے ایسا ہمیں اے اہلِ جہاں بھول گئے

تذکرہ شورش صہ ۳۲۸ ، عمدہ منتخبہ صہ ۲۸۳ و صہ ۸۲۴ ، ریاض الفصحا صہ ۳۶۶
گلشن بے خار صہ ۸ و صہ ۲۴۱ ، گلشن ہمیشہ بہار صہ ۱۵۸ و صہ ۲۲۸
خوش معرکہ زیبا جلد اول صہ ۵۲۴ ، سراپا سخن صہ ۳۸۱
طبقات الشعرا کریم الدین صہ ۲۵۷ ، دیوان غریب صہ ۵۲۳
طور کلیم صہ ۱۲۷ ۔

---

## یاس ۔ میر الٰہی بخش

میر رحمت علی کے لڑکے تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ مگر یاس کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی یہیں نشو و نما پائی اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی سن تمیز کو پہنچ کر شاعری شروع کی اور وقتاً فوقتاً مصحفی سے اصلاح لیتے رہے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ کچھ مدت کے بعد انہوں نے اس شغل کو ترک کر دیا تھا۔ اُن کے صرف یہی چار شعر جو مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھے ہیں۔ سعادت خاں ناصر کے یہاں بھی نقل کئے گئے ہیں اور انہیں کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

سامنے آئینے کیوں حیراں نہ ہوں رو دیکھ کر
مارے پڑتے ہیں ہزاروں اُس کے گیسو دیکھ کر

صورت کفن میں ہے یہ ترے خاکسار کی
چھاتی پھٹے ہے دیکھ کے جس کو مزار کی

ہیں سیکڑوں جہاں میں طرحدار آدمی
بندے ہیں ہم اُس کے جو ہو یار نہ آدمی
قاتل جو تو کرے ہے مجھے قتل، بے گناہ
کیا منصفی کریں گے نہ دو چار آدمی

---

ریاض الفصحا صہ ۳۷۷ ۔ خوش معرکہ زیبا جلد اول صہ ۱۸۰ ۔

# استدراک

جو باتیں بعد میں معلوم ہوئیں انھیں یہاں درج کیا جاتا ہے

## شیخ اسد علی اسد

شیخ جواہر علی کے لڑکے اور ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے ان کو غلام ہمدانی مصحفی سے تلمذ تھا۔ یہ بات مجھے حافظ عبدالقدیر ناظم ہاپوڑی نے بتائی تھی۔ حافظ صاحب پرانے شاعر اور مولوی معشوق حسین اطہر کے شاگرد تھے ۱۹۳۴ء میں کسی سلسلے میں کراچی آئے تھے اور جب تک وہ یہاں مقیم رہے مجھ سے ملاقات ہوتی تھی سن رسیدہ آدمی تھے اس وقت ۶۰ سال سے کم عمر نہ تھی۔ یہ افسوس ضرور رہا کہ موصوف نے اسد کا کوئی شعر مجھے نہیں سنایا۔

## محمد حسین خاں الم غازی پوری

ان کا قلمی دیوان انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی میں ہے۔ یہ ۱۲۵۰ھ میں کتابت ہوا ہے۔ (۱۲۰) اوراق میں ہے اور ہر صفحہ میں ۱۶ سطریں ہیں۔ اس کے کاتب خود مصنف ہیں اور آخر میں یہ عبارت تحریر ہے۔

بتاریخ دوازدہم ذی الحجہ روز سہ شنبہ ۱۲۴۹ھ در عظیم آباد عین حالت جنوں انگیزی نوشتہ شد۔ کاتب حروف خاص مصنف دل سوختہ است

اس دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے ؎

دھیان مرقد میں جو آیا .... نور کا
تھا ہر اک تار کفن میں رات جلوہ طور کا

کشتگان عشق کی کیا چاہیئے مرقد پہ شمع
داغ دل سے ہو رہا ہے ایک عالم نور کا

اور ایک مثنوی کے ان اشعار پر ختم ہوا ہے ؎

الم کیا کہوں آ گئے ہیں اس کا حال
وہ مشفق مرے ہیں نہایت نڈھال

ملادے خدا ان سے محبوب کو
کرے مہرباں ان پہ محبوب کو

## مرزا مینڈھو امیر

نواب امیر الدولہ (بقول ناصر امین الدولہ معین الممالک) ناصر جنگ عرف مرزا مینڈھو، وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند تھے۔ غلام قادر روہیلہ کے فتنہ و فساد سے پہلے دہلی میں اپنے مکان پر صحبت مشاعرہ ترتیب دیتے تھے۔ توپ خانہ شاہی کا انتظام آپ کے سپرد رہا۔ بہت خلیق، صاحب ہمت اور نیک خو امیر تھے۔ صاحب سخن شعرا کا بیان ہے کہ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے انہیں غلام ہمدانی مصحفی کا شاگرد لکھا ہے۔ مختلف تذکروں سے یہ اشعار انتخاب کئے گئے ؎

پرخوں برنگ لالہ ہے اپنا ایاغ دل
بوئے کباب سوختہ دیتا ہے داغ دل

حاجت نہیں ہے شمع کی میرے مزار پر
ہر شب ہے سوز آہ سے روشن چراغ دل

شاید کہ سیل اشک نے اس کو بہا دیا
سینے میں اب تو خلق نہ پایا سراغ دل

اس عشق خانہ سوز کے ہاتھوں سے اے امیرؔ
خالی کبھو نہ آگ سے دیکھا اجاغ دل

منظور یہ نہیں ہے تم چشم تر کو دیکھو | آغشتہ خونِ دل میں داغِ جگر کو دیکھو
کرتا ہے ایک پل میں یہ سیر لامکاں کی | میری نگہ کے مرغِ بے بال و پر کو دیکھو
یارو امیرؔ سے تم زار و نزار اوپر | جانا یہ اُس کا سچ کر تیغ و تبر کو دیکھو

کل جو ہم نے منجھے کے ساتھ سیرِ دیر کی | لڑکھڑایا ہی تھا پا لیکن خدا نے خیر کی

یاس و غم و آرزو جمع یہ سب چیز ہے | بلبے ترا حوصلہ! دل بھی عجب چیز ہے
نازک دماغ دیکھو ہنگام سیر گلشن | رکھتا ہے ہاتھ منہ پر تا گل کی بو نہ آئے

(فارسی)

بر بستر خود از نگہ ہوش ربائے | جائے جگر افتاد و دل افتاد بجائے
گاہے بدل و گاہ بسر گاہ بدیدہ | نالم اگرم دست دہد آں کفِ پائے
بند و چہ طرح ایں دل ناکام من از تو | نے مہر و وفا آری و نے جور و جفائے
از رفتۂ خود چوں شود آگاہ الہا | نے نامہ رسا مرغے و نے باد صبائے

مطرب بحج دوشش امیر ہم چو غزل را
می خواند بہ تبدیلیٔ یک ہمزہ بہائے

مجموعہ نغز جلد اول ص۷۱ ۔ خوش معرکہ زیبا جلد اول ص ۱۹۴
سخن شعرا ص۴۲ ، خمخانہ جاوید جلد اول ص ۲۴۴ ۔

---

## سید علی حسین خاں اندوہ

دیوانِ غریب ص۶ سے ان کے مندرجہ ذیل اشعار کا اضافہ کیا جاتا ہے ـــ

کھڑکی سے نہ جو دن کبھی اے یار نکالی | تو نے نہ مری حسرتِ دیدار نکالی

مژگاں کا کیا ذکر تو دکھلائی کٹاری ابرو کا لیا نام تو تلوار نکالی
اندوہ مقدر ہی نہ تھا قتل ہمارا تلوار تو یوں اس نے کئی بار نکالی

## بنیاد

ان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اسپرنگر کے بیان کے مطابق لکھنؤ کے باشندے اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ خوب چند ذکا نے لکھا ہے :-

لکھنؤ کا ایک شخص ہے کلام میں غلام ہمدانی مصحفی اور اس نواح کے دوسرے اساتذہ سے اصلاح لیتا ہے۔ اشعار سے تلاش و جستجو کا پتا چلتا ہے۔ طرز بیان دلچسپ ہے

اور ان الفاظ کے بعد موصوف نے بنیاد کا یہ شعر درج کیا ہے ؎

کیا حلاوت عیش کی اور کیا خوشی آرام کی جان جب تو ہی نہ ہو تو زندگی کس کام کی

## بیہوش

نہ ان کا نام معلوم ہوا۔ نہ وطن کا پتا چلا اور نہ کوئی شعر دستیاب ہوا۔ البتہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر جلد اول کے ص ۱۵۶ میں شاگردان مصحفی کے سلسلے میں یہ نام چوتھے نمبر پر درج کیا ہے۔

## منشی فیض پارسا پارسا

ان کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت شیخ احمد سرہندی تک پہنچتا ہے۔ یعنی فیض پارسا ابن میر پارسا ابن میر بادشاہ ابن میر احمد ابن شیخ احمد رسا بن محمد رسا بن شیخ محمد پارسا ابن مروج الشریعت خلف حضرت شیخ احمد رح

لالہ بہری رام کہتے ہیں :

غدر سے ۲۰ - ۲۵ سال پیشتر (۱۸۳۲ء - ۱۸۳۷ء) دہلی کے مدرسہ میں مدرس حساب تھے ۔ گاہ گاہ شعر ریختہ بھی کہتے تھے انہیں بزرگ کی تحریک سے غازی الدین خاں کے مدرسے میں جو (دہلی ہیں) اجمیری دروازے کے باہر واقع ہے مدت تک مشاعرہ نہایت رونق سے جاری رہا۔ مشاہیر شعرائے پایۂ تخت مثل شاہ نصیر مومن، ذوق، آزردہ، غالب، شیفتہ، صہبائی اور ان کے تلامذہ رشید جمع ہو کر داد سخنوری دیتے تھے ..... انجام کار باہمی نزاع کی وجہ سے یہ بزم مشاہرہ درہم برہم ہو گئی۔

یہ بزرگ فارسی میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے جس کی تصدیق 'ہدیہ احمدیہ' کے اس فقرے سے ہوتی ہے :-

حافظ فیض پارسا در علم فارسی و در علم سیاق مہارت تمام داشتند و بغایت ظریف و خوش طبع و خوش خلق و نرم مزاج بودند در فارسی شاگرد مصحفی اند۔

مرزا قادر بخش صابر بھی ان کے اخلاق و عادات کے ثنا خواں ہیں :

مرد خوش خلق ۔ نیکو نہاد، حافظ کلام اللہ تھا ۔ سعادت ذاتی اور اہلیت صفاتی کا بیان خامۂ خام رقم کی مجال سے باہر ہے کثرت زہد و تقویٰ سے اسم بامسمیٰ ہو گیا تھا۔

پارسا کی وفات دہلی ہی میں ہوئی ان کا مزار مغل پورہ کی مسجد کے اندر اس جگہ ہے جو مسجد میں داخل ہونے وقت بائیں ہاتھ پر آتی ہے ۔ سال وفات کی تصدیق نہ ہو سکی ۔ دو لڑکے محمد رسا اور محمود رسا اپنی یادگار چھوڑے تھے جو شاہ عبدالغنی

کے ساتھ دہلی سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ کئی تذکروں میں ان کے صرف دو شعر ملتے ہیں جو یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

کاش انساں نہ ہمیں حق نے بنایا ہوتا ۔۔۔ رہتا ہے فریاد و فغاں، گریہ و زاری ہے مدام
مثل آئینہ صاف طینت میں ۔۔۔ کوئے الفت کے خاکسار ہے دل

---

گلستان سخن ص ۱۶۱، ہدیۂ احمدیہ ص ۶۳، خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴

---

## ببر علی محمد راحم[1]

ان کے بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے مگر خود انھوں نے لکھنؤ میں نشو و نما پائی۔ ابتداءً مرثیہ و سلام لکھتے تھے اور میاں عطا مرثیہ گو سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل گوئی سے بالکل نابلد تھے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ میری ایک طرح غزل کی تقلید میں کچھ اشعار موزوں کر کے لایا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اسے تلامذہ مصحفی میں شمار کیا ہے اور اس کا نام اس فہرست میں لکھا ہے جو موصوف نے مجھے ایک خط کے ساتھ بھیجی تھی۔ ریاض الفصحا میں ان کی عمر تقریباً ۲۴ سال بتائی گئی ہے۔ صرف ۳ شعر دستیاب ہوئے اور انہیں کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

دیوار کے روزن میں سے جو اس کی[2] لڑی آنکھ ۔۔۔ دو چار گھڑی اس کی مری خوب لڑی آنکھ
پہلے تو لگا دٹ سے کیا پیار بہت سا ۔۔۔ پھر بعد کئی دن کے دکھائی یہ کڑی آنکھ
ارمان مرے دل کے نکل جائیں[3] یہ سارے ۔۔۔ گر تیری رہے سامنے دو چار گھڑی آنکھ

---

۱؎ سراپا سخن اور گلستان سخن میں ان کا نام میر محمد علی لکھا ہے۔
۲؎ اس پہ (سخن شعرا)، ۳؎ نکل جائیں گے سارے

# شیخ جمال الدین کامل

مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اُن شاگردوں میں شامل ہیں جو ۱۲۳۶ھ کے بعد شاگرد ہوئے۔ اور اس طرح مولوی اولاد علی کاہش۔ مولوی ذکر علی ذاکر بنارسی۔ نواب جعفر حسن خاں فیض، میر منظر علی اسیر، آغا حجو ہندی، علی بخش بیمار اور محمد ابراہیم جاہ وغیرہ کے قافلے کے ایک رُکن ہیں۔ یہ آنولہ ضلع بریلی کے باشندے تھے۔ تحصیل علمی کے واسطے لکھنؤ گئے اور وہاں مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ سعادت خاں ناصر نے انہیں ایک نسخہ میں مرد خرد مند و شخص عاقل اور دوسرے نسخے میں مصحفی کے شاگرد مشہور۔ مگر احاطۂ تذکرہ میں نام ان کا نامحصور لکھا ہے۔ تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ حاصل شدہ کلام یہ ہے ؎

تجھ سے وحشی صنم کو رام کیا | جذبۂ دل نے کیا ہی کام کیا
مژدہ اے چشم انتظار نصیب | جلوۂ حسن اس نے عام کیا
دل دیا تجھ سے بے مروت کو | ہم نے یہ کیا خیال خام کیا
اس نے منہ کو چھپا کے زلفوں سے | روز روشن ہمارا شام کیا
تو نے کھا کھا کے ساتھ غیروں کے | آب و دانہ مرا حرام کیا
کوچ کرتے ہی آپ کے ہم نے | منزل گور میں مقام کیا
کیا ہی کامل کے کشورِ دل میں | اے شہِ حسن! انتظام کیا

عاشق زار ہوں اُس گُل کے رُخ رنگیں کا | زردیٔ رنگ سے ظاہر ہے چھپانا کیسا
خوف ہے تجھ کو بھی او بُت بے دیں بخدا | دیکھتے ہم نہیں ہیں آنکھ لڑانا کیسا
شمعِ محفل کو اگر غم نہیں پروانے کا | شام سے تا بہ سحر اشک بہانا کیسا

فوجِ غم و الم میں پھنسا شہر یارِ دل — ہو کون بیکسی کے سوا غمگسارِ دل
آغاز ہی عیاں ہے یہ انجامِ کارِ دل — دو چار دن ہے زندگیٔ مستعارِ دل
اس رشکِ آفتاب سے گر وصل ہو نصیب — شبنم کی طرح صاف اُڑے پھر غبارِ دل
اس شمع رو صنم نے جو کی سرد مہریاں — کافور ہو گیا ہے شکیب و قرارِ دل
بحرِ جہاں میں ہے یہی کاملؔ کی آرزو — ہو زیبِ گوشِ یار، دُرِ شاہوارِ دل

---

اس گھڑی حاصل ہمیں لطفِ شبِ مہتاب ہو — ماہ رو ہو اور حسین آباد کا تالاب ہو
بندگی کیونکر نہ ہو قاتل کے کشتوں کی قبول — ہر سجدہ خنجر ابرو کی جب محراب ہو
ہمسے جانباز اُنکے خوں میں اسکو جھبوائے اگر — تیغ میں قاتل کی پیدا، جوہرِ نایاب ہو
زلف کا کس غیرتِ یوسف کی رہتا ہے خیال — دیکھتے ہر شب جو کاملؔ تم پریشاں خواب ہو

---

طائرِ دل کو جو رہتا ہے خیال کاکل — کیا ہوئی پھر ہوسِ دانۂ خالِ کاکل
فصل سودے کی پھر آئی ہے، خدا خیر کرے — دیکھیے پڑتا ہے کس کس پہ وبالِ کاکل
میں تو کیا پیرِ فلک نے بھی کسی دورے میں — دیکھا ہو گا نہ کوئی سانپ مثالِ کاکل
دلِ سودا زدہ کی ہے یہ دعا اے کاملؔ — وصلِ جاناں ہو تو حاصل ہو وصالِ کاکل

---

خوش معرکہ زیبا جلد اول ص ۱۴۳ ، سراپا سخن ص ۲۴۷ ، سخن شعرا ص ۳۹۵

---

## خواجہ محمد اکرم نزارؔ

نزارؔ کے حالات دستیاب نہ ہو سکے مصحفیؔ نے ان کا ذکر ریاض الفصحا میں کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے نہ اُن کے استاد کا ذکر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی غیر معروف شاعر تھے۔ مولوی عبدالغفور خاں نے میر تقیؔ کے شاگردوں میں شامل کیا ہے لیکن سعادت خاں ناصرؔ مصحفیؔ کا شاگرد لکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ریاض الفصحا کی تصنیف

کے وقت وہ مبتدی ہوں گے اور ۱۲۳۶ھ کے بعد مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے ہوں گے۔ ان کے جو اشعار مصحفی نے درج کیے ہیں وہی ان کا سارا سرمایۂ کلام ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سادہ گو شاعر تھے۔ قارئین خود اندازہ کر لیں ۔

کیا کیجیے غرض صبر کا مقدور نہیں ہے — اک زخم نہیں دل پہ کہ ناسور نہیں ہے
آتا ہے تو آ جا مری بالیں پہ وگرنہ — کوئی دم کو سُنے گا کہ یہ رنجور نہیں ہے
کیا پرسشِ احوال جگر سوختۂ عشق — اس مملکتِ عشق میں دستور نہیں ہے

---

ریاض الفصحا ص ۳۲۵، خوش معرکۂ زیبا جلد اول ص ۱۷۴، سخن شعرا ص ۵۰۷

---

## آغا جُو ہندی

بوستانِ خیال کے مندرجہ ذیل ترجمے ان سے یادگار ہیں:

(۱) روضۃ الابصار مطبوعہ ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۸ھ لکھنؤ — (۲) شمس النہار ۱۸۶۰ء
(۳) ضیاء الابصار ستمبر ۱۸۹۰ء — (۴) مطلع الانوار ۱۸۹۰ء
(۵) خزینۃ الاسرار اکتوبر ۱۸۹۰ء — (۶) نور الانوار دسمبر ۱۸۹۰ء
(۷) مشرق الآثار — (۸) تفریح الاحرار

آخر کے دونوں ترجمے نامکمل تھے ان میں سے پہلے کو پیارے مرزا نے اور دوسرے کو پیارے مرزا اور علی خاں نے مل کر مکمل کیا۔

---

اردو کی نثری داستانیں اشاعت دوم ص ۶۱۱

# کتابیات


**آب بقا**
نامی پریس لکھنؤ اشاعت اول ۱۹۱۸ء

**انتخاب یادگار**
تاج المطابع رام پور۔ ۱۲۹۰ھ

**بزم سخن**
مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۸۱ء / ۱۲۹۵ھ

**تذکرہ میر حسن**
طبع جدید۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۰ء

**تذکرہ ہندی گویاں**
انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۳ء

**جلوۂ خضر**
نور الانوار پریس ۱۸۸۵ء

**حیات دبیر**
سید افضل حسین ثابت
جارج پریس لاہور ۱۹۱۵ء

**خمخانۂ جاوید** (جلد اول)
دہلی ۱۹۱۱ء

**خمخانۂ جاوید** (جلد دوم)
دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۱۷ء

**خمخانۂ جاوید** (جلد پنجم)
ناشر لالہ امیر چند کھنہ۔ دہلی ۱۹۴۰ء

**خوش معرکہ زیبا** (جلد اول)
مطبع عالیہ لاہور ۱۹۷۰ء

**خوش معرکہ زیبا** (جلد دوم)
مطبع عالیہ لاہور ۱۹۷۲ء

**دیوان غریب**
مطبع دلکشا فتح گڑھ ۱۲۸۴ھ

**رسالہ گلزار سخن پونا**

**روز روشن** مرتبہ محمد حسین رکن زادہ
مطبوعہ ایران ۱۳۴۳ھ

**ریاض الفصحا**
غلام ہمدانی مصحفی
انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۴ء

**سخن شعرا**
مطبع نول کشور ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ

**سخنوران بنارس**
شعبہ اردو و فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی، بار اول ۱۹۶۸ء

**سراپا سخن** (سید محسن علی محسن)
نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۱ء

**طبقات الشعرا** (قدرت اللہ شوق)
مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء

**طبقات شعرا** (کریم الدین)
مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء / ۱۲۶۴ھ

**طلسم ہند** (طوطا رام شایاں)
نول کشور پریس ۱۸۷۴ء

**عقد ثریا**
جامع برقی پریس دہلی۔ اشاعت اول ۱۹۳۴ء

**عمدۂ منتخبہ** (اعظم الدولہ سرور)
دہلی - ۱۹۶۳ء

**قیصر التواریخ**
مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء

**کلیات قدر**
مطبع مفید عام آگرہ - ۱۸۹۱ء

**گل رعنا** (حکیم عبدالحی)
معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ

**گلزار مسعود** (منگل خاں نگہت بنارسی)
مطبع جواہر اکسیر بنارس ۱۳۴۰ھ

**گلستان سخن**
مجلس ترقی ادب لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۶ء

**گلشن بیخار**
مطبع نولکشور لکھنؤ۔ اگست ۱۹۱۰ء

**گلشن ہمیشہ بہار**
انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۷ء

**مجموعۂ نغز**
نشریات کلیہ پنجاب سنہ ۱۹۲۳ء

**مرقع شعرا**
دھومی مل دھرم داس، چاوڑی بازار دہلی سنہ ۱۹۵۰ء

**مدائح الشعرا** (نواب عنایت حسین خاں مہجور)
انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷ء

**مشاہیر کاکوری** (حافظ علی حیدر)
اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء

**مشرق الآثار**
مطبع نول کشور لکھنؤ

**مفتاح التواریخ**
مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۷ء

**ہدیہ احمدیہ**
مطبع انتظامی کان پور ۱۳۱۲ھ

**یادگار ضیغم**
حیدرآباد دکن سنہ ۱۸۸۶ء

# اشاریہ

مصحفی کا نام تقریباً ہر صفحے پر ہے اس لیے درج نہیں کیا گیا۔ ان کے سوا باقی تمام قابل ذکر نام اشاریے میں شامل ہیں

---

## شخصیات

## کتب

## رسائل واخبارات



## ادارے

## مقامات وممالک

# "مصحفی - حیات و کلام" کے بارے میں چند رائیں

"مصحفی - حیات و کلام" کی اشاعت کے ساتھ مصحفی کے مطالعہ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے - افسر صدیقی صاحب کی اس تصنیف کے بغیر مصحفی کی شخصیت و شاعری کو پورے طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ فاضل مصنف نے مطالعۂ مصحفی کے سلسلے میں جہاں نئے ماخذ تلاش کئے ہیں وہاں خود مصحفی کے اُردو و فارسی کلام اور تذکروں کے داخلی شواہد سے نئے اور دلچسپ نتائج بھی مرتب کئے ہیں ... یہ اس دور کی ایک اہم تصنیف اور تحقیقی اعتبار سے ایک کارنامہ ہے۔

—— ڈاکٹر جمیل جالبی

افسر صدیقی امروہوی نے اپنی اس کتاب میں مصحفی کی زندگی اور شاعری پر جس طرح قلم اُٹھایا ہے وہ خاصے کی چیز ہے .... ہر لحاظ سے اس کی انفرادیت مُسلم ہے۔

—— ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مصحفی کے سلسلہ میں اب تک کوئی مفصل کتاب نہیں لکھی گئی تھی افسر صدیقی امروہوی صاحب نے مصحفی حیات و کلام لکھ کر ایک مسلسل بے انصافی اور بے اعتنائی کی تلافی کر دی ہے۔

—— شمیم احمد

یہ کتاب مصحفی کے سلسلے میں اہم ہونے کے علاوہ بعض ایسے واقعات اور پہلوؤں کی بھی نشان دہی کرتی ہے جن پر تاحال غور نہیں کیا گیا تھا۔

—— روزنامہ حریت کراچی

یہ کتاب افسر صاحب کی زندگی بھر کی کمائی اور تحقیق و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

—— ابو سلمان شاہجہانپوری